اسلام اور مستشرقین

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

دار المصنفین ، شبلی اکیڈمی ، اعظم گڑھ (۲۷۶۰۰۱)

جلد دوم

فروری ۱۹۸۲ء میں دارالمصنفین کے اہتمام میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر جو بین الاقوامی سمینار ہوا تھا، اس کی مختلف نشستوں میں اسلام اور شارع اسلام اور تاریخِ اسلام پر مستشرقین کے اعتراضات کے رد میں جو مضامین پڑھے گیے تھے، ان کو ترتیب سے اس میں جمع کر دیا گیا ہے۔

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی

اعظم گڑھ یو۔پی (ہند) ۲۷۶۰۰۱

سلسلۂ دارالمصنفین نمبر: ۱۵۷

کتاب : اسلام اور مستشرقین جلد دوم

مصنف : سید صباح الدین عبدالرحمٰن

صفحات : ۲۸۹=۶+۲۸۳

دوسرا ایڈیشن : ۲۰۰۴ء

مطبع : معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ (ہند)

ناشر : دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ (ہند)

باھتمام

عبدالمنان ہلالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

اسلام اور مستشرقین جلد دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

الحمدللہ اسلام اور مستشرقین کی یہ دوسری جلد اب ہمارے معزز ناظرین کے ہاتھوں میں ہے، یہ ان مقالات کا مجموعہ ہے جو دارالمصنفین کے بین الاقوامی سمینار منعقدہ فروری ۱۹۸۲ء میں پیش کیے گیے۔

ان مقالات پر سمینار میں جو مباحث یا تبصرے ہوئے ان کی پوری تفصیل اس سلسلہ کی جلد اول میں پیش کردی گئی ہے، اس کے مطالعہ سے ان مقالات کی نوعیت اور اہمیت کا اندازہ ہوگا، اس میں کچھ ایسے مقالات بھی درج کردیے گیے ہیں جو پیش تو کیے گیے تھے لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے پڑھے نہ جاسکے، ان ہی میں جناب شیخ نذیر حسین لاہور، الاستاذ انور الجندی قاہرہ، جناب مولوی ضیا الدین اصلاحی دارالمصنفین، ڈاکٹر عمادالدین خلیل عراق، جناب سید وحید الدین صاحب دہلی اور خود خاک سار کے مقالے ہیں، اس لیے ان پر سمینار میں بحث ومباحثہ نہ ہوسکا۔

عربی کے جو مقالے آئے تھے ان کے ترجمے دارالمصنفین میں احتیاط سے کیے گئے، کچھ لوگوں کو یہ اعتراض تھا کہ مستشرقین نے جو مفید خدمات انجام دی ہیں، ان کا اعتراف نہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، لیکن اس مجموعہ میں ایسے مقالے بھی ملیں گے جن میں ان مستشرقین کی خدمات کا بھی ذکر اچھی طرح سے آگیا ہے، لیکن ایسے مقالات پڑھتے وقت اس کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ان مستشرقین کی وجہ سے نقصانات زیادہ پہنچے ہیں، جیسا کہ اسی کتاب کے اور مقالات سے اور اس سلسلہ کی دوسری جلدوں سے بھی ظاہر ہوگا۔

ہم اپنے ناظرین کو پھر یاد دلادیں جیسا کہ اس سلسلہ کی پہلی جلد کے دیباچہ میں لکھ چکے ہیں کہ اس کی تیسری جلد میں وہ مقالات جمع کردیے گئے ہیں، جو ہندوستان اور باہر کے اربابِ نظر نے مختلف عنوانات کے تحت مستشرقین کی علمی تلبیسات اور تدلیسات پر بہت کچھ لکھا ہے، چوتھی جلد

میں مولانا شبلیؒ کے وہ مضامین ہیں جو انہوں نے مستشرقین پر مختلف اوقات میں لکھے ہیں، پانچویں جلد میں استاذ محترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کے مضامین ہیں۔

محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے سمینار میں جو مقالہ پیش کیا تھا وہ علاحدہ سے اسلام اور مستشرقین کے نام سے ندوۃ العلما کے مکتبۂ تحقیقات ونشریات کی طرف سے شائع ہو گیا ہے، اس کو بھی اسی سلسلہ کی ایک جلد سمجھنا چاہیے، اس کا عربی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے، پھر سمینار میں جو عربی مقالے آئے، ان کے مجموعہ کا ایک نمبر البعث الاسلامی دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ سے بھی شائع ہوا ہے۔

زیر نظر مجموعہ میں مضامین کی تقدیم وتاخیر کی ترتیب میں زیادہ خیال نہیں رکھا گیا بلکہ جیسے جیسے مضامین دست یاب ہوتے گئے ان کی کتابت وطباعت ہوتی رہی تاکہ تاخیر نہ ہو، اگر اس کی وجہ سے کچھ بے احتیاطی ہو گئی ہو تو ہم معذرت خواہ ہیں۔

اس مجموعہ کی اشاعت میں توقع سے زیادہ تاخیر ہو گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہوئی کہ معارف پریس میں طباعت کے ون ڈائنگ سسٹم کا تجربہ کیا گیا، الحمد للہ وہ کامیاب رہا اور اس سلسلہ کی ساری کتابیں ون ڈائنگ ہی کے ذریعہ طبع ہوئی ہیں۔

امید ہے کہ یہ مجموعہ اور اس سلسلہ کی بقیہ جلدیں جس مقصد سے شائع کی جا رہی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے علمی حلقوں میں مقبول ہوں گی۔ آمین!

احقر

سید صباح الدین عبد الرحمن

دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

۱۵ر دسمبر ۱۹۸۵ء

مستشرقین اور طب اسلامی

از

جناب حکیم محمد سعید دہلوی، ہمدرد فونڈیشن، کراچی (پاکستان)

ہمارے اسلاف نے قرآنِ کریم کی روشنی اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے فیض سے عالم انسانیت کو جو تہذیب عطا کی اور علوم و فنون کے میدانوں میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دیے وہ تاریخ عالم کا بیش بہا ذخیرہ ہیں لیکن مختلف وجوہ سے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، مسلمانوں میں سیاسی انحطاط کے ساتھ علمی لگن میں بھی کمی ہوئی تو وہ علمی پیش رفت تو رہی ایک طرف اپنے اسلاف کے کارناموں سے بھی بیگانہ ہونے لگے اور ان کو مسلمان مشاہیر علم و ادب کی خدمات کا علم و اندازہ بھی نہیں رہا۔

اقوامِ مغرب میں سیاسی غلبہ کے ساتھ ساتھ علم و دانش میں بھی برتری حاصل کرنے کی سعی پیہم کی، اس کے لیے ایک طرف تو مغربی اہل علم نے مسلمانوں کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی کامیاب کوششیں کیں، دوسری طرف وہ خود علمی تلاش و تحقیق و کدوکاوش میں مصروف ہو گئے۔ اپنی علمی برتری اور اپنے اخلاقی تفوق کو ظاہر و ثابت کرنے کا ایک طریقہ انھوں نے یہ بھی نکالا کہ مسلمان اکابر و مشاہیر کے کارناموں پر تحقیق شروع کی، اور اپنی تحقیق کے نتائج کو انکشافات کے انداز میں خود مسلمانوں کے سامنے بھی پیش کیا۔ "خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد" کے مصداق ان کے اس طرزِ فکر و عمل کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ خود مسلمان اہل علم کو بھی اپنے اسلاف کی عظمت پر توجہ ہوئی اور ان کو احساس ہوا کہ ان کے بزرگوں نے جو کارنامے انجام دیے ہیں ان کو مستشرقین نے تسلیم کرنے میں کتمانِ حق سے خوب خوب کام لیا ہے، عالم اسلام میں بیداری اور احساسِ زیاں کی موجودہ لہر نے ہمیں ایک بار پھر موقع دیا ہے کہ ہم مستشرقین کے کارناموں کا بامعانِ نظر مطالعہ کرنے کے بعد حقائق کو تجزیہ و تحلیل کی چھلنی میں چھاننے کی کوشش کریں، اور توازنِ فکر کا دامن نہ چھوڑتے ہوئے حقائق تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ اسلام اور مستشرقین پر یہ بین الاقوامی موتمر مسلمان اہل علم کو ایک زریں موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ اسلامی تاریخ کے باب میں ایک جامع لائحۂ عمل تیار کریں۔

میرا موضوع مستشرقین اور اسلامی طب ہے، میں نے اس میں اختصار کے ساتھ مستشرقین کے کام کا دیانتدارانہ

اور فراخ دلانہ جائزہ لینے کی کوشش کی ہے، اور کیڑے نکالنے کی ذہنیت اختیار نہیں کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلامی طب کی ایک مبسوط اور جامع تاریخ مرتب کریں اور اس میں مسلمان اطباء و حکماء کے کاموں کو صحیح علمی و تاریخی پس منظر میں پیش کریں، صرف اسی طرح ہم اس کوتاہی کی تلافی کر سکیں گے جو ہم نے اپنی علمی تاریخ کی تدوین سے غافل و بے نیاز ہو کر کی ہے، ایک مسلمان طالب علم کی حیثیت سے میرا انداز فکر یہ ہے کہ ہمیں دوسروں کی کوتاہیوں، گمراہیوں اور [illegible] کی تنقید پر عطف توجہ سے زیادہ مثبت انداز میں خود علمی پیش رفت کی جانب مائل ہونا چاہئے، صرف اسی طرح ہم بعض مستشرقین کے ایسے کاموں اور ان کے مضر اثرات کا بھی ازالہ کر سکیں گے جو انھوں نے اپنے مخصوص مصالح اور مفادات کی بنا پر ہماری علمی تاریخ پر مرتب کئے ہیں۔

لیگسی آف اسلام کے ایک مقالہ نگار اور معروف مستشرق الفریڈ گیلم نے بڑے محتاط انداز میں اور بڑی دبی زبان سے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ گیارہویں صدی میں یورپ میں قائم کی جانیوالی یونیورسٹیوں اور دوسری تعلیم گاہوں کے طرز تعلیم ہی نہیں، بلکہ طرز تعمیر کا خاکہ بھی اسلامی جامعات کی نقل تھا، گب نے اسی کتاب میں شامل اپنے مقالہ میں تحریر کیا ہے کہ انگلستان میں چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد جو سب سے پہلی کتاب طبع ہوئی وہ ایک مصری عالم مبشر ابن فاتک کی تالیف ملفوظات فلاسفہ کا انگریزی ترجمہ تھی، اس کتاب کو ارل ریورز نے ہسپانوی ترجمے کے واسطے سے The Dictates and SAyings of the Philosophers کے نام سے انگریزی میں منتقل کیا تھا۔

اسی طرح قائم ہونیوالی یورپی درسگاہوں اور ان کے اطراف کی آبادی پر پڑنے والے اثرات، نیز عربی سے مغربی زبانوں میں منتقل ہونے والی کتابوں اور صلیبی جنگوں اور ان کے اثرات مابعد نے اسلامی اور عربی علوم وفنون کے یورپ میں داخل اور دخیل ہونے کی راہیں ہموار کیں، ان علوم میں متعدد اسباب کی بنا پر طب کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

ای۔ جی۔ براؤن نے لکھا ہے کہ "صلیبی جنگیں مغرب میں طب اسلامی کی اشاعت کی محرک کہی جا سکتی ہیں، لیکن یہ محض ایک سیاسی پس منظر ہے، مترجمین کی ایک خاص تعداد حروب صلیبیہ سے پہلے ہی طبی سرمایے کو لاطینی میں منتقل کرنے کی کوشش میں مصروف ہو چکی تھی"۔ سائنسی علوم کے ممتاز مورخ جارج سارٹن کا بھی خیال یہی ہے کہ صلیبی جنگوں سے صرف نظر کر کے اگر دیکھا جائے تو اندلس میں مسلم حکومت کا قیام اور یورپ میں اس زمانہ میں قائم ہونے والی طبی درسگاہیں سرزمین مغرب میں طب اسلامی کی اشاعت کا اہم ترین سبب معلوم ہوتی ہیں۔

اٹالیہ کے شہر سلرنو کے مدرسۂ طبیہ اور ماؤنٹ پیلیر میں واقع طبی درسگاہ کو طب عربی کی تعلیم و تدریس اور تالیف و ترجمہ کے لئے تاریخ میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ یورپ کے حکمرانوں کے علاج معالجہ کے لئے بلائے جایا کرتے تھے۔

سلرنو ہی کی درسگاہ کا ایک فرد قسطنطین الافریقی بھی تھا، جو سب سے پہلے نویں صدی عیسوی کے اواخر میں اسلامی طب کے سرمایے کو لاطینی میں منتقل کرنے کی طرف متوجہ ہوا، اور اس نے رازی کی الکیمیار کا ترجمہ لاطینی میں کیا، اگرچہ طبی اصطلاحات کے تراجم میں اس سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، تاہم یہ فخر اس کو حاصل ہے کہ وہ پہلا مستشرق ہے جس نے رازی کو مغرب سے روشناس کرایا۔ اسی طرح اس کی دلچسپی نے مغرب میں اسلامی طبی لٹریچر کے تراجم کی تحریک پیدا کی، سلرنو کے مستشرقین میں ایک اہم شخصیت کریمونا کے جیرارڈ کی ہے جو ۱۱۱۴ء میں اٹلی میں پیدا ہوا، اس نے بطلیموس کی المجسطی اور جالینوس اور بقراط کی کتابوں کے ترجمے کے علاوہ القانون کو لاطینی زبان میں منتقل کر کے اہم خدمت انجام دی، اس ترجمے کے بعد ہی اہل مغرب شیخ الرئیس سے کما حقہ متعارف ہوئے اور ان کے ہاں ایک نئے طبی دور کا آغاز ہوا، براؤن نے ایک اور مستشرق کا ذکر بھی کیا ہے، جو یورپ میں ابن سینا کے افکار کی اشاعت کا سبب بنا، ان کے علاوہ ایک یہودی طبیب فرج بن سالم نے ۱۲۷۹ء میں رازی کی کتاب الحاوی کا ترجمہ کیا۔

ایڈے لارڈ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اساسی علوم اور عربی زبان کی باقاعدہ تحصیل کے بعد انگلستان جا کر متعدد عربی کتابوں کے ترجمے کئے۔ اس طرح رفتہ رفتہ اسلامی عربی علوم کو یورپ میں فروغ حاصل ہوتا گیا۔ ہسپانیہ کا شہر طلیطلہ اسلامی علوم و فنون کا بہت بڑا مرکز تھا، ہسپانیہ میں پیرس کے ایک انگریز طالب علم ڈینیل مارلے نے عربی کی بہت سی کتابوں کے ترجمے کئے، اس کے سارے ترجمے بارہویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں، اسی عہد میں ایک یہودی طبیب ابراہیم نے ڈاکٹر میکس سائمن کے اشتراک سے زہراوی کی کتاب کا ترجمہ کیا، الفانسو نیز بوناکوسا نے ابن رشد کی کتاب الافعال اور کلیات کا ترجمہ کیا،

اسلامی علوم سے مستشرقین کے شغف کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ بیشتر اہم کتابوں کے ایک سے زیادہ ترجمے کئے گئے۔

تیرہویں صدی میں اسٹیفن نے المجوسی کا ترجمہ وینس سے ۱۴۹۵ء میں شائع کیا، رابرٹ اور ڈراگن کی کوششوں سے اور نیز دوسرے مترجمین کی محنت اور توجہ سے دسویں صدی میں کندری رازی اور بعض دیگر اطبائے اسلام کی کتابیں بھی لاطینی

میں منتقل ہو گئیں اور تسلسل کے ساتھ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یورپی زبانوں میں اسلامی طبی لٹریچر کے تراجم اور ان کی تحقیق کا سلسلہ جاری رہا۔

عہد بہ عہد مستشرقین کا ذوق تحقیق ترقی کرتا رہا، انھوں نے طبی ذخائر کی تلاش و جستجو شروع کی، نایاب نسخوں کی دریافت اور ان کی نشان دہی اور ان پر تحقیق کے ساتھ ان کی تہذیب و ترتیب ان کے اہم کارناموں کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج کی لائبریریوں کے علاوہ شخصی اور ذاتی کتب خانوں میں جا کر بعض اہم نسخوں کا مطالعہ کیا، پروفیسر براؤن نے بعض ایسی طبی کتابوں کے قابل اعتماد نسخوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن کی نقلیں شخصی کوششوں سے حاصل ہوئیں اطباء کی تاریخ میں قفطی کی تاریخ الحکماء خاص اہمیت رکھتی ہے، ڈاکٹر جولیس لپیرٹ نے خاصے حزم و احتیاط کے ساتھ سنہ ۱۹۰۳ء میں اس کو ایڈٹ کر کے شائع کیا۔

"پروفیسر براؤن نے الحاوی کے بارہ میں لکھا ہے کہ اس کا مکمل ترین نسخہ بوڈلین لائبریری میں ہے، اس کے بعض حصص کے فوٹو میں نے پروفیسر مارگولیتھ کی مہربانی سے حاصل کر لئے ہیں۔"

طب اسلامی پر تحقیق کا کام جس کے لئے صرف طبی کتابوں کے ذخیرے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ ان وسائل کا اہتمام بھی ضروری تھا جن کی مدد سے ان تصانیف اور کارناموں کی قدر و قیمت کا تعین ممکن ہو، ان میں قلمی نسخے بھی شامل ہیں، اس سلسلہ کا پہلا کام ان مخطوطات کا تحفظ تھا، یہ فریضہ برٹش میوزیم لندن اور اسی طرح برلن کے مشرقی علوم کے کتب خانے اور کتب خانہ پیرس کے علاوہ کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے شعبۂ علوم شرقیہ نے انجام دیا۔

تحفظ کے ساتھ ساتھ ان کتب و مخطوطات کی محققانہ فہرست سازی بھی افادی نوعیت کا ایک اہم کارنامہ ہے، اور انہی فہارس کے ذریعہ خود مشرقی دنیا کو اپنے بعض گرہائے نایاب کی اطلاع ملی۔

یہ فہرستیں صرف کتابوں کے ناموں تک محدود نہیں ہیں بلکہ مصنفین اور مباحث کتاب کا ممکن حد تک تعارف بھی ان فہرستوں میں موجود ہے جن سے اہل علم ہر دور میں مستفید ہوتے رہے ہیں، پروفیسر براؤن نے لیکرک، بروکلمان کا تذکرہ اپنے لکچرز میں جا بجا کیا ہے، ایسی فہرستیں ارباب ذوق کے لیے بہت اہم ہوتی ہیں، ان فہرستوں اور طبی ذخیروں کی موجودگی اور عربی زبان و ادب سے مستشرقین کی دلچسپی نے ان کو اہم خدمات کا موقع عطا کیا۔

پروفیسر براؤن کی صراحت کے مطابق بیسویں صدی کے اوائل میں متعدد طبی کتابوں کے انگریزی تراجم کے علاوہ ابن الندیم

کی الفہرست (سنہ ۳۸۰ھ) قفطی کی تاریخ الحکماء (سنہ ۶۴۶ھ) ابن ابی اصیبعہ کی طبقات الاطباء (سنہ ۶۶۸ھ) اور اسی نوع کی بعض دیگر کتابوں کے اعلیٰ ایڈیشن منظر عام پر آچکے تھے، اور یہ قابل قدر خدمات مستشرقین ہی نے انجام دی تھیں۔

طب عربی کی عمومی خصوصیتوں پر نیوبرگر، بیچل، وتھینگٹن، گیریسن وغیرہ نے قابل قدر کام کیا۔

طب اسلامی پر ناقدانہ بحث و نظر کے سلسلہ میں ڈاکٹر ماکونک اور ڈاکٹر سائمن خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان محققین کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اطبائے اسلام کی طبی اصطلاحات کو صحت کے ساتھ درج کیا اور یونانی اصطلاحات سے ان کا مقابلہ وموازنہ بھی کیا ہے۔

بیسویں صدی میں طب اسلامی سے مستشرقین کے شغف نے جو ارتقائی شکل اختیار کی، اس کے بعض پہلو خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، انیسویں صدی سے ان کی تحقیقات کا دائرہ ترجمے اور یونانی کتب سے تقابل سے آگے بڑھ کر سائنٹفک بنیادوں پر قدیم طبی حقایق کی تلاش وجستجو شروع ہوئی، اس کو ہم ان کے علمی ذوق وشعور کی ترقی بھی کہہ سکتے ہیں اور ان کی اپنی ضرورت بھی۔

فاضل مستشرق مارٹن لیوی نے الکندی پر اپنی فاضلانہ تحقیق پیش کرتے ہوئے اپنی کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے۔ "یہ امر مسلّم ہے کہ جدید طب نے خصوصیت کے ساتھ طب اسلامی کے علم دواسازی اور قرابادینوں سے استفادہ کیا ہے، جدید فن دواسازی کو اساس وبنیاد طب اسلامی ہی نے فراہم کی" یہی خیال دراصل ان کے ذوق تحقیق کے لئے تازیانہ بنا۔ چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ موجودہ صدی میں مستشرقین کی توجہ طب اسلامی کے ذخائر کی طرف روز بروز زیادہ سے زیادہ ہوتی جارہی ہے۔ انھوں نے طب کی فنی کتب ہی نہیں، بلکہ مسلمان اطباء کی سوانح اور ان کے علمی کمالات کی تفصیلات پر دقیق نظر ڈالی، طب اسلامی کے اولین ماخذ کی تلاش وجستجو کی، مسلمان اطباء کے افکار کے سائنسی عناصر کا تجزیہ کیا۔ اور دانش حاضر کے سرمایے میں ان کے اثرات کی کارفرمائی کا جائزہ بڑے تعمق کے ساتھ لیا۔ نہایت سلیقہ سے علم اور علماء کی تاریخ کے اہم ماخذ کو مغربی زبانوں میں منتقل کیا اور ان سارے وسائل وذرائع سے کام لے کر اطبائے اسلام کے کارناموں پر شرح وبسط اور نقد ونظر کے ساتھ روشنی ڈالی۔

یہ امر لائق توجہ ہے کہ اطبائے اسلام کے کارناموں پر مستشرقین کے مضامین، مقالات اور ان کی تصانیف سرسری نوعیت کی نہیں ہیں، بلکہ قدیم تذکرہ نگاروں کی روش سے ہٹ کر تفصیل وتجزیہ اور تعیین مقام ومرتبہ کی کوشش بھی ان کی ممتاز خصوصیت ہے لیکن ان کے ہمہ گیر ذوق تحقیق یا ان کی خدمات کا دوسرا پہلو اس سے زیادہ اہم ہے۔ اور وہ ہے اطبائے اسلام کی تصانیف

کو تصحیح و تہذیب کے ساتھ مرتب کرکے پیش کرنا، اور حق یہ ہے کہ اس میدان میں ان کی محنت و کاوش، دقت نظر اور بصیرت کی داد نہ دینا نا انصافی ہے، اس آخر الذکر کارنامے کا منفرد پہلو یہ ہے کہ ہمارے اسلاف کے بعض قیمتی کارنامے ہم تک انھی کوششوں سے پہونچے، اور مستشرقین نے اسلاف کے بعض ایسے علمی کارنامے طشت از بام کیے ہیں جن کی خبر ہمارے بیشتر اہل علم کو اب تک نہیں ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی ادارت اور پیش کش ایسے سائنٹفک اصولوں پر ہوتی ہے جن سے تصنیف و مصنف دونوں کی عظمت و افادیت کے سارے گوشے نمایاں ہو جاتے ہیں۔

ان کی ادارت و تحقیق کی انفرادیت کے ضمن میں قدما کی فنی تصانیف کے بھی چند خصائص کا ذکر ضروری ہے، جو صوری اور معنوی دونوں حیثیت سے نہایت اہم ہیں، اطبائے اسلام کی فنی تصانیف مثلاً رازی کی الحادی، ابن سینا کی القانون اور سمرقندی کی القرابادین کی زبان و ہیئت آج کی زبان و ہیئت سے بہت مختلف ہے، وضاحت اور تفصیل جو عصر حاضر کی تحریروں کی خصوصیت ہے وہ بظاہر ان کتابوں میں نظر نہیں آتی، بعض رسائل و کتب پر از اول تا آخر ایک مسلسل پیراگراف کا گمان ہوتا ہے، جو رموز و اوقاف سے خالی ہو، یوں اس قلزم میں سارے گہر موجود ہیں، لیکن قاری کے لئے گہر چینی دشوار ہوتی ہے۔

معنوی خصوصیت میں ابہام اور اصطلاحات کا بکثرت استعمال اور مختصر اشارات خاص طور پر لائق ذکر ہیں، کتابوں کے متون بعض ناقلوں کی غفلت کی وجہ سے خلط ملط بھی ہوئے ہیں، ان مشکلات کی موجودگی میں تہ رسی اور غواصی کی مہم بہ آسانی سر نہیں کی جا سکتی تھی، مستشرقین بلاشبہ قابل تبریک ہیں کہ ان دشواریوں کے باوجود انھوں نے طبی کتابوں کے مضامین اور نکات کا ادراک کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

قدما کے طرز تصنیف اور زبان کی پیچیدگی، اصطلاحات کی کثرت، عبارتوں کی عدم وضاحت کا ذکر براؤن نے بھی کیا ہے، قدیم مصنفین کے نزدیک فنی کتابوں میں تفصیل و تشریح کو غیر علمی اسلوب سمجھا جاتا تھا، حاشیے اور شرحیں اسی لیے وجود میں آئیں۔ قدیم مصنفین کا خیال تھا کہ کتاب کے مضامین کی ترتیب، حوالے اور مآخذ کی جستجو، اشارات کی مدد سے مباحث کا مکمل ادراک مطالعہ کرنے والے کا کام ہے، مطالعہ کرنے والوں پر ساری تفاصیل کے دروازے کھولنے کی کوشش کو وہ علم اور اہل علم دونوں کی توہین اور حق تلفی سمجھتے تھے، لیکن جدید دنیا میں اخفا، اغماض اور ابہام کے برخلاف قاری کو ساری سہولتیں بہم پہونچانے کی ذمہ داری مصنف کی سمجھی جاتی ہے، اور جو فنی کتابیں ان اوصاف سے خالی ہوتی ہیں وہ اپنی وسیع افادیت کے باوجود علمی استفادہ میں مشکلات پیدا کرتی ہیں۔

مستشرقین کی یہ کوشش بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ جدید طرز تحریر و تصنیف کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھوں نے قدیم طبی سرمایے کو اس قدر پرکشش اور استفادہ کے لیے زیادہ آسان بنادیا ہے، مشکل مقامات پر توضیحی نوٹ اور کتاب کے مندرجات کی ابجدی فہارس مرتب کر کے انھوں نے کتابوں کی افادیت کو کئی گنا بڑھا دیا ہے۔

میں اس جگہ طبی اہمیت کے دو کارناموں کا کسی قدر تفصیلی تعارف کرانا چاہتا ہوں، جو مستشرقین کی مساعی سے ہم تک بڑے مناسب انداز میں پہونچے ہیں، یہ کارنامے الکندی اور سمرقندی کی قرابادین ہیں جنھیں مارٹن لیوی نے ترتیب نو اور تہذیب نو کے بعد انگریزی ترجمے کے ساتھ شائع کیا۔

تذکرہ نگاروں نے الکندی کی دو سو پینسٹھ ۲۶۵ کتابوں کا ذکر کیا ہے، لیکن ان میں سے بیشتر ناپید ہو گئی ہیں، بصریات پر اس نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا صرف لاطینی ترجمہ موجود ہے جس کے متعلق میکس مارہوف نے لکھا ہے کہ راجر بیکن اور دوسرے مغربی علمائے بصریات نے اس سے استفادہ کیا ہے، میرے علم کی حد تک کسی مشرقی زبان میں الکندی کی یہ کتاب موجود نہیں، اسی طرح مسلمان تذکرہ نگاروں نے الکندی کی تصانیف میں سے بعض کتابوں کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا، ابن ندیم کی الفہرست میں اس کی قرابادین کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، ترکی کے کتب خانہ ایا صوفیہ میں اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ موجود تھا، لیکن زمانۂ حال تک یہ غیر معروف رہا ایک ترک عالم کی نشاندہی پر مارٹن لیوی نے اسے اصل مخطوطے کے فوٹو اور اس کے انگریزی ترجمے کے ساتھ مہذب اور منقح کر کے شائع کیا ہے، لیوی نے کتاب میں جو اضافی ابواب تحریر کیے ہیں ان میں الکندی کی شخصیت اور اس کے علمی اور خاص طور پر طبی کارناموں کا مفصل ذکر کیا ہے، طب اسلامی میں دواسازی اور علم الادویہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے، قرابادین میں جن مرکبات کا ذکر ہے ان کے مفرد اجزاء کے سائنٹفک مترادفات (نباتاتی اور کیمیائی نام) دیے ہیں، طبی دواسازی کی اصطلاحات اور اعمال دواسازی کی تشریح و توضیح کی ہے، اور جگہ جگہ تاریخی اور طبی اہمیت کے وضاحتی نوٹ لگائے ہیں، کتابیات کے ضمن میں ان جدید و قدیم مصادر کا ذکر کیا ہے جن سے طبی علوم اور تاریخ طب کے ضمن میں معلومات حاصل ہو سکتی ہیں، کتاب کے آخر میں دواؤں کی فرہنگ اور اشاریے لگائے ہیں، اس طرح اس مستشرق نے تاریخ طب اسلامی کا ایک نیا باب اہل تحقیق کے لئے وا کیا ہے، اور ہمارے گم شدہ گوہر کو مجلی کر کے ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔

اس مستشرق نے بالکل اسی انداز پر فخر الدین رازی کے ہم عصر معروف طبیب نجیب الدین سمرقندی کی قرابادین بھی ایڈٹ کر کے شائع کی ہے، لیوی کے ان دونوں کارناموں کا مفصل تذکرہ اس جگہ بے محل ہوگا، یہ دونوں کام میں نے محض نمونے

کے طور پر پیش کیے ہیں۔

اس جگہ چند ان مستشرقین کا ذکر بے محل نہ ہوگا جنھوں نے ایسی ہی بصیرت اور تحقیقی ندرت کے ساتھ خالص سائنٹفک انداز سے اطبائے اسلام کے کارناموں پر مورخانہ انداز سے روشنی ڈالی ہے۔

ان میں اولین نام ایڈورڈ جی براؤن کا ہے جو کیمبرج یونیورسٹی کے نامور پروفیسر اور وسیع النظر مستشرق کی حیثیت سے اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں، ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء میں رائل کالج آف فزیشنز لندن کی دعوت پر انھوں نے طب اسلامی پر چار فاضلانہ خطبات دیے جو بعد میں کتابی صورت میں Arabian Medicine کے نام سے شائع ہوئے ۱۹۳۳ء میں فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا، یہ کتاب بظاہر طب عرب کی تاریخ معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف تاریخ نہیں ہے، بلکہ اس میں طب اسلامی کے اساسی تصورات، اس کے ارتقاء اور عالمی تہذیب پر اس کے اثرات، موجودہ طبی سائنس کی ترقی میں اس کے حصے، اکابر اطبائے اسلام کے مقام و مرتبہ، ان کے منفرد طبی اکتشافات، طب کے امہات کتب، ان کے مستند نسخے اور ان کی فنی افادیت کی فاضلانہ توضیح و تشریح پر مشتمل ایک بہترین کتاب ہے۔ اس کتاب میں طب اسلامی کے تصنیفی سرمایے کی طرف اشارہ ہی نہیں بلکہ پوری صراحت اور تحقیق کے ساتھ ہر ایک کے مضامین پر تبصرہ بھی ہے۔

پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں پروفیسر میکس نیوبرگر کی کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "وہ میرے لئے بہت مفید ثابت ہوئی اگرچہ اس میں طب عرب کا ذکر کل ۸۷ صفحات میں ہے، لیکن اس کے باوجود یہ کتاب حقائق اور مستند تفصیلات سے پُر ہے۔"

پروفیسر براؤن کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی زبانوں بالخصوص فرانسیسی میں طب اسلامی کی مستند تاریخیں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے، نیز اسی دور میں پروفیسر مارگولیتھ جیسے لوگ موجود تھے، جو تشریح قدیم کے سمجھنے میں براؤن کی رہنمائی کرتے تھے۔ اس طرح میکس نیوبرگر بھی اہم مستشرق سمجھا جاتا ہے، لیکن طب اسلامی کی عظمت کی پرشکوہ عمارت جن علمی اور سائنسی بنیادوں سے موثر صداقت کے ساتھ پروفیسر براؤن نے مغربی دنیا کو دکھائی اس نے دیگر مستشرقین کے لیے ایک مستقل مکتبۂ فکر کی صورت اختیار کرلی۔

اس کے ٹھیک دس برس کے بعد ۱۹۳۳ء میں Legacy Of Islam کے نام سے ایک اور اہم کتاب وجود میں آئی۔ یہ متعدد فضلاء کی مجلس علمی کی ادارت میں مرتب ہوئی۔ اس کتاب میں اسلام کی تمدنی، تہذیبی اور علمی میراث اور اس کی عالمی افادیت بالخصوص مغربی فکر و ثقافت پر اس کے اثرات کا ہمہ گیر جائزہ لیا گیا ہے، مختلف شعبہ ہائے علوم و فنون میں خصوصی

مہارت اور شہرت رکھنے والے ماہرین کے مقالات جمع کیے گئے ہیں، اس کتاب میں اسلام کے متعلق جو مختلف فیہ امور آئے ہیں وہ میرا موضوع نہیں، ان کے بارے میں تنقیدی حوالوں سے آپ حضرات واقف ہیں، اس کتاب کا ایک عنوان اسلامی طب و سائنس بھی ہے، مشہور مستشرق مارٹن لیوی نے اپنے فاضلانہ مقالے میں جس تاریخی ترتیب سے طب اسلامی کے ارتقاء اور مشرق و مغرب پر اس کے اثرات کا ذکر کیا ہے وہ ترتیب Arabian Medicin میں بھی نظر نہیں آتی طبی کتابوں کے یورپین تراجم اور وہاں کی ڈگری کے نصاب میں ان کی شمولیت کی جو تفصیلات اس مستشرق نے پیش کی ہیں ان سے یورپ پر دانش اسلامی کے اثرات کا اندازہ کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں بعض مستشرقین نے اطبائے اسلام کے فنی کمالات، تصانیف اور ان کی اہمیت مستند مآخذ اور دیگر تفصیلات پر جو مقالات پیش کیے ہیں وہ بھی منفرد نوعیت کے کارنامے کہے جا سکتے ہیں، میں اجازت چاہوں گا کہ اس کتاب کے مختلف فیہ مسائل سے صرف نظر کرتے ہوئے اپنی گفتگو صرف طب اور سائنسی علوم تک محدود رکھوں، الغرض اس دائرۃ المعارف میں الکندی رازی، ابن رشد، ابن سینا، فارابی، سمرقندی، زہراوی اور دیگر اطبائے اسلام سے متعلق جو مستند اور مفصل معلومات یکجا کر دی گئی ہیں، وہ اگر ایک طرف اکابر کے کمالات کا مرقع ہیں تو دوسری طرف مستشرقین کے اہم کارناموں کی بھی حیثیت رکھتی ہیں، بیسویں صدی کے وسط اول ہی میں ایک ممتاز مستشرق جارج سارٹن جو پہلے ہی سے تاریخ علوم پر متعدد مضامین و مقالات لکھ چکا تھا اس اہم کام کی طرف متوجہ ہوا، اس نے دی اسٹڈی آف دی ہسٹری آف سائنس کے عنوان سے تاریخ علم کا دائرۃ المعارف مرتب کرنے کا فیصلہ کیا اور اس طرح ۱۹۲۷ء میں انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس کے نام سے تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ایک کتاب وجود میں آئی جس میں دانش قدیم و جدید کی تاریخ ہر ممکن تفصیل کے ساتھ پیش کی گئی۔

جارج سارٹن نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "میرا ایمان ہے کہ عصر حاضر میں علوم فن کی دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی اساس و بنیاد ماضی میں موجود نہ ہو۔"

یہی خیال اس کتاب کی تصنیف کا محرک ہوا، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس نے ماضی میں انسانی تہذیب و ثقافت کی انتہائی گہرائیوں میں جا کر اساس و بنیاد کی جستجو کی اور اپنے مقصد میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوا۔

چنانچہ قرون وسطیٰ کی تاریخ علم و ثقافت میں اسلام اور اہل اسلام کے علمی و فکری کارناموں کا کوئی گوشہ اس نے تشنہ نہیں چھوڑا۔ طب اسلامی نے جس عظیم فلسفہ و سائنس کی بنیاد پر ارتقاء کی منزلیں طے کیں اس پر خصوصیت کے ساتھ اس نے توجہ کی

اس سے نہ صرف ماضی و حال مربوط و ہم رشتہ ہو گئے ہیں بلکہ سارے اکابر کے کارناموں کے منفرد پہلو بھی پوری صراحت کے ساتھ سامنے آگئے ہیں۔

اس کتاب کی یہ خصوصیت ساری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے کہ اس میں اسلامی طب و سائنس کا تذکرہ عالمی سائنس کے پس منظر میں کیا گیا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اسلامی علمی دانش کی تاریخ کو اس کے حقیقی جمال و کمال کے ساتھ پیش کر کے سارٹن نے اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک تازہ کوشش ایڈنبرگ یونیورسٹی کا ایک سلسلۂ کتب "اسلامک سیریز" ہے اس کی گیارہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

مستشرقین کی ان کوششوں کی وجہ سے جہاں اہل مغرب میں اسلامی علوم کے تحقیقی مطالعہ کی ضرورت کا احساس بڑھ رہا ہے وہیں ان کی یہ خدمات ہمیں بھی یہ راہ دکھاتی ہیں کہ ہمارے اسلاف نے اپنی ذہنی و علمی کاوشوں کا جو ذخیرہ چھوڑا ہے، وہ سائنسی تحقیقات کے اس دور میں بھی کارآمد مواد اور مزید تحقیق کے لیے مضبوط اساس فراہم کرتا ہے۔

مستشرقین کے افکار و نظریات کے مختلف دور
طریقۂ کار کا تجزیہ اور اصلاح حال

از

پروفیسر خلیق احمد نظامی، شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

ہر قوم کی حیات اجتماعی کی ایک روح ہوتی ہے جس کے صحیح ادراک کے بغیر اس کی تاریخ یا تمدن کی بنیادی حقیقتوں تک رسائی ممکن نہیں، مستشرقین نے اسلام کی تاریخ اور تہذیب کی تحقیق میں مہتم بالشان کارنامے انجام دیے ہیں، لیکن ان میں سے بیشتر اس کی داخلی معنویت کو سمجھنے سے عاجز رہے ہیں، اس ناکامی کے اسباب کی توجیہ اس وقت ممکن ہے جب ان عوامل اور محرکات کا سراغ لگایا جائے جن کے زیر اثر مستشرقین نے تاریخ اسلام پر اپنی توجہ مرکوز کی تھی اور اس کے مذہبی افکار اور تمدنی اداروں کی نوعیت کو سمجھنا چاہا تھا، یہ محرکات کبھی مذہبی عصبیت کا سہارا لیتے تھے، کبھی مقتضائے سیاست سے ان کا رخ متعین ہوتا تھا، کبھی معاشی دوراندیشی، علمی جد وجہد کا پیکر اختیار کر لیتی تھی، مذہب، سیاست اور معاشیات کی اس تگ ودو میں خالص علمی اور تحقیقی کاوشوں کی کیفیت گرہ پا نظاروں کی سی رہتی تھی، اگر تاریخ کے وسیع پس منظر میں دیکھا جائے تو مستشرقین کی تحقیقی جد وجہد کے پانچ دور سامنے آئیں گے۔

پہلا دور (۱) اسلام اور اس کے تہذیبی کارناموں سے واقفیت حاصل کرنے کا جذبہ مغرب میں اس وقت بیدار ہوا تھا جب اسپین اور سسلی کی سرزمین پر عربوں نے قدم رکھا تھا، یہ صرف ایک ملک یا ایک جزیرہ کی فتح نہ تھی بلکہ تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کے ایک نئے اور انقلاب آفریں دور کا آغاز تھا، ایسا دور جس نے بقول مشہور فرانسیسی مستشرق پروفیسر میسی نیون[لہ] تہذیبی اعتبار سے یورپ کو بیدار کیا اور مغرب کی ترقی کے لئے نئے نئے امکانات پیدا کر دیئے، عربوں کے علوم کو حاصل کرنے، ان کے مذہب کی حقیقت کو سمجھنے اور ان کی علمی سربلندی کا راز دریافت کرنے کا جذبہ اس بات کا محرک ہوا کہ اسلام کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے، عربوں کی نئی تحقیقات، نئے علمی تجربات، نئے علمی رجحانات سے یورپ کے عالم استفادہ کرنا چاہتے تھے، اور گو پیغمبر اسلام کے متعلق جب گفتگو کرتے تو اپنے متعصبانہ جذبات کو چھپا نہ پاتے تھے، لیکن اسلام کے علمی ذخائر کے ذریعہ علمی سربلندی کا راز معلوم کرنے کی جستجو ان کے سارے جذبات پر حاوی تھی، ۱۱۳۰ء میں طلیطلہ کے ایک فاضل ڈریمونڈ نے ایک محکمہ اسلامی فلسفیانہ تصانیف کو عربی سے لاطینی میں منتقل کرنے کے لئے قائم کیا، اس محکمہ میں بہت سے یہودی عالم شامل

لہ روز گار فقیر، فقیر سید وحید الدین ص ۱۰۶

تھے۔ ۱۱۱۰ء میں طلیطلہ ہی کا ایک یہودی عالم ابراہیم بن عذرا انگلستان پہونچا اور علوم اسلامی کے مطالعہ کی ضرورت اور افادیت پر توجہ دلائی اس زمانہ میں عیسائیوں اور یہودیوں نے جن کی زبان عبرانی تھی، عربی پر غیر معمولی قدرت حاصل کی، اور عربی کتابوں کو لاطینی اور دوسری زبانوں پر منتقل کرنا شروع کر دیا، گیرر ڈ ڈی کریمونا (م ۱۱۸۷ء) Gerarddi Crimona نے رازی اور ابن سینا وغیرہ کی تقریباً ساٹھ کتابوں کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا، اسی زمانہ میں یورپی ممالک بالخصوص انگلستان کے علماء اسپین کی عرب درسگاہوں میں تحصیل علم کے لئے آنے شروع ہوئے، بارہویں صدی کے ان علماء میں ایڈیلرڈ (Adelard) کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، اس نے انگلستان میں نہ صرف عربی علوم کی حمایت میں بہت کچھ لکھا۔ بلکہ متعدد عربی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا، ڈینیل آف مارلے (DenielofMarley) نے اسپین پہنچکر، عربوں کی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کی، میکل اسکاٹ (Michael Scott) نے سسلی میں اسلامی علوم کی تحصیل کی اور پھر ارسطو کی تصانیف کا عربی سے ترجمہ کرنے میں عمر گذار دی، کلیسا نے بھی عربی علوم کی افادیت کو محسوس کیا اور پوپ جان (Pope Jahn XXII) نے ۱۳۲۵ء میں ایک منشور کے ذریعہ اپنے نمایندے کو پیرس میں ہدایت کی کہ کالج کے عربی شعبہ کی نگرانی میں غفلت نہ برتی جائے۔

ایڈیلرڈ نے اپنی کتاب مسائل طبیعیہ (Natural Questions) میں عربوں کے ان احسانات کا بھی ذکر کیا ہے جس نے یورپ کی خاموش علمی فضا میں حرکت پیدا کر دی تھی، عربوں نے یورپ کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ عقل (Reason) کو سند (Authority) پر ترجیح حاصل ہے، یورپ کا دور احیائے علوم (Renaissance) اسی اصول کا شرمندۂ احسان تھا۔[1] آنے والی صدیوں میں اسی پر عمل پیرا ہو کر یورپ نے علمی دنیا کی سربراہی کا راز پایا اور وہ عظیم الشان علمی کارنامے انجام دیے جنھوں نے اس کو علمی فضیلت کی صف اول میں پہونچا دیا، اقبال نے اسی دور کے عربوں کے کارناموں کے پیش نظر کہا ہے

حکمتِ اشیاء فرنگی زاد نیست اصل او جز لذت ایجاد نیست

نیک اگر بینی مسلماں زادہ است این گہر از دستِ ما افتادہ است

چوں عرب اندر اروپا پر کشاد علم و حکمت را بنا دیگر نہاد

دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند حاصلش افرنگیاں برداشتند

---

[1] انگلستان اور عربی علوم و فنون۔ برنارڈ لیوس کی تقریریں، ص ۵ - ۴

دوسرا دور (۲) مستشرقین کی علمی سرگرمیوں کے دوسرے دور کی ابتدا صلیبی جنگوں سے ہوتی ہے، گو بعض مستشرقین جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے، صلیبی جنگ کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کی علمی جدوجہد کا مرکز اسلام نہ تھا بلکہ مسلمانوں کے وہ علوم و فنون تھے جن کے حصول میں انھوں نے کسی تعصب کو قریب نہیں آنے دیا۔ مولانا شبلیؒ نے اس دور کے مستشرقین کی علمی دلچسپیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا، "یورپ کی فیاضی، دلی رشک کے قابل ہے کہ ایک طرف تو مذہبی اختلافات کی بنا پر مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا، لیکن دوسری طرف اس نے بے تکلف مسلمانوں کے خوانِ کرم سے زلہ ربائی شروع کر دی[۵]" لیکن اس فیاضی کا تعلق غیر مذہبی لٹریچر سے تھا، جہاں تک مذہب کا تعلق ہے صلیبی جنگ کے بعد مستشرقین کے طرز فکر اور انداز تحقیق میں بنیادی تبدیلی رونما ہوگئی، اب اسلام کی تعلیمات اور پیغمبر اسلامؐ کی حیات طیبہ اور اسلامی تہذیب کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہا تھا جو ان کے متعصبانہ افکار کی زد میں نہ آگیا ہو، انھوں نے اپنی ساری صلاحیتوں کا رُخ اسلام کو غیر مہذب اور وحشیانہ مذہب ثابت کرنے کی طرف موڑ دیا، اس لئے کہ اسی میں ان کو عیسائیت کی مدافعت کی راہ نظر آتی تھی، کتنے ہی غلط اور بے بنیاد الزام تھے جو اسلام اور مسلمانوں کے متعلق اس دور میں تراشے گئے، اور ان کو شہرت عام دے دی گئی، حضرت عمرؓ کی نسبت کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کا حکم اسی زمانہ میں مستشرقین نے وضع کیا اور اس کو اس طرح مشہور کیا کہ اپنے پرائے سب کو اس کی صداقت پر یقین آگیا، اس زمانہ میں یورپ نے مسلمانوں کے خلاف جذبات برانگیختہ کرنے کے لیے ان کے متعلق گمراہ کن خیالات کو قومی گیتوں میں اس طرح سمو دیا کہ یہ جنگی معرکوں میں رجز کے طور پر گائے جانے لگے، اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ جب کسی شخص کو عیسائی بنایا جاتا تھا، تو یہ خیالات عقائد کے طور پر اس کو سکھائے جاتے تھے۔

مستشرقین نے اسلام کی جو غلط تصویر اس دور میں پیش کر دی تھی وہ مدتوں تک یورپ اور اس کے زیر اثر علاقوں میں تاریخی حقیقت کے طور پر تسلیم کی جاتی رہی۔

تیسرا دور (۳) مستشرقین کی علمی جدوجہد کے تیسرے دور کا آغاز اس وقت ہوا جب صنعتی انقلاب نے یورپی ممالک میں استعمار اور ملک گیری کی نئی خواہشات کو بیدار کر دیا، اب یوروپین اقوام نے مسلمان ملکوں پر للچائی ہوئی نظریں ڈالنی شروع کر دیں، ان حالات میں اسلام کی طرف کھلا ہوا عناد سیاسی مصالح کے منافی نظر آنے لگا، ان ملکوں پر اقتدار کے مضبوط پنجے جمانے کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک ایک پیچ و خم، ان کے افکار و احساسات کی ایک ایک خلش اور ان کے سماجی رجحانات اور دینی شعور کے ایک ایک نشیب و فراز کا پتہ لگایا جائے، محکوم کے دل و دماغ تک پہونچے بغیر حکمراں کی کوئی ساحری کامیاب نہیں ہو سکتی تھی،

---

[۵] مقالات شبلی ج ۵ ص ۵۰

اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یورپین ممالک نے سب سے پہلے اپنی یونیورسٹیوں اور اداروں کی طرف دیکھا اور ہمت افزا جواب پایا، سترہویں صدی میں کیمبرج اور آکسفورڈ میں عربی پڑھانے کا بندوبست کیا گیا، اور اسلام کے علمی ذخائر کو جگہ جگہ سے سمیٹ کر لانے کے منصوبے بنائے گئے، آکسفورڈ کے عربی پروفیسر ایڈورڈ پوکاک (Edward Pococke) نے حلب سے عربی مخطوطات کے بیش بہا ذخیرے حاصل کئے اور انجیر کے ایک درخت کے سایہ میں جو وہ شام سے لایا تھا (اور جواب تک وہاں موجود ہے) عربی تصانیف کے خلاصے کرنے شروع کر دیے، تاکہ مسلمانوں کے ملی مزاج اور علمی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ ہو سکے، جارج سیل George Sale نے اسی زمانہ میں قرآن کا ترجمہ انگریزی میں کیا، یوروپی زبانوں میں قرآن کا یہ پہلا مکمل ترجمہ تھا، استشراق کی یہ لہر جو مقتضیات سیاسی نے تیز تر کر دی تھی یورپ میں اس طرح پھیلی کہ ہر ملک مسلمانوں کی زبان، تاریخ اور مذہب کی تحقیق میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگا، جرمنی میں ریسکے (م ۱۷۷۴ء) (Reiske) سوئزرلینڈ میں بورہرڈ (م ۱۸۱۷ء) (Burhard) فرانس میں سلویسٹر دی ساسی (Sylvestre de Sacy) ہالینڈ میں ڈوزی Dozy انگلستان میں رابرٹسن اسمتھ (Roberton Smit) نے تو اسلامی تاریخ اور ادب پر تصانیف کے انبار لگا دیے برہارڈ (Burhard) نے تو مسلمان بن کر شام اور حجاز کا سفر کیا، پیرس، میڈرڈ، برلن، لندن، لائڈن، آکسفورڈ کے علوم مشرقی کے شعبوں میں اسلام پر تحقیقی کام میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار ہونے لگا، نپولین نے ۱۸۰۱ء کے بعد مصر کے علمی ذخیروں کو فرانس منتقل کرنا شروع کر دیا، انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے نادر قلمی نسخے لندن پہونچا دیے، انڈونیشیا، ہندوستان، ایران، مصر، شام، عراق کے کتنے ہی انمول موتی جن کو غیر ملکوں میں دیکھ کر بقول اقبال "دل سی پارہ ہوتا ہے" یوروپین کتب خانوں کی زینت بن گئے، نپولین نے وقت کے اشاروں کو سمجھا اور ازہر کے ساٹھ علماء کے سامنے اسلام سے اپنے احترام کا اعلان کیا اور اپنے نائب کلیبر (Kleber) کو ہدایت کی کہ حکومت کے معاملات میں مسلمانوں کے مذہبی طبقوں کا تعاون حاصل کرے[۱]۔ یہ سب سیاست کے تقاضے تھے جن کا اظہار آکسفورڈ سے لے کر ازہر تک مسلسل ہوتا رہا تھا۔

اس زمانہ میں صلیبی دور کا کھلا ہوا معاندانہ انداز مصلحتاً ترک کر دیا گیا، لیکن مقصد کے نشتر تیز تر ہو گئے، اب ساری جد وجہد کا رخ اس طرف تھا کہ مسلمانوں کو ذہنی طور پر مرعوب کر کے ایسے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا جائے کہ وہ ہر معاملہ میں ہدایت و رہبری کے لئے مغرب کی طرف دیکھنے پر مجبور رہوں، تشکیک اور شبہات کے ذریعہ ان کے قوائے ذہنی کو اس طرح مفلوج کر دیا جائے کہ وہ

---

[۱] Thiry, Bonaparte en Egypte. p.434.

صحیح سمت میں قدم اٹھا سکیں، نہ صحیح زاویۂ نگاہ سے چیزوں کا جائزہ لے سکیں، پوست پلائے ہوئے انسان کی طرح نہ اعضائے جسمانی ان کے قابو میں ہوں، نہ قوائے ذہنی پر ان کا بس چلے۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان سے متعلق مستشرقین کے کام کے دو پہلو خاص طور پر جاذب توجہ نظر آتے ہیں، ایک یہ کہ مسلمانوں کی تاریخ پر کام کرنے والے بہت سے مصنفین فوج سے تعلق رکھتے تھے، مثلاً ریورٹی Raverty Briggs (Scott) ڈاؤ (Dow) ڈیوی (Devy) دوسرے یہ کہ سیاسی مقاصد کے پیش نظر مسلمانوں کی تاریخ کو اس طرح پیش کرنے کا منصوبہ بنایا گیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کی وہ شگفتگی برقرار نہ رہ سکے جو صدیوں تک ان کی سماجی زندگی کی خصوصیت رہی تھی، سر ہنری ایلیٹ نے یہ کام آٹھ ضخیم جلدوں میں انجام دیا، ہمیں ایلیٹ کا مشکور ہونا چاہئے کہ اس نے اپنے مقاصد کا اظہار ایک عرضداشت (Memorandum) میں، انگلستان کی حکومت سے کرنے کا فیصلہ کیا، اس عرضداشت کو بعد میں کتاب کا جزو بنا کر شائع کر دیا گیا، بغیر یہ سوچے کہ مستشرقین کے خلاف یہ سب سے بڑی دستاویز ہے جو ان کے مفسدانہ مقاصد کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے۔

اسی طرح مصر کے متعلق یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ نپولین کے بیشتر مددگار اور ترجمان فرانس کے مشہور مستشرق سلوسٹر دی ساسی کی شاگرد رشید تھے، اور جب دی لیسپس (de Lesseps) نے نہر سویز کو جاری کیا تھا تو اس کے عزائم کو کامیاب بنانے میں کتنے ہی فرانسیسی مستشرقین کی بے تاب تمنائیں کام کر رہی تھیں۔

اس دور کے مستشرقین نے زہر کی تلخیوں کو تحقیق کے شہد میں اس طرح چھپایا کہ کام و دہن کو تو تلخی محسوس نہیں ہوئی لیکن زہر رگ و پے میں اتر گیا۔

چوتھا دور (۴) جب نو آبادیاتی نظام کا دم واپسیں شروع ہوا اور اسلامی ممالک میں آزادی کی تحریکیں نمودار ہونے لگیں تو مستشرقین کے انداز تحقیق اور طریقۂ کار میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہو گئی، نو آبادیوں کی آزادی کو ٹالنا اب ممکن نہ رہا تھا، لیکن ان سے بے تعلق ہو جانا ملک کے سیاسی اقتدار پر ضرب کاری کے مترادف تھا چنانچہ اب تمدنی رشتوں کی نئی زنجیریں وضع کرنے کے لئے اسلامی علوم کا نئے انداز سے مطالعہ ضروری ہو گیا، دولت برطانیہ نے اپنی نو آبادیوں سے دست بردار ہونے میں پس و پیش نہیں کیا، لیکن تمدنی سرمایہ کو (جو آج بھی کتابوں اور آثار کی شکل میں انگلستان کی زینت بنا ہوا ہے) واپس کرنے سے انکار کر دیا، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس دور کے مستشرقین کی تحقیقی کاوشوں میں رنگ احترام آ گیا، اقبال نے ۱۹۳۲ء میں جب پروفیسر میسی نیون سے کہا کہ مغرب

کے مورخین کو اسلام سے جو تعصب و عناد ہے وہ وقت گذرنے کے ساتھ کم ہو رہا ہے، اور اسلام کی صداقت اور حقیقت ان پر آشکارا اور واضح ہوتی جا رہی ہے، تو لیبی نیون نے ان کی رائے سے پوری طرح اتفاق کیا۔[۵]

حقیقت یہ ہے کہ فکر کی یہ تبدیلی مقصد بدل جانے کا نتیجہ تھی، اب سیاسی برتری قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ بظاہر انداز تحقیق میں اسلام کے ساتھ احترام کا برتاؤ کیا جائے، مبادا سیاسی آزادی کی تحریکیں مغرب کی ذہنی غلامی سے بغاوت کا رنگ اختیار کر لیں، لیکن دوسری طرف ایسے فتنوں کو خاموشی سے بیدار کر دینے کی جستجو شروع ہو گئی جن سے مسلمان ممالک افتراق اور انتشار کا شکار بنے رہیں، اور ملی وحدت کی پرچھائیاں بھی ان کے ذہن پر نہ پڑنے پائیں، اس دور کے مستشرقین اپنے ملکوں کی وزارت خارجہ کے مشیر بن گئے، اور ان کی تحقیق اگر ایک طرف مغربی حکومتوں کی خارجی پالیسی کا رخ متعین کرنے لگی تو دوسری طرف ان علاقوں میں خیالات کی تبدیلی لانے کے لیے وزارت خارجہ ان مستشرقین سے مدد دینے لگی، جو کام کبھی سپاہیوں کے ذریعہ انجام پاتا تھا، اب پروفیسروں کے ذریعہ انجام پانے لگا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد انگلستان میں اسکاربرو رپورٹ (Scarbrough Raport) تیار ہوئی جکو بجا طور پر[۶] (استشراق جدید کا منشور) (Charter of Modern Orientalism) کہا جا سکتا ہے، اس رپورٹ میں اس بات کا شدید احساس ملتا ہے کہ اگر نئے ابھرتے ہوئے مشرق کو پوری طرح نہیں سمجھا گیا تو برطانوی مقاصد بری طرح متاثر ہونگے، ان مقاصد کو "امن عالم" (World Peace) کا معصوم نام دیا گیا ہے، لیکن سامراجی جذبات افکار کا نیا چولہ بدل کر اس رپورٹ کے ایک ایک حرف سے جھلکتے نظر آتے ہیں ایچ۔ اے۔ آر گب (H.A.R. Gibb) نے Modern Trends in Islam میں نئے انداز سے مسلمانوں کی نبض پر ہاتھ رکھا ہے، اور وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے پیش نظر عالم اسلام پر نظر ڈالی ہے۔

پانچواں دور (۵) مستشرقین ابھی اسی دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تدابیر سوچ رہے تھے کہ اسلامی ممالک میں زر سیال کے چشمے ابل پڑے اور دنیا کا مرکز ثقل عرب ممالک کی طرف منتقل ہو گیا، مستشرقین کے حاشیہ خیال میں بھی ایسی صورت نہ تھی، اسلامی ممالک کی اقتصادی آزادی کے خیال نے ان کی استعمارانہ فکر کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیئے، نئی صورت حال کے امکانات ان کے لیے تشویش بلکہ توحش کا باعث بن گئے، اقتصادی اعتبار سے ان حالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش برابر جاری ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ قرون اولیٰ کے اسلام کے مطالعہ سے بے توجہی برتی جا رہی ہے، اب مستشرقین کی دلچسپی جدید مذہبی تحریکات سماجی

[۵] روزگار فقیر ص ۱۳۵ A.J. Arberry, Oriental Essays, p. 241

رجحانات اور اقتصادی امکانات کے مطالعہ کی طرف منتقل ہو چکی ہے، اور فکر اسلامی کی توجیہ اور تعلیل سے زیادہ مسلمان ملکوں کے اندرونی اور بیرونی حالات کے تجزیے کی طرف توجہ ہے، قومیت (Nationalism) کے وہ عناصر جو عربوں کی وحدت ملی کے تصورات کو پارہ پارہ کر سکتے ہیں اب توجہ کا مرکز بن گئے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صیہونیت نے مستشرقین کے انداز تحقیق سے خاموش ساز باز کر لیا ہے۔

شاید تاریخ کے کسی دور میں دیار مغرب کے رہنے والوں کو اسلام سے وہ دلچسپی پیدا نہیں ہوئی جو عصر حاضر کا خاصہ بن کر سامنے آئی ہے، حالات کی اس نئی کروٹ نے مستشرقین کو ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے، ان کا ترکش خالی ہے، اور حالات کچھ اور ہی رنگ اختیار کرتے جا رہے ہیں، اس زمانہ میں مستشرقین نے جو کام اسلام پر کئے ہیں، وہ اسلام سے زیادہ خود ان کے نفسیاتی مطالعہ کے لیئے دلچسپ مواد فراہم کرتے ہیں Area Studies کے تصور کو اقتصادیات، سیاست ارضی Geopolitic اور عمرانیات Psychology سے قریب لا کر دینی عناصر کے مطالعہ سے گریز کیا جا رہا ہے۔

۱۹۶۶ء میں امریکہ میں The Midle East Studies Association of North America قائم ہوئی اور ۱۹۶۰ء میں British Society for Mid-Eastern Studies کا قیام عمل میں آیا، یہ انجمنیں بدلتے ہوئے حالات اور رجحانات کی آئینہ دار ہیں، ان کی مطبوعات اور رسائل سے ان ذہنی خلشوں کا اندازہ ہو جاتا ہے جن سے مستشرقین اس وقت دوچار ہیں، کبھی Hydro Politics of the Nile Valley (John Waterburg- 1979 کی طرف ان کی نظر جاتی ہے، کبھی Islam and Colonialism : The Dictsine of Jihad in Modern History (Rudolph Peters Monton-19 پر غور کرتے ہیں، لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر معلوم ہوتے ہیں کہ اسلامی فکر کا دھارا اب کس رخ بہے گا اور انھیں کہاں کہاں اور کیا کیا بند دھ باندھنے چاہئیں، ایک جدید ترین کتاب Islam and the West کے مصنف Normal Daniel نے مستشرقین کی تصانیف پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ Latin Europe نے اسلام کے خلاف بہت سے غلط نظریات پھیلائے تھے، لیکن اس کی عصبیت اس کو علمی بددیانتی تسلیم کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

یہ ہیں وہ پانچ دور جن میں مستشرقین کی فکر، ان کے مقصد و منہاج، محرکات و محسوسات کی پرورش ہوئی، اور جن کے

زیر اثر ان کی علمی کاوشیں وقت اور حالات کا ساتھ دیتی رہیں۔

مقاصد (۱) افراد کی زندگی میں جو حیثیت حافظہ کی ہے، قوموں کی زندگی میں وہی اہمیت ان کی تاریخ کی ہے، مستشرقین کے پیش نظر سب سے زیادہ اہم مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کا تعلق ان کی حیاتِ اجتماعی کے دینی، تمدنی اور فکری سرچشموں سے منقطع کر دیا جائے تاکہ جب وہ کسی انسانی کمال یا کارنامے کا تصور کریں تو ان کا ذہن مغرب کے سوا کسی دوسری طرف منتقل ہی نہ ہو سکے، بقول مولانا شبلیؒ: "ہم کو صرف یہی رونا نہیں ہے کہ ہمارے زندوں کو یورپ کے زندوں نے مغلوب کر لیا ہے، بلکہ یہ رونا بھی ہے کہ ہمارے مُردوں پر یورپ کے مُردوں نے فتح پائی ہے"[1] اس مقصد کے پیش نظر مسلمانوں کو علمی اعتبار سے ایسے احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے کی کوشش کی گئی جس سے ان کی فکر کے سوتے خشک ہو جائیں، ان کی خودی ختم ہو تو ان کی گردنوں میں برگساں اور ہیگل سے عقیدت کی زنار ڈالی جائے۔

(۲) ایک ایسے دور میں جب کہ اسلامی ممالک میں معرکۂ سائنس و مذہب برپا تھا اور سائنس کی ایجادات نے ایک ذہنی خلش پیدا کر دی تھی، مستشرقین کی جد و جہد کا ایک رخ یہ بھی تھا کہ مسلمان سائنس کی برتری تسلیم کر کے اپنے مذہب سے بیزار ہو جائیں، ان کو اپنا قانون، اپنی شریعت، اپنا طرزِ زندگی سب فرسودہ اور بیکار نظر آنے لگے، مسلم پرسنل لا میں تبدیلی اور اصلاح کا آوازہ سب سے پہلے مستشرقین ہی نے بلند کیا تھا، یورپ میں سائنس اور مذہب کا معرکہ جلدی شروع ہوا، اور جلد ہی ختم بھی ہو گیا، مستشرقین نے مشرق میں اس جنگ کو طول دے دیا تاکہ مسلمانوں کو قدم قدم پر اپنے مذہب کے ناقص ہونے کا احساس ہو اور وہ یہ محسوس کرنے لگیں کہ اسلام اس معرکہ میں ناکام ہو چکا ہے۔

(۳) مسلمانوں کے ذہن کو ایسے مسائل میں الجھا دیا جائے جن کا ان کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو، لیکن جو قوائے ذہنی کو مضمحل کرنے میں کارگر ثابت ہوں، اقبالؔ کی نظم میں ابلیس کا جو مشیر مسلمانوں کو ان گتھیوں کے سلجھانے کی تلقین کرتا ہے:

ابن مریم مرگیا یا زندۂ جاوید ہے	ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم	امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے	تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مُہرے ہوں مات

اس کے پہلو میں مستشرق ہی کا دل دھڑکتا نظر آتا ہے۔

(۴) اسلامی تاریخ کے ایسے گوشوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر زیر بحث لایا جائے جو مسلمانوں میں اتحادِ ملی کے جذبات کو نشو و نما پانے

---

[1] مقالات شبلی ج ۵، ص ۱

سے روک دیں، اس مقصد کے پیشِ نظر مستشرقین نے کتنی ہی عداوتوں کو جو وقت کے ساتھ بے جان ہو چکی تھیں نئی زندگی بخش دی۔

طریقۂ کار (۱) سب سے زیادہ موثر حربہ جو ان مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا گیا، وہ اسلام کے علمی ذخیروں پر قبضہ تھا۔ یورپ کے علمی اداروں، قومی میوزیم اور کتب خانوں میں تاریخ اسلام کے سارے مآخذ جمع کر دیے گئے، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مسلمان اپنی تاریخ کے اخذ کے لئے مستشرقین کے مکمل طور پر دست نگر ہو گئے۔

(۲) ایک پُر فریب معروضی نقطۂ نگاہ نے ان علمی کاوشوں کی حقیقی نوعیت کو نظروں سے پوشیدہ کر دیا، مثلاً جرجی زیدان نے چار جلدوں میں تمدنِ عرب کی تاریخ لکھی جس میں بظاہر مسلمانوں کی مدح سرائی کی، لیکن درپردہ مسلمانوں پر سخت اور متعصبانہ حملے کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی نظر اس کی فریب کاریوں پر نہیں پڑی اور کتاب گھر گھر پھیل گئی۔[1]

(۳) مستشرقین نے بعض نظریات کو جو بنیادی طور پر غلط اور گمراہ کن تھے، اس خود اعتمادی اور بلند آہنگی کے ساتھ پھیلایا کہ خود مسلمانوں کو ان کی صداقت پر یقین آگیا۔

بہ من چنداں گنہ از بد گمانی می کند نسبت   کہ من ہم در گماں افتادہ پندارم گنہگارم

(۴) مستشرقین کا ایک مخصوص طرز استدلال جس کے اثرات تو سب مسلمانانِ عالم محسوس کرتے تھے، لیکن اس کی نفسیاتی مصلحتوں کا احساس بہت کم لوگوں کو تھا، یہ تھا کہ دروغ بیانی اور افتراؤں کے دفتر جب کھولے جائیں تو موقع بموقع ایسے جملے ضرور کہے جائیں جن سے مسلمان پڑھنے والوں کو طیش آجائے اور وہ سکون کے ساتھ ان کے پیدا کئے ہوئے مفسدوں کا جواب نہ دے سکیں، سب سے پہلے مولانا شبلیؒ نے اس طرز استدلال کے نفسیاتی پہلو کو طشت از بام کیا اور لکھا: "خود مجھ پر بھی یہی اثر پڑا ہے، لیکن میں ان حریفوں کو یہ موقع نہ دوں گا کہ وہ میرے طیش و غضب سے فائدہ اٹھائیں۔"[2] سرسیدؒ نے جب میور کی کتاب کو دیکھا تھا تو بقول خود ان کا دل جل کر کباب ہو گیا تھا، لیکن سرسیدؒ یا مولانا شبلیؒ کی طرح جذبات پر قابو پا کر مدلل اور سنجیدہ گفتگو کرنا ہر شخص کے لئے ممکن نہ تھا، چنانچہ بعض لوگوں نے طیش میں آکر مستشرقین کو صرف بُرا بھلا کہا اور اصل مفسدہ اپنی جگہ بدستور باقی رہا، بعض نے ان کے بیانات کو ناقابل اعتنا قرار دے کر خاموشی اختیار کر لی، جن لوگوں نے جواب دینے کی کوشش کی ان کو عذر خواہ حامی "(Apologist)" کہہ کر خود ان کی نظر میں ان کو گرا دیا گیا مستشرقین کے طریقۂ کار کے یہ نہایت موثر حربے تھے جو موقع اور مصلحت سے استعمال کیے جاتے تھے۔

---

[1] مقالات شبلی ج ۳، ص ۱۳۳ [2] مضامین عالمگیر ص ۵۰۔

(۵) مستشرقین کا سب سے زیادہ اہم کارنامہ جس کے ذریعہ اگر ایک طرف اسلامی علوم کے متعلق معاصرین کی معلومات میں حیرت انگیز اضافہ ہوا، تو دوسری طرف مسلمانوں کی علمی اور تحقیقی کاوشوں کا دروازہ نہ صرف بند ہوگیا ہے، بلکہ صدہا ایسی غلط فہمیاں عام ہوگئیں جن کا ازالہ آسان کام نہیں رہا، وہ Encyclopaedia of Islam' Dictionary of Islam' Bibliothe que Oriental Muslim theories of Finance جیسی کتابوں کی اشاعت ہے، ان کتابوں کی ترتیب اور تیاری میں جو علمی کاوشیں کی گئی ہیں، وہ اپنی جگہ مسلم ہیں، اور کوئی دیانت دار مصنف ان کی اہمیت سے کبھی انکار نہیں کر سکے گا، لیکن ان میں جن نظریات اور افکار کو بین الاقوامی علمیت کا ٹھپا لگا کر رواج دے دیا گیا ہے، ان کی تردید و اصلاح کے لئے بڑا علمی تبحر اور اس سے زیادہ محنت و جانفشانی درکار ہے، نتیجہ ظاہر ہے، اسلام کے فقہی، تمدنی، سیاسی تمام مسائل پر ان تصانیف کو حرف آخر کا درجہ دے دیا گیا ہے، مولانا سید سلیمان ندوی نے اس صورت حال کے خلاف آواز اٹھائی اور انڈین ہسٹری کانگریس کے اجلاس منعقدہ مدراس (۱۹۴۴ء) میں کہا: "یہ دیکھ کر تعجب اور افسوس ہوتا ہے کہ بعض تاریخی تحقیقات میں اسلامی شریعت کی وضاحت انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی مدد سے کی جاتی ہے، اسلامی فقہ کے نکتے میکڈانلڈ کی کتاب کے ذریعہ بتائے جاتے ہیں، اسلامی مسائل کا حل ریورنڈ میوز کی ڈکشنری آف اسلام سے پیش کیا جاتا ہے، مسلمانوں کی حکومت، بادشاہی اور مالیات کے نظریے آرنلڈ، اگناڈیز کی عینک سے دیکھے جاتے ہیں، ہم تحقیق کے نام سے اپنے پیشروؤں کی غلطی کی غلط پیروی میں مصروف ہیں[1]۔"

(۶) مشرقی علوم بالخصوص اسلام کے مطالعہ کے لئے یورپ کی یونیورسٹیوں میں جو شعبے قائم کیے گیے وہاں مسلمان طلبہ کثیر تعداد میں استفادہ کے لئے جمع ہوئے، یہ طلبہ بعد کو اپنے ملکوں کے اداروں کے سربراہ بنے، مستشرقین کی مقبولیت بڑھانے میں ان طلبہ کا خاص حصہ تھا، ان پر مغربی استادوں کی تعلیم کا ایسا جادو تھا کہ "آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم" کی کیفیت ان پر طاری رہتی تھی اور جن خیالات کی اشاعت خود مستشرقین کے لئے شاید ممکن نہ ہوتی، وہ ان طلبہ کے ذریعہ بہت آسان بلکہ موثر ہوگئی، اگر انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل کے اسلامی ملکوں کے علمی اداروں اور ان پر مستشرقین کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان شاگردوں کے ذریعہ مستشرقین کس طرح اسلامی دنیا کے پورے علمی افق پر چھا گئے تھے۔

(۷) ان شاگردوں کی فکر کو مسلسل اپنے نظریات اور تحقیقات کے حصار میں رکھنے کا کام ان استادوں نے انجمنوں،

---

[1] مقالات سلیمان حصہ اول، ص ۳۸۲،

کانفرنسوں اور رسالوں سے لیا، ۱۷۸۰ء میں سب سے پہلی ایشاٹک سوسائٹی قائم ہوئی، ۱۷۸۴ء میں سر ولیم جونس نے ایشاٹک سوسائٹی قائم کی، ۱۸۲۲ء میں پیرس ایشاٹک سوسائٹی وجود میں آئی، ۱۸۲۳ء میں رائل ایشاٹک سوسائٹی اور ۱۸۴۲ء میں امریکن اورنٹیل سوسائٹی کی بنیاد رکھی گئی ان کی کوشش یہی تھی کہ مسلمانوں کی فکر میں کوئی خلا ایسا نہ رہنے دیا جائے جسکو وہ اپنے ہی تحقیقی کام سے پُر کریں۔

پھر بعض کانفرنسیں ترتیب دی گئیں جن کے مقاصد بظاہر علمی تھے، لیکن جن کے ذریعہ مختلف ملکوں کی وزارت خارجہ کی پالیسیاں بروئے کار لائی جاتی تھیں، بے شمار جریدوں کی اشاعت نے مستشرقین کا علمی رابطہ پوری علمی دنیا سے قائم رکھا نا انصافی ہوگی اگر اس سلسلہ میں مستشرقین کی کوششوں کو خراج تحسین ادا نہ کیا جائے، لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ ان تمام کوششوں کی باگ ڈور دفاتر خارجہ کے ہاتھ میں تھی، اور ان سے بہت سے دوسرے مقاصد بھی حاصل کیے جاتے تھے، مولانا شبلیؒ نے مارگولیتھ کے ذکر میں بڑی صحیح بات لکھی ہے کہ، "تعصب کی ایک چنگاری سیکڑوں خرمن معلومات کو جلانے کے لئے کافی ہے[1]"

مستشرقین اپنے علم کے سہارے اسلامی تہذیب کی روح تک پہونچنے میں تو شاذ و نادر ہی کامیاب ہوئے لیکن ان کی متعصبانہ تیز نگاہی نے اس کی روح کو مجروح کرنے کا سامانِ ضرر مہیا کر دیا۔

ہندوستان میں ردعمل ہندوستان میں مستشرقین کے طریقۂ کار اور انداز فکر کے خلاف علی گڑھ، دیوبند، ندوۃ العلماء تینوں نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں آواز اٹھائی، عجیب اتفاق تھا کہ سب سے پہلا ٹکراؤ اس شخص سے ہوا جو ہندوستان میں مغربی علوم کا سب سے بڑا داعی تھا، جب ولیم میور کی کتاب سیرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر شائع ہوئی تو اس کی مفسدہ پردازی اور دروغ گوئی پر سر سیدؒ تڑپ اٹھے، ان کا ردعمل ہندوستان کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے، انھوں نے لندن میں خطبات احمدیہ تیار کیے اور میور کے ایک ایک اعتراض کا نہایت دندان شکن جواب دیا، سرسید کا آخری مضمون جو انھوں نے وفات سے چند دن قبل لکھا تھا ازواج مطہرات سے متعلق تھا[2] جس میں مستشرقین کے مفسدانہ خیالات کی قلعی کھولی گئی ہے، مولانا عبدالحلیم شرر کا بیان ہے کہ سر سیدؒ کے پاس ایسے مسلمان طلبہ کے خطوط تھے جنھوں نے لکھا تھا کہ اگر یہ خطبات ان کو نہ ملتے تو وہ مذہب اسلام چھوڑ بیٹھتے، سر سیدؒ ان خطوط کو اپنے لئے سرمایۂ آخرت سمجھتے تھے[3]۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سر سید یورپ کی تقلید میں پیش پیش تھے، لیکن انھوں نے مستشرقین کے خلاف آواز اٹھانے میں بے پناہ عزم، غیر معمولی جرأت اور حیرت انگیز علمی تبحر

---

[1] سیرۃ النبی ج ۱، ص ۷۔ [2] محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج میگزین اور انسٹیٹیوٹ گزٹ، اپریل ۱۸۹۸ء [3] سرسید کی دینی برکتیں، ص ۹

کا ثبوت دیا، اور خود مستشرقین کے وضع کیے ہوئے ہتھیار ان کے خلاف استعمال کیے۔

ہندوستان میں مستشرقین کے پیدا کئے ہوئے اثرات کے خلاف جن علماء نے پیہم جدوجہد کی ان میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا شبلی، مولانا محمد علی مونگیری، ڈاکٹر محمد اقبال اور سید امیر علی کے نام تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہنگے۔ ہندوستان میں مشنری اور مستشرق کی سازش نے نازک صورت حال پیدا کردی تھی، میور نے خود لکھا ہے کہ اس نے اپنی کتاب پادری فنڈر کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے لکھی تھی، مولانا کیرانوی اور مولانا مونگیری نے مشنریوں اور مستشرقین کے اس اتحادِ عمل کا مقابلہ کیا اور بڑی ہمت اور استقلال سے بہت سے فتنوں کا سدِّباب کیا، مولانا کیرانوی کی کتابیں ازالۃ الاوہام، ازالۃ الشکوک، احسن الحدیث، اظہار حق، فرانسیسی، انگریزی، جرمن اور ترکی زبانوں میں ترجمہ ہوچکی ہیں، مولانا مونگیری کی کتابوں پیغام محمدی، ساطع البرہان، برہان قاطعہ وغیرہ نے مشنریوں اور مستشرقوں کی سازش کو ناکام بنایا۔

مولانا شبلی مدت العمر مستشرقین کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں سے برسرپیکار رہے، قرآن کے عدیم الصحۃ ہونے کا دعویٰ جب لندن ٹائمس میں کیا گیا تو مولانا شبلی نے اس پر زور تنقید کرتے ہوئے کہا: "ہم بتادیں گے کہ قرآن مجید ہزاروں دلائل سے بھی انجیل نہیں بن سکتا"[۱] اس ایک جملہ میں اس ذہنی کاوش کا پورا پس منظر سمٹ آیا ہے، جو مستشرقین کی ان کوششوں کا محرک تھا، پادری بروچلی نے تعدادِ ازدواج پر اعتراض کیے تو مولانا شبلی کا قلم حرکت میں آیا، جرجی زیدان کی کتاب تمدن اسلام کی پردہ دری کا کام بھی مولانا شبلی ہی نے انجام دیا[۲]۔ آرمینیا کے جھگڑوں میں مستشرقین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسلام میں عیسائی رعایا کے ساتھ ماضی میں شدید مظالم ہوچکے ہیں اور اسلام میں یہ ظلم جائز، بلکہ ضروری قرار دیا گیا ہے، مولانا شبلی نے حقوق الذمیین اور الجزیہ لکھ کر ان الزام تراشیوں کو بے اثر کردیا، جب سیرۃ النبی پر قلم اٹھایا تو سب سے پہلے مستشرقین کے پیدا کیے ہوئے اثرات کا جائزہ لیا، اسی مقصد کے پیش نظر مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۱۱ء میں الندوہ میں ایک طویل سلسلۂ مضامین شائع کیا، جن میں مستشرقین کے کام کا جائزہ لیا گیا ہے[۳]۔

ڈاکٹر اقبال نے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن مستشرقین کے افکار اور انداز تحقیق کا گہرا مطالعہ کیا، انھوں نے مسلم نوجوان سے جس کی آنکھیں مغرب اور مستشرق دونوں سے خیرہ ہورہی تھیں، خاموشی سے کہا ؎

معلوم ہیں مجھکو ترے احوال کہ میں بھی مدت ہوئی گذرا تھا اسی راہ گذر سے

---

[۱] مقالات شبلی ج ۱، ص ۴۰-۴۶ [۲] ایضاً ج ۴، ص ۱۳۳ [۳] الندوہ، جولائی ۱۹۱۱ء (۱۸-۲۹) اگست (۲۰-۲۶) نومبر (۱۵-۲۲) وغیرہ۔

اور پھر اس کی خودی اور خود اعتمادی کے گرے ہوئے مینارے اور ٹوٹے ہوئے حصار کی تعمیر میں لگ گئے، اقبال نے مستشرقین کی علمی برتری کا طلسم توڑا، ان کے پُر فریب معروضی نقطۂ نگاہ کو بے نقاب کیا، مسلمانوں کو خود اعتمادی کا بھولا ہوا سبق پڑھایا اور بتایا کہ جدید سائنس مغربی الاصل نہیں ہے، اس کی ابتدا مسلمانوں سے ہوئی ہے، یورپ نے اس کو روحِ انسانی کے کچلنے کے لیے استعمال کیا، مسلمانوں کو مغربی علوم کے سلسلہ میں "بولہب را حیدر کرار کن" پر عمل کرنا چاہئے، اقبال نے مسلمانوں کی نئی نسل کو اس ذہنی غلامی اور احساسِ کمتری سے نجات دلائی جو مستشرقین کی پیدا کی ہوئی تھی اور جس نے مسلمانوں کی فکر کے سوتے خشک کر دیے تھے، انھوں نے اپنے خطبات میں جس طرح مسلمانوں کی مذہبی فکر کی تشکیل جدید کا سوال اٹھایا ہے اور جس طرح علوم مغربی اور مستشرقین کے احساس برتری کو بے جان کر دیا ہے، وہ تاریخ اسلام میں یادگار رہے گا۔

کام کا اعتراف مستشرقین کی سرگرمیوں کی یہ روداد بیان کرنے کے بعد ضروری ہے کہ "ہنرش نیز بگو" کے تحت ان کی خدمات کا اعتراف بھی کھلے دل سے کیا جائے، علوم اسلامی پر کام کرنے میں انھوں نے جس بے پناہ لگن، غیر معمولی انہماک اور مسلسل جدوجہد کا ثبوت دیا اور اپنی پوری پوری زندگیاں مختلف اسلامی علوم وفنون کے مطالعہ اور تحقیق میں بسر کر دیں اس کو نظر انداز کرنا حق اور دیانت کے خلاف ہوگا، مولانا ابو الکلام آزادؔ نے مستشرقین کے احسان کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا:

"تاریخ و ادب کی وہ بے بہا کتابیں جن کے الگ کر دینے کے بعد عربی اور مسلمانوں کا کچکول خالی ہو جاتا ہے، صرف یورپ کی سرپرستی سے آج دنیا میں نظر آرہی ہیں۔" مولانا شبلیؒ نے طبقات ابن سعد، مناقب عمر ابن عبد العزیزؓ، تجارب الامم وغیرہ کی اشاعت پر مستشرقین کو مبارکباد دی تھی۔ اور ان کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کیا تھا۔ تاریخ، جغرافیہ، لغت، طب، فلسفہ، ادب پر قدیم مسلمان علماء نے جو بیش بہا علمی کام کیے تھے ان کو مستشرقین کے ذوق نے تباہی سے بچایا اور علمی حلقوں تک پہونچایا۔

نکلسن کے متعلق اربری (Arberry) نے ایک بار بتایا تھا کہ مثنوی کا رات دن مطالعہ کرتے کرتے اس کی بینائی جاتی رہی تھی، مارگولیتھ کے متعلق مولانا شبلیؒ نے سیرۃ النبیؐ میں لکھا ہے: "اس نے، مسند امام ابن حنبل کی چھ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے، اور ہم دعوی سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہمسری کا دعوی نہیں ہو سکتا۔"[۵]

گولڈ زیہر اور وین سنگ (Wensinck) نے احادیث کی ترتیب کی طرف توجہ کی تو حدیث کے سارے

---

[۵] سیرۃ النبیؐ ج ۱، ص ۶۹۔

Goldziher

ذخیروں کو کھنگال ڈالا، حقیقت یہ ہے کہ نکلسن، میسی نیون، اربیری، گب وغیرہ کی پُرخلوص علمی کاوشوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، مستشرقین کی اس لگن اور انہماک کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تاریخ اور تمدن کے سارے ماخذ ان کے قابو میں آگئے، D.K.Niebuhr کا واقعہ اس سلسلہ میں بڑا سبق آموز ہے، اس نے عرب ممالک میں کچھ قدیم کتبات دریافت کیے، تو وہاں کا کوئی عالم ان کو نہ سمجھ سکا، جب ان کتبات کی نقلیں جرمنی میں Reiske کو بھیجی گئیں تو واپسی ڈاک جواب مل گیا، علمی اعتبار سے قطع نظر اگر محض جذبہ اور ادراک کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اندازہ ہو گا کہ مسلسل اسلام کے مطالعہ نے ان کی زندگی کو کس حد تک متاثر کیا تھا، میسی نیون جب سورۂ کہف پڑھتا تو اس کے چہرے پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی، گوئٹے Goethe قرآن پاک کے متعلق کہا کرتا تھا: "جب میں یہ کتاب پڑھتا ہوں تو میری روح میرے جسم میں کانپنے لگتی ہے"[1] انامری شمل کی تصوف اسلام میں غیر معمولی دلچسپی جذبات و احساسات کی گہرائی کی غمازی، ایک بار ولی اللہ دہلویؒ کی تحریر دیکھ کر ان کے چہرے کی جو رنگت ہوئی اور جس طرح "برکت" کے خیال سے انھوں نے تحریر پر انگلیاں پھیرنی شروع کر دیں اس سے ان کی قلبی کیفیات کا اندازہ ہوتا تھا، بعض اوقات جب مستشرقین کی تنقید میں حد سے زیادہ گرمجوشی دکھائی جاتی ہے تو بے اختیار خسرو کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے، جو انھوں نے اپنے زمانہ کے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

اے کہ طعنہ زدی بہ ہندو بری ۔۔۔ ہم آموز از وے پرستش گری

راہ عمل یہ ساری گفتگو بے معنی رہے گی اگر اس سوال پر غور نہ کیا جائے کہ آئندہ کے لئے راہ عمل کیا ہونی چاہئے؟ محض مستشرقین کی تنقید کو مقصد بنا لینا یا ان کی علمی بد دیانتیوں پر نوحہ کرتے رہنا قوائے ذہنی کے اضمحلال کی نشانی ہے

(۱) سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ علوم اسلامی پر تحقیق کے نہایت اعلیٰ مرکز قائم کئے جائیں، اور دنیا کے ہر گوشے سے جدید سائنسی سہولتوں کو کام میں لا کر اسلامی علوم و فنون کے تمام ماخذ ان مرکزوں میں جمع کر دے جائیں، اس منصوبہ کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ ہر ملک پہلے خود اپنے علمی سرمایہ کا جائزہ لے اور جس طرح مولانا سید عبدالحی مرحوم نے الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند میں ہندوستان کے علمی سرمایہ کا جائزہ لیا ہے، اسی طرح کے کام ہر ملک میں شروع کیے جائیں، بروکلمان اور اسٹوری کی کوششیں چراغ راہ کا کام دے سکتی ہیں، لیکن منزل نہیں بن سکتیں، ماخذ کے سلسلہ میں یورپ کی محتاجی ختم ہونے کے بعد خود اعتمادی کا جو دور شروع ہو گا وہ علمی جد و جہد میں نئی توانائی پیدا کر دے گا۔

---

[1] روزگار فقیر، ص ۲۲

(۲) گو یورپ نے اب تک حدیث، فقہ، تاریخ، ادب، جغرافیہ وغیرہ کے لاتعداد ماخذ شائع کیے ہیں، لیکن ابھی عربی فارسی، ترکی زبانوں میں اسلامی تاریخ کے ایسے منابع موجود ہیں جن کی اشاعت سے تحقیق کی گذرگاہیں روشن ہو سکتی ہیں، اس کام کو بلا تاخیر شروع کر دینا چاہیے۔

(۳) اسلامی تاریخ، مذہب اور تمدن کے متعلق ایسی Encyclopaedia تیار کی جانی چاہئیں جن کی معلومات معتبر اور نقطۂ نگاہ معروضی ہو، اور جن سے ان تمام غلط نظریات کی اصلاح ہو سکے جو مختلف طریقوں سے پھیلائے گئے ہیں۔

جب انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے دوسرے ایڈیشن کا کام شروع ہوا تھا تو کچھ مسلمان فاضلوں نے اس کو یہودی مستشرقین کی منظم سازش سے تعبیر کیا تھا، لیکن وہ کام اپنی تکمیل کو پہونچنے والا ہے، اور مسلمان اپنی کوئی اسکیم اب تک بروئے کار نہ لا سکے اس سے بھی بڑھکر افسوس کی بات یہ ہے کہ بعض مسلمان ممالک اسی انسائیکلوپیڈیا کو اپنی اپنی زبانوں میں منتقل کر کے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ انھوں نے فرض کفایہ ادا کر دیا ہے، حال ہی میں مرسی الائیڈ کی نگرانی میں ایک بڑا منصوبہ جو [۳]۱۶ جلدوں میں انسائیکلوپیڈیا آف ریجن تیار کرنے کا بنایا گیا ہے، کیا مسلمانوں کے لئے اس طرح کے منصوبے تیار کرنے اور بروئے کار لانے کا وقت ابھی نہیں آیا؟ ڈاکٹر ذکی ولیدی طوغان نے مستشرقین کے غلط افکار و نظریات کی اصلاح کے لئے ترکوں کی تاریخ اور تمدن پر ایک بسیط کام کا خاکہ تیار کیا تھا، لیکن ڈاکٹر طوغان کی وفات کے بعد معلوم نہیں اس منصوبے کا کیا حشر ہوا، ایران نے Encyclopaedia Persica کا منصوبہ تیار کیا ہے اور ہر چند کہ احسان یار شاطر کی نگرانی میں یہ کام ہو رہا ہے، لیکن حقیقی باگ ڈور امریکی مستشرقین ہی کے ہاتھ میں ہے، اس جسارت کا مقصد غلط نہ سمجھا جائے تو ان Encyclopa سے اپنے ذاتی تعلق اور معلومات کی بنا پر عرض کروں کہ جو عزم، لگن، جذبہ اور عالمانہ تیز نگاہی ان مستشرقین میں نظر آتی ہے، اس کا عشر عشیر بھی مسلمان فاضلوں میں نظر نہیں آتا۔

آج سائنس کے انقلابی انکشافات اور ترقیوں نے زمان و مکان کی پہنائیاں ختم کر دی ہیں، اور فکر و نظر کے نئے سانچے وجود میں آ رہے ہیں، بعض کام جدید سائنسی نظریات اور تجربات سے باخبر ہوئے بغیر انجام نہیں دیے جا سکتے، اقبال نے صحیح کہا تھا: "اسلامی ثقافت کے مورخ کی مشکل زیادہ تر اس سبب سے ہے کہ عربی کے ایسے علماء تقریباً مفقود ہیں جو سائنس کے مخصوص شعبہ جات کے تربیت یافتہ ہوں"[۵]۔ اس لئے ضروری ہے کہ قدیم اور جدید علوم کے ماہرین ایک جگہ جمع ہوں اور اس کمی کو پورا

---

[۵] روزگار فقیر۔

Prof. Mircee Eliade Encyclopaedia of Religion

Encyclopaedias

کریں، ہر عہد ایک نئے علم کلام کا مطالبہ کرتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دور میں جب کہ انسان وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَ النَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ (اور اس نے تمہارے لئے رات اور دن اور سورج اور چاند کو مسخر کیا) رکی منشائے الٰہی کو پورا کرتا ہوا نظر آرہا ہے، نیا علم کلام سائنس کو نظر انداز نہیں کرے گا، ایک زمانہ تھا جب مسلمان مفکرین اور علماء نے (جن میں سرسید کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، مذہب کو سائنس کے نظریات کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی تھی، پھر ایک دور آیا جب مولانا ابو الکلام آزاد نے اعلان کیا کہ سائنس اور مذہب کی راہیں مختلف ہیں اور مذہب کو سائنس کے مطابق ثابت کرنا غیر ضروری ہے، لیکن آج وہ زمانہ آیا ہے کہ سائنس خود پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ میں مذہب کے بنیادی نظریات کی تائید کرتی ہوں، وقت اور حالات کا یہ انقلاب عظیم الشان ہے، ضرورت ہے کہ اس سے پوری طرح فائدہ اٹھایا جائے، اگر اس بنیادی ضرورت سے بے اعتنائی برتی گئی تو ہماری کوششوں کا حال یہ ہوگا کہ ع خوب است و خوش است و بو ندارد

بعض دینی علوم کا نئے انداز سے مطالعہ ضروری ہوگیا ہے۔ قرآن کے Semantic مطالعہ کو Izutsu کے ہاتھ سے لے کر آگے بڑھانا چاہئے اور حدیث کے مطالعہ میں اور کے خطوط پر تحقیق و ترتیب کی نئی راہیں تلاش کرنی چاہئیں، علماء اسلام نے علوم قرآن اور علم حدیث سے متعلق جو کام کیے ہیں وہ بلاشبہ مہتم بالشان ہیں، لیکن ضرورت ہے کہ ان کو آگے بڑھایا جائے، وقت کا ایک اور اہم تقاضا یہ ہے کہ فقہ اسلامی کی کتابوں کی ترتیب موجودہ دور کی ضروریات اور مزاج کے مطابق ہو تاکہ اسلامی نظام حیات کے افادی پہلو سامنے آسکیں، آج جب کہ یورپ اور امریکہ میں اسلام سے بہ حیثیت دین غیر معمولی دلچسپی کا اظہار عوام میں ہو رہا ہے، اس کام کی ضرورت اور بڑھ گئی ہے، اس طرح نہ صرف میکڈانلڈ، شاخت، اینڈرسن وغیرہ کے نظریات کی اصلاح ممکن ہو جائے گی بلکہ اسلام کے نظام حیات اور اسرار دین کے متعلق سوچنے کے نئے پہلو بھی آشکارا ہو جائیں گے، ڈاکٹر اقبال کی دور بین نگاہ نے اس کام کی اہمیت اور ضرورت کا اندازہ آج سے پینسٹھ سال قبل لگا لیا تھا اور وہ خود مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی مدد سے فقہ اسلامی کو عصر حاضر کے مذاق کے مطابق پیش کرنا چاہتے تھے، اس کام کو اب اور زیادہ ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔

اس ساری جدوجہد میں آب و رنگ اسی وقت پیدا ہوگا جب علمی جذبہ سے سرشار مسلمان علماء اور فضلاء علم کو اپنی کھوئی ہوئی میراث سمجھ کر اس کام کی طرف متوجہ ہوں گے اور اپنے خون جگر سے اس کے خاکے میں رنگ بھریں گے، فاضل محترم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے صحیح لکھا ہے کہ وقت کا تقاضا ہے کہ مسلمان علماء ایسی تصانیف تیار کریں جو اپنی تحقیقات کی اصلیت

Goldziher Wensinck

(Originality) مطالعہ کی وسعت، نظر کی گہرائی، ماخذ کے استناد و صحت اور محکم استدلال میں، مستشرقین کی کتابوں سے کہیں فائق اور ممتاز ہوں۔"[۵]

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن   قدم اٹھا! یہ مقام انتہائے راہ نہیں

---

[۵] اسلام اور مستشرقین، ص ۲۷

مستشرقین اور علوم اسلامیہ

از

شیخ نذیر حسین، مدیر اردو دائرۂ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

یورپ اور عالم اسلام کے باہمی تعلقات صدیوں سے قائم ہیں، یہ تعلقات شروع میں خالص تجارتی، دینی اور علمی تھے، بیت المقدس عیسائیوں کا دینی اور روحانی مرکز ہے، اس لیے فلسطین جانے والے عیسائی زائرین کی رہنمائی کے مختلف اوقات میں ہدایت نامے، سفرنامے اور عربی بول چال کی کتابیں لاطینی رسم الخط میں لکھی گئیں، صلیبی جنگوں کے زمانے میں ایک دوسرے کے علوم و فنون سے متعارف ہونے کے مزید مواقع پیدا ہوئے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں اندلس ہی تعلیم و تدریس کا مرکز تھا، لہٰذا اطالوی اور فرانسیسی طلبہ اشبیلیہ اور قرطبہ کا رخ کیا کرتے تھے، ان کے طفیل کندی، فارابی، ابن سینا اور ابن رشد کی بہت سی کتابیں لاطینی زبان میں منتقل ہوئیں، یورپ میں ویٹیکن پاپائے روم کا صدر مقام اور عیسائیت کی تعلیم و تدریس کا بڑا مرکز ہے، یہاں کے فارغ التحصیل دینی مناصب پاتے تھے اور اپنے اپنے ملکوں میں جا کر تعلیم و تعلم کا فریضہ انجام دیتے تھے، یہ طلبہ عربی زبان سے بھی بقدر ضرورت واقف ہوتے تھے۔

عبرانی اور عربی زبانوں کی تحصیل کی طرف رغبت اور شوق کا ایک بڑا سبب کتاب مقدس کا علمی و تحقیقی مطالعہ تھا، چنانچہ سولہویں صدی عیسوی میں تورات کے ترجمے مختلف یورپی ممالک میں شائع ہوئے جن کی اصل عبرانی اور عربی تھی، کتاب مقدس کے تراجم میں لبنان کے عیسائی فضلاء کی علمی معاونت بھی شامل تھی، لبنان کے مارونی عیسائیوں کے پاپائے روم سے صدیوں سے تعلقات چلے آتے ہیں۔

مشرقی بالخصوص اسلامی زبانوں کی ترویج و اشاعت کا دوسرا بڑا محرک یورپی استعمار تھا، انیسویں صدی عیسوی میں فرانس نے الجزائر، مراکش اور تونس پر قبضہ کر لیا، برطانیہ نے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کر لی، ولندیزیوں نے انڈونیشیا پر قبضہ جما لیا، روس نے ترکستان کو غصب کر لیا، اطالیہ نے طرابلس کو ہتھیا لیا اور برطانیہ نے مصر پر اپنی سیادت قائم کر لی، پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر برطانیہ نے عراق اور فلسطین اور فرانس نے شام اور لبنان پر انتداب قائم کر لیا۔

ان مفتوحہ اور زیرِ حمایت ممالک کے علوم وآداب اور رسوم ورواج سے واقفیت پیدا کرنے کے لئے متعدد ادارے وجود میں آئے، ابتدا میں ان اداروں میں کام کرنے والے زیادہ تر اہلِ کلیسا تھے، جو دینی عصبیت سے محفوظ نہ تھے، ان کے بعد بہت سے حقیقی عالم بھی پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی زندگیاں علومِ اسلامیہ کی تحقیق واشاعت میں صرف کر دیں، انھیں اسلام اور مسلمانوں سے کوئی خاص عناد یا بغض نہ تھا، ان میں سے ہر یورپی ملک کے شیدائیانِ علم اور ان کے علمی کاموں کا سطورِ ذیل میں تعارف کرایا جاتا ہے:

اطالیہ جامعۂ روما میں علوم عربیہ کا شعبہ ۱۳۳۲ء سے قائم ہے، اطالیہ کے دوسرے شہروں میں بھی علوم عربیہ کی تدریس وتحقیق کا انتظام ہے، ان میں پاپائے روم کا مدرسۂ لغات مشرقیہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس میں سریانی، عبرانی، آرامی اور عربی زبانوں کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے، یہاں قلمی کتابیں بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں، یورپ میں سب سے پہلے اطالیہ کے مختلف شہروں سے عربی کتب کی اشاعت کا آغاز ہوا، چنانچہ ابن سینا کا القانون فی الطب ۱۴۷۳ء میں میلان سے شائع ہوا، ابن رشد کی شروحِ مؤلفاتِ ارسطو بارہ جلدوں میں ۱۵۶۰ء میں شائع ہوئی، اس کے بعد بہت سے تراجم شائع ہوئے انیسویں صدی عیسوی اطالیہ میں عربی زبان کے علوم وفنون کا زریں دور ہے، اس زمانہ میں بہت سے نامور علمائے مشرقیات پیدا ہوئے، جن میں مندرجۂ ذیل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:

امیر کایتانی (۱۸۶۹ء، ۱۹۲۶ء) اطالیہ کا مشہور فاضل اور امیر کبیر تھا، جس نے اپنی دولت عربی مخطوطات کے جمع کرنے میں صرف کر دی، اس کی زندگی کا سرمایہ تاریخ اسلام کی تالیف ہے، جس میں سنہ وار واقعات ۹۲۲ھ و ۵۱ھ تک مذکور ہیں، اس کی صرف پانچ جلدیں جو ۱۳۲۲ھ تک محیط ہیں چھپ چکی ہیں، اس کا دوسرا سرمایہ عمر شخصیات العالم الاسلامی (علمائے اسلام کے تراجم، ان کے مؤلفات اور مصادر کا ذکر) ہے، جس کی دو جلدیں ۱۹۱۵ء میں شائع ہو سکیں بقایا کام ان کی موت کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا، ان کا جمع کردہ کتب خانہ مخطوطات عربیہ کا بیش قیمت خزانہ ہے۔

اغناطوس گدی (۱۸۴۴ء، ۱۹۳۵ء) جامعۂ مصریہ میں عربی زبان وادب، تاریخ وجغرافیہ کا استاذ تھا اور فصیح عربی زبان میں درس دیا کرتا تھا، کتاب الاغانی کی فہارس اس کی علمی یادگار ہے۔

کارلو نیلینو (۱۸۷۲ء تا ۱۹۳۸ء) عربی بے تکلف لکھتا اور بولتا تھا، اور جامعہ مصریہ میں علم الفلک کا درس دیا کرتا تھا، "تاریخ علم الفلک عند العرب" اس کی مشہور کتاب ہے۔

بوسانی (المولود ۱۹۲۱ء) نے قرآن پاک کا اطالوی زبان میں ترجمہ کیا ہے، اسے اردو اور فارسی سے زیادہ شغف تھا، محمد اقبال، دانتے و اقبال اس کی تصانیف ہیں، الشرق الحدیث (Orient Moderno) اطالیہ کا مشہور علمی و تحقیقی رسالہ ہے۔

فرانس اہل فرانس اور عالم عرب کے درمیان تجارتی اور ثقافتی تعلقات صدیوں سے قائم ہیں، صلیبی جنگوں، تجارتی سرگرمیوں، سفیروں کے تبادلے اور شمالی افریقہ اور شام و لبنان میں فرانسیسی اثر و نفوذ نے ان تعلقات کو مستحکم کرنے میں بڑی مدد کی ہے، فرانسیسیوں نے عربی علوم و فنون، اندلس اور صقلیہ (سسلی) کے مدارس سے حاصل کیے، ۱۲۸۵ء میں علوم مشرقیہ کی تدریس کے لیے ایک درسگاہ قائم کی گئی، چودھویں صدی عیسوی میں جامعۂ پیرس میں شعبۂ عربی کا قیام عمل میں لایا گیا جو کہ سوربون کے عربی شعبہ کی شاخ تھی، اس کے بعد فرانس کی بیشتر جامعات میں عربی زبان و ادب اور علوم اسلامیہ کی تدریس کا اہتمام ہوا، ۱۶۹۱ء میں عربی ٹائپ کا پریس قائم ہوا، فرانسیسی سیاحوں نے شام اور مصر کا سفر کرکے متعدد سفرنامے لکھے۔

فرانسیسی علمائے مشرقیات میں بیرن دی ساسی (۱۷۵۸ء تا ۱۸۳۸ء) استاذ الاساتذہ کا درجہ رکھتا ہے، اس کا نمایاں علمی کارنامہ مقامات حریری (متن و ترجمہ) کی اشاعت ہے، اس کے بعد کاترمیر (۱۷۸۲ء تا ۱۸۵۲ء) کا نام قابل ذکر ہے جس نے مقدمۂ ابن خلدون تین جلدوں میں شائع کیا۔

بیرن دی سلان (۱۸۰۱ء تا ۱۸۷۸ء) فرانس اور جرمنی کے متعدد علماء و فضلاء کا استاذ اور شیخ المستشرقین تھا، اس کا بڑا کارنامہ مقدمۂ ابن خلدون اور وفیات الاعیان (ابن خلکان) کا انگریزی ترجمہ ہے۔

ہارٹوک دیرنبرغ (۱۸۴۴ء تا ۱۹۰۸ء) نے مکتبہ اسکوریال (اسپین) کے عربی مخطوطات کی فہرست دو جلدوں میں شائع کی، کتاب (سیبویہ) کا متن اور فرانسیسی ترجمہ مفید حواشی کے ساتھ شائع کرایا، تاریخ الفخری کی عمدہ اشاعت بھی اس کا کارنامہ ہے۔

پروفنسال (۱۸۹۴ء، ۱۹۵۶ء) نے اپنی ملازمت کا آغاز جامعۃ الجزائر سے کیا، اسے اندلس اور شمالی افریقہ کی تاریخ اور علوم و آداب سے دلچسپی رہی ہے، بے شمار مقالات کے علاوہ اس کا نمایاں علمی کام جمہرۃ انساب العرب (ابن حزم) کی تصحیح اور اشاعت ہے۔

لوئیں ماسینون (۱۸۸۳ء تا ۱۹۶۲ء) بیسویں صدی کا ممتاز فرانسیسی مستشرق تھا، اس نے ممالک عربیہ

کے متعدد سفر کیے اور علمائے اسلام سے ذاتی تعارف پیدا کیا، اسکی دلچسپی کا مرکز اسلامی تصوف رہا ہے کتاب الطواسین (حلاج) کو پہلے پہل اسی نے شایع کیا۔

لاؤسٹ (المولود ۱۹۰۵ء) کو امام ابن تیمیہؒ کے افکار اور ان کی تصانیف سے بڑی دلچسپی ہے، چارلس پیلا سوربون میں عربی زبان کا استاذ اور مجلہ ارابیکا (Arabica) کا سکریٹری ہے اس نے جاحظ کے متعدد رسائل تصحیح و تعلیق کے ساتھ شایع کیے ہیں، قومی کتب خانہ پیرس میں عربی کی ہزاروں کتابیں ہیں، فرانسیسی زبان میں متعدد علمی وتحقیقی رسائل شائع ہوتے رہے جن کا موضوع عربی زبان و ادب اور عالم اسلامی کے حالات و مسائل ہوتے ہیں

ہالینڈ فرانس کے بعد ہالینڈ عربیات اور اسلامیات کی تدریس کا بڑا مرکز ہے، لائیڈن یونیورسٹی میں عربی زبان کی تعلیم و تدریس کا شعبہ ۱۶۱۳ء سے کام کر رہا ہے، مشہور عالم مطبع بریل کو مستشرق بریل نے ۱۶۸۳ء میں قائم کیا تھا، یہ مطبع پانچ سو سے زائد علوم مشرقیہ کی کتابیں چھاپ کر شائع کر چکا ہے، جن میں نصف عربی زبان میں ہیں، مکتبۃ الجغرافیین العرب کی آٹھ جلدوں میں اشاعت ایک بڑا علمی کارنامہ ہے، الجامع الصحیح للبخاری کا ایک عمدہ ایڈیشن ۱۹۰۸ء میں لائیڈن سے شایع ہوا تھا، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام بھی لائیڈن سے چھپ کر شایع ہو رہا ہے، اس کی جدید اشاعت جس میں مسلم ممالک کے اہل علم کے مقالات بھی شامل ہیں، ہر لحاظ سے مستحق تعریف و تحسین ہے، ہالینڈ کے علمائے مشرقیات نے مختلف ادوار میں علوم اسلامیہ کی بڑی خدمت کی ہے، انمیں سے ممتاز علماء کے نام یہ ہیں:

ڈوزی (۱۸۲۰ء، ۱۸۸۳ء) نے تاریخ اندلس چار جلدوں میں لکھی، تکملۃ معاجم العربیۃ اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے۔

ڈخویہ (۱۸۳۶ء، ۱۹۰۹ء) نے فتوح البلدان (البلاذری) اور الطبری کی تاریخ الرسل والملوک دوسرے علماء کے اشتراک سے شایع کی، اس عظیم الشان کتاب کا انڈکس اور مختلف فہارس علمی کام کرنے والوں کے لئے ایک بڑی نعمت ہیں۔

ونسنک (Wensinck) (۱۸۸۲ء تا ۱۹۳۹ء) المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی کی سات ضخیم جلدوں میں تدوین اور اشاعت اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے، اس کام میں اس کے اور اس کے رفقاء کے تیس برس صرف ہوئے، یہ الفاظ حدیث کا انڈکس ہے جس کی مدد سے ہم بقید الواب ہر حدیث کو اس کے مقام پر تلاش کر سکتے ہیں۔

جرمنی (المانیہ) جرمنی کا عالم اسلام سے تعلق را بطہ دوسری صلیبی جنگ (۱۱۴۷ھ، ۱۱۴۹ھ) سے شروع ہوتا ہے جامعہ

ہائیڈلبرگ میں عربی زبان کا شعبہ چودہویں صدی کے اواخر سے کام کر رہا ہے، اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط تو شہنشاہ فرڈیناں کے عثمانی سلاطین سے سیاسی و تجارتی تعلقات قائم ہوئے، انیسویں صدی کے آغاز میں دی ساسی کے جرمن شاگردوں کے فیض سے علوم اسلامیہ کی اشاعت اور تحقیق میں بڑی ترقی ہوئی، ان میں سے سربرآوردہ علماء کے نام یہ ہیں:

فریتاغ (۱۷۸۸ء تا ۱۸۶۱ء) نے دیوان الحماسہ بشرح التبریزی مع حواشی و فہارس بون سے شایع کیا، عربی، لاطینی لغت بھی اسی کی علمی کاوش کا نتیجہ ہے۔

فلوگل (۱۸۰۲ء تا ۱۸۷۰ء) نے حاجی خلیفہ کی کشف الظنون (متن و لاطینی ترجمہ) تیرہ برس کی محنت شاقہ کے بعد شایع کی، نجوم الفرقان فی اطراف القرآن اس کا دوسرا کارنامہ ہے، یہ الفاظ قرآن کا انڈکس (اشاریہ) ہے۔

فلائیشر (۱۸۰۱ء تا ۱۸۸۸ء) جمعیۃ الشرقیۃ الالمانیہ کا بانی تھا، اس نے تفسیر بیضاوی، المفصل (الزمخشری) اور دوسری کتابیں مفید حواشی کے ساتھ شایع کیں۔

وستنفلٹ (۱۸۰۸ء تا ۱۸۹۹ء) نے ساٹھ برس عربی زبان، اس کے علوم و آداب کی خدمت کی، وفیات الاعیان (ابن خلکان) تہذیب الاسماء (نووی) طبقات الحفاظ (الذہبی) کتاب المعارف (ابن قتیبہ) تاریخ مکہ، سیرت ابن ہشام و معجم البلدان (یاقوت) وغیرہ کی تصحیح اور اشاعت اس کی زندگی کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

آلورٹ (۱۸۲۸ء تا ۱۹۰۹ء) فہرست مکتبہ برلن اس کی فضیلت پر شاہد ہے۔

یان (Jahn) (۱۸۳۶ء تا ۱۹۱۶ء) نے شرح المفصل (ابن یعیش) مفید تعلیقات کے ساتھ شایع کرنے کے علاوہ کتاب (سیبویہ) کا جرمن میں ترجمہ شایع کیا، جو حیرت انگیز کارنامہ ہے۔

زخاؤ (۱۸۴۵ء تا ۱۹۳۰ء) فلائشر کا شاگرد رشید تھا، البیرونی کی تحقیق ما للهند (متن و انگریزی ترجمہ) اور الآثار الباقیۃ (متن و انگریزی ترجمہ) اس کی یادگار ہیں۔

کارل بروکلمان (K. Brockelmann) (۱۸۶۸ء تا ۱۹۵۶ء) امام المستشرقین ہے، اس کا غیر فانی کارنامہ تاریخ الادب العربی کی تالیف ہے (پانچ جلدیں، مطبوعہ لائیڈن) اس کی وسعت معلومات پر ایک طالب علم حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے، عالم عرب کی مطبوعات کے علاوہ امرتسر، دہلی اور بھوپال تک کی چھپی ہوئی کتابیں اس کی دسترس میں ہیں، سارے جہان کے کتب خانوں کی قلمی کتابوں کی فہارس اس کے پیش نظر ہیں، سوانح اور تراجم کی کتابیں اسکی نوک زبان

ہیں، لیکن افسوس کے ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ اس کی تاریخ اسلام (جس کا عربی میں ترجمہ تاریخ الشعوب الاسلامیۃ کے نام سے ہو چکا ہے) اس کے دامنِ فضیلت پر بدنما دھبہ ہے، اس میں جا بجا یورپ کے روایتی مسیحی تعصب کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

فلیشر (۱۸۶۵ء تا ۱۹۳۹ء) نے معجم اللغۃ العربیۃ کی جمع و ترتیب میں چالیس برس گذار دیے، اس عظیم الشان لغت کا مدار قدیم عربی کتبِ لغت پر ہے، الجمع اللغوی (قاہرہ) کے اہتمام میں اس کے چند اجزا شایع ہوئے ہیں،

ہیلوٹ رٹر (H. Ritter) (۱۸۹۲ء تا ۱۹۷۱ء) نے اپنی عمر گراں مایہ کے تیس سال استنبول کے کتبخانوں میں نادر کتابوں کی تلاش میں بسر کر دیے، عربی کتابوں کی اشاعت کے لیے مکتبۂ اسلامیہ استنبول میں قایم کیا جس کے اہتمام میں مقالات الاسلامیین (اشعری) اور اسرار البلاغۃ و عبدالقاہر الجرجانی (متن و جرمن ترجمہ) وغیرہ نہایت آب و تاب سے شایع ہو چکی ہیں، الصفدی کی الوافی بالوفیات عربی میں سوانح و تراجم کا بڑا خزانہ ہے، اس کی سترہ جلدیں رٹر اور اس کے رفقا اور تلامذہ کے طفیل اب تک اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔

فؤاد سیزگین: ایک ترک عالم اور رٹر کا شاگرد رشید ہے، اس نے الجامع الصحیح البخاری کے مصادر و مآخذ پر ترکی زبان میں ایک کتاب لکھی ہے، مجاز القرآن (ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ) کو نہایت محنت سے شایع کیا ہے، کارل بروکلمان کی تاریخ الادب العربی کو نظرثانی اور مفید اضافوں کے ساتھ جرمن زبان میں شایع کیا ہے، اب تک اس جلیل القدر کتاب کی پانچ جلدیں شایع ہو چکی ہیں، جو فاضل مصنف کی فضیلت پر شاہد ہیں، اسے فیصل انعام بھی ملا ہے۔ انعام کی رقم کو اس نے یونیورسٹی میں اسلامی طب کی تاریخ کے مطالعہ کے لئے وقف کر دیا ہے۔

روڈی پیرٹ نے قرآن مجید کا جرمن زبان میں ترجمہ تین جلدوں میں شایع کیا ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ ترجمہ سب جرمن ترجموں میں بہتر اور مستند ہے۔

آخر میں ایک جرمن نژاد مستشرقہ مسز این میری شیمل کا ذکر بھی ضروری ہے۔ موصوفہ کو مولانا روم اور علامہ اقبال کے افکار و اشعار اور پھر خواجہ میر درد کے طریقہ محمدیہ سے بڑا شغف ہے۔ انھوں نے اقبال کے سوانح اور شاعری پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی ہے، جاوید نامہ کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ (۷۱۱ء تا ۱۹۴۷ء) پر ایک کتاب Islam in the Indian Subcontinent کے نام سے لکھی ہے

استنبول کے علمی خزائن سے ہماری واقفیت اور شناسائی تمام تر جرمن مستشرقین کی علمی مساعی کی مرہونِ منت ہے۔ جرمنی کی ہر یونیورسٹی میں عربی اور اسلامی کتب کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے، علوم اسلامیہ پر مباحث اور مقالات کے لئے مجلۃ الاسلام (جرمنی) ہمبرگ اور مجلہ عالم اسلام (لائپزگ) قابل ذکر ہیں، لائپزگ اور ویزبادن کے عربی پریس صحتِ طباعت کے لئے سارے یورپ میں مشہور ہیں۔

آسٹریا ہنگری | آسٹروی مستشرقین کی توجہ زیادہ تر ترکی ادبیات تک محدود رہی ہے، ان میں سربرآوردہ عالم مشرقیات گولڈ تسیہر (۱۸۵۰ء تا ۱۹۲۱ء) تھا، جس نے قاہرہ جاکر مفتی محمد عبدہ سے بھی استفادہ کیا تھا، اس کی تصانیف میں حدیث کے مطالعات کی یورپی حلقوں میں بڑی دھوم رہی ہے، اس کتاب کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

عبدالکریم جرمانوس (۱۸۸۴ء تا ۱۹۷۹ء) نے اپنی زندگی کا آغاز شانتی نکیتن میں استاذ عربی سے کیا (۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۲ء) بعد ازاں انھوں نے جامعہ ملیہ جاکر اسلام قبول کر لیا اور قاہرہ پہنچ کر شیوخ ازہر سے علم کی تکمیل کی، وطن واپس آکر بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں ایک عرصہ تک صدر شعبۂ مشرقیات رہے، ترکی زبان وادب کے متعلق ان کی تحقیقات اہم نتائج کی حامل ہیں، وہ حج سے بھی سرفراز ہوئے تھے۔

روس | روس کی جامعات میں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کی تعلیم وتدریس کا انتظام بڑے عرصہ سے قائم ہے، روسی علماء نے الفارابی، ابن سینا اور البیرونی کی کتابوں کے روسی زبان میں تراجم شایع کیے ہیں، جدید عربی زبان کے ناولوں، ڈراموں اور افسانوں کی بیشتر تعداد روسی زبان میں منتقل ہو چکی ہے۔

علمی تحقیقات کے سلسلہ میں کراتشوفسکی (۱۸۸۳ء تا ۱۹۵۱ء) کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، اس نے شام اور لبنان میں ایک عرصہ تک قیام کرکے وہاں کے ادباء سے ذاتی مراسم پیدا کیے تھے، اس کی تصانیف میں قرآن مجید کا روسی ترجمہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔

کتاب البدیع (ابن المعتز) اس کی تصحیح وتحشیہ سے پہلی دفعہ شایع ہوئی، عرب جغرافیہ نویسوں کے حالات اور کارناموں کے متعلق اس کی کتاب کا عربی میں ترجمہ تاریخ الادب الجغرافی کے نام سے چھپ چکا ہے۔

کسی زمانہ میں قازان کے عربی مطابع ترکستان بھر میں مشہور تھے، لیکن اب عربی کی دینی کتب کی طباعت اور اشاعت حکماً ممنوع ہے، وسط ایشیا کی بعض جامعات نے فارابی، ابن سینا اور البیرونی کی چند کتابیں شایع کی ہیں، ادھر چند سال

سے صرف قرآن پاک کی طباعت سرکاری انتظام میں ہونے لگی ہے

انگلستان | آکسفورڈ اور کیمبرج کی جامعات میں عربی زبان و ادب کے شعبے اٹھارہویں صدی عیسوی سے قایم ہیں لندن میں سکول آف اورنیٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز ۱۹۱۶ء سے کام کر رہا ہے، اور نامور مستشرقین مثلاً سر طامس آرنلڈ اور مسٹر گب اس درسگاہ سے وابستہ رہے ہیں، انگلستان کے معروف مستشرقین اور ان کی علمی خدمات کا تذکرہ سطور ذیل میں درج ہے۔

جارج سیل (۱۶۹۷ء، ۱۷۳۶ء) نے انگریزی زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا، جو غالباً فرانسیسی ترجمہ سے ماخوذ ہے اس کے مقدمہ میں مترجم نے عجیب و غریب خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ایڈورڈ لین (۱۸۰۱ء، ۱۸۷۶ء): مدّ القاموس (عربی، انگریزی لغت) اس کی تیس سالہ کاوش کا نتیجہ ہے، یہ لغت نہایت معتبر اور مستند مانی جاتی ہے، الف لیلہ کا انگریزی ترجمہ (چھ جلدیں) اس کی علمی یادگار ہے۔

ایڈورڈ ہنری پامر (۱۸۴۰ء، ۱۸۸۲ء) عربی نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتا ہے، ترجمہ قرآن کریم اور دیوان البہاء زہیر (متن و انگریزی ترجمہ) اس کا بڑا کارنامہ ہے۔

ولیم رائٹ (۱۸۳۰ء تا ۱۸۸۹ء) نے ڈوزی سے علوم عربیہ کی تکمیل کی تھی، اس کا علمی کارنامہ الکامل (المبرد) کی تین جلدوں میں اشاعت ہے، عربی قواعد پر اس کی انگریزی کتاب نہایت مفید اور جامع ہے۔

سر ولیم میور (۱۸۱۹ء تا ۱۹۰۵ء) سابق گورنر یو۔ پی (اتر پردیش) لائف آف محمدؐ اور تاریخ الخلفاء کا مصنف، یہ دونوں کتابیں متنازع فیہ چلی آرہی ہیں، سر سید نے لائف آف محمدؐ کے جواب میں اپنی مشہور کتاب خطبات احمدیہ لکھی تھی۔

سر چارلس لائل، انڈین سول سروس کا ممبر اور سی۔ پی (مدھیہ پردیش) میں کمشنر تھا، اشعار جاہلیت اس کا خاص موضوع تھا، المفضلیات (الضبی، بشرح الانباری (متن و انگریزی ترجمہ) کی اشاعت اس کی یادگار ہے۔

ایڈورڈ جارج براؤن (۱۸۶۲ء، ۱۹۲۶ء) کیمبرج میں عربی و فارسی کے ممتاز استاذ تھے، تاریخ ادبیات ایران (چار جلدیں) ان کا عظیم الشان کارنامہ ہے، چہار مقالہ (متن و انگریزی ترجمہ) اور لباب الالباب کی اشاعت بھی ان کی علمی کاوش کی مرہون منت ہے۔

سر طامس آرنلڈ (۱۸۶۴ء، ۱۹۳۰ء) علی گڑھ کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر تھے،

۱۹۰۵ء میں لندن یونیورسٹی کے استاذ عربی بن کر واپس چلے گئے۔ شبلیؒ اور اقبال کے علمی ذوق کو پختہ کرنے میں ان کا بڑا دخل ہے۔ ان کی مشہور کتاب پریچنگ آف اسلام (دعوت اسلام) کا اردو، عربی اور ترکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، اخیر زمانے میں ان کی توجہ کا مرکز اسلامی مصوری بن گئی تھی۔

مارگولیتھ (Margoliouth) (مرجلیوث) (۱۸۵۸ء تا ۱۹۴۰ء) آکسفورڈ یونیورسٹی کا نامور عربی فاضل جو بے تکان عربی بولتا اور لکھتا تھا، تفسیر بیضاوی (سورۂ آل عمران) اور رسائل ابی العلاء المعری کا انگریزی ترجمہ اس کا مشہور علمی کارنامہ ہے، معجم الادباء (یاقوت حموی) اور کتاب الانساب (السمعانی) کی اشاعت اس کی علمی کاوش کا نتیجہ ہے، اس کی لائف آف محمد علمی حلقوں میں تنقید اور تردید کا موضوع بنی رہی ہے، اس کی غلط بیانیوں کو دیکھتے ہوئے مولانا شبلی مرحوم کو سیرۃ النبی کی تالیف کا خیال پیدا ہوا تھا۔

رینالڈ نکلسن (۱۸۶۸ء، ۱۹۴۵ء) کیمبرج یونیورسٹی میں عربی و فارسی کے استاد تھے، انھیں تصوف اسلام سے بڑی دلچسپی تھی، منتخبات دیوان شمس تبریز، کشف المحجوب (داتا گنج بخش ہجویریؒ)، اسرار خودی (اقبال) اور مثنوی مولانائے روم کے انگریزی تراجم ان کے قابل ستایش کارنامے ہیں۔

کرنکو (Krenkow) (۱۸۷۲ء تا ۱۹۵۳ء) نسلاً جرمن تھے، لیکن انگریزی قومیت اختیار کرلی تھی، اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے اپنا نام محمد سالم کرنکوی رکھ لیا، جمہرۃ فی اللغۃ (ابن درید) اور تنقیح المناظر (قطب الدین الشیرازی) اور الدرر الکامنۃ (ابن حجر) اور بہت سے عربی دواوین کی اشاعت ان کی زندگی کا بہترین کارنامہ ہے۔

آربری (Arberry) (۱۹۰۵ء، ۱۹۶۵ء) جامعہ مصریہ قاہرہ میں قدیم زبانوں کے استاد تھے، پھر انڈیا آفس لندن میں لائبریرین بن گئے، بعد ازاں کیمبرج یونیورسٹی میں شعبۂ عربی اور فارسی کے استاد مقرر ہوئے، تصوف اسلام سے انھیں بڑا شغف تھا، کتاب التعرف (الکلاباذی) کتاب المواقف کی تصحیح و اشاعت اور قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ ان کی یادگار ہے، نثر فارسی کی تاریخ انگریزی میں لکھی ہے اور حکایات رومی کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

برطانوی مستشرقین میں ہیملٹن گب کا نام بھی ذکر کے قابل ہے، عالم اسلامی کی تحریکات سے انھیں بے حد دلچسپی تھی، عربی زبان کے جدید ادب پر ان کی نظر بڑی گہری اور ناقدانہ تھی

زمانہ حال میں منٹگمری واٹ کی کتابوں نے بڑی شہرت پائی ہے، لیکن وہ دوسرے درجے کا مستشرق ہے اور

اور اُس کی معلومات کا انحصار عربی کتب کے انگریزی و فرانسیسی تراجم پر ہے۔

امریکہ | امریکہ میں استشراق کی تاریخ کی ابتداء انیسویں صدی کے اوائل سے ہوتی ہے، لبنان کے عیسائی فضلاء امریکہ کی یونیورسٹیوں میں علوم عربیہ کا درس دیتے رہے ہیں، ان میں قابل ذکر فلپ خوری ہٹی ہے جس کی ہسٹری آف عربز (عربوں کی تاریخ) مقبول عام کتاب ہے، اس نے لبنان اور شام کی تاریخ بھی انگریزی میں لکھی ہے۔

جارج سارٹن (۱۸۸۴ء تا ۱۹۵۶ء) بلجیم کا رہنے والا تھا، لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد امریکہ چلا آیا تھا اور امریکی شہریت اختیار کرلی تھی، اسے عربوں کے علوم وفنون کی تاریخ سے بڑی دلچسپی تھی، اس شوق میں اس نے بیروت میں ایک عرصہ قیام کرکے عربی زبان سیکھی، اس کا عقیدہ تھا کہ صرف عربی زبان کے ذریعہ قدیم یونانی علوم وفنون تک رسائی ہوسکتی ہے اور یونانی اور لاطینی زبانوں کے درمیان عربی ہی واسطۃ العقد ہے، اس نے کئی سالوں کی محنت شاقہ کے بعد انگریزی میں ہسٹری آف سائنس (Introduction to History of Science) (تاریخ العلوم) کے نام سے ایک کتاب پانچ ضخیم جلدوں میں لکھی ہے، جس میں مسلم علماء اور حکماء کے سائنسی کارناموں کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے، اس عظیم الشان کتاب کے بعض حصے عربی میں منتقل ہوکر قاہرہ سے شایع ہوچکے ہیں۔

فرانز روزنتھال ایک جرمن مستشرق ہے جو کسی امریکی یونیورسٹی سے متعلق ہے، اس نے مقدمہ ابن خلدون کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے، مسلمانوں کی تاریخ نویسی کی تاریخ کے علاوہ اسلام میں علم کے تصور پر ایک بلند پایہ کتاب لکھی ہے جو بیحد مقبول ہوئی ہے۔

خاتمہ | ہمیں تسلیم ہے کہ بعض مستشرقین کی کتابوں میں یورپ کے روایتی مسیحی تعصب کی جھلک بھی نظر آتی ہے، ہمیں یہ بھی اقرار ہے کہ ان سے دانستہ اور نادانستہ غلطیاں بھی ہوتی ہیں، لیکن ساتھ ہی علمی دیانت کا تقاضا ہے کہ ان کی تلاش و محنت اور شوق علم یا جنونِ علم کا کھلے دل سے اعتراف کیا جائے، یورپ کے مشرقی علوم کے فاضلوں کی محنت کی بدولت اسلامی تاریخ، جغرافیہ، ادب، شعر، لغت، تفسیر اور فلسفہ اور دوسرے بہت سے علوم کے متعلق سیکڑوں کتابیں تصحیح و تعلیق سے نہایت عمدگی کے ساتھ چھپ کر شایع ہوچکی ہیں، جن کے نام صرف کتابوں میں مذکور تھے۔

جس محنت سے ایڈورڈ لین نے عربی، انگریزی لغت کو ترتیب دیا، زخاؤ نے کتاب الہند کی تصحیح کی، ڈخویہ نے تاریخ الطبری کو، فلوگل نے کشف الظنون کو، رائٹ نے المبرد کی الکامل کو، وسٹنفیلٹ نے سیرت ابن ہشام کو، رٹر نے مقالات الاسلامیین

اور عبدالقاہر الجرجانی کی اسرار البلاغۃ کو اور دوسرے مستشرقین نے سیکڑوں کتابوں کو برسہا برس کی جس محنت، جانفشانی اور تصحیح اور تحشیہ اور مختلف فہارس کے ساتھ چھاپ کر شایع کیا اس کے لئے ہم ان کے شکر گذار ہیں۔

وینسنک اور اس کے رفقاء نے تیس برس کی محنت شاقہ کے بعد کتب حدیث کا انڈکس بنام المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی سات ضخیم جلدوں میں مرتب کر کے شایع کیا ہے، جو عصر حاضر کا عظیم کارنامہ ہے، مسلم ممالک کی تاریخی عمارتوں اور ان کے فنون لطیفہ پر (اکریسول کی شتر بار تصانیف بھی قابل توجہ ہیں۔

ہمارے ہاں صرف شعر و شاعری کو ادب سمجھا جاتا ہے، مستشرقین نے نثر کو بھی برابر کا درجہ دیا، ہمارے ہاں نقد الادب پر گنتی کی چند کتابیں تھیں، مستشرقین نے ادبی تنقید کو ادب کی مستقل اور اہم شاخ بنا دیا ہے۔

ہمارے ہاں علماء، ادباء اور شعراء کے سیکڑوں تذکرے تھے، لیکن عہد بہ عہد کی مسلسل و مربوط علمی و ادبی تاریخ ناپید تھی، مستشرقین نے اس خلا کو پُر کیا

اسلامی ادبیات کی تاریخ کے لیے براؤن کی تاریخ ادبیات ایران، بروکلمان کی تاریخ الادب العربی اور اسٹوری کی پرشین لٹریچر آج بھی مستند اور معتبر مآخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے نوجوان علماء مستشرقین سے شوق علم، لگن اور محنت کا سبق لیں اور ان کی غلطیوں، کوتاہیوں اور فرو گذاشتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے علوم اسلامیہ کی خدمت ان سے بہتر اور احسن طریقہ پر سر انجام دیں۔

نذیر حسین، ۱۹۸۳/۸/۲

پروفیسر اجناس گولڈزیہر

از

مولانا سعید احمد اکبرآبادی، علی گڈھ

ولادت ہنگری کے ایک شہر (SziKesfehervar) میں ۲۲ جون ۱۸۵۰ء کو ہوئی، لکھنے پڑھنے اور مطالعہ کا ذوق فطری تھا، اس لیے ابھی عمر پانچ برس کی تھی عہد عتیق کے عبرانی اڈیشن کا مطالعہ شروع کر دیا، آٹھ برس کی عمر میں پوری تلمود پڑھ لی، اسی کا نتیجہ تھا کہ بارہ برس کی عمر میں گولڈزیہر نے عبرانی زبان میں جو مناجاتیں ہیں ان کی اصل اور ان کے اقسام پر ایک مقالہ لکھا اور اسے شایع کرایا، ابھی عمر سولہ برس کی تھی اور وہ اسکول بوائے ہی کہلاتے تھے، کہ گولڈزیہر نے فلسفہ اور قدیم زبانوں مثلاً فارسی اور ترکی کی کلاسوں میں جو بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں ہوتی تھیں پابندی اور باقاعدگی سے شرکت شروع کر دی، اس کی تکمیل کر لینے کے بعد گولڈزیہر کو مزید اعلیٰ تعلیم اور ریسرچ کے لیے ہنگری گورنمنٹ کی وزارت تعلیم کی طرف سے ایک وظیفہ مل گیا، تو اب وہ جرمنی چلے آئے، اور لیپزگ اور برلن کی یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، اس وقت ان کی عمر ۱۹ برس تھی، جرمنی سے وہ ہالینڈ گیے، اور لیڈن میں جو اس زمانہ میں اسلامیات کے درس و مطالعہ کا یورپ میں سب سے بڑا مرکز تھا، چھ مہینے قیام کیا، اس قیام کا نتیجہ یہ ہوا کہ گولڈزیہر نے اب تک جو کام کیا تھا اگرچہ اس کا دائرہ بڑا وسیع تھا، لیکن اس کا تعلق زیادہ تر یہودی اور سامی زبانوں (جن میں عربی بھی شامل تھی) کے ادب و لٹریچر کے مطالعہ سے تھا، مگر اب یعنی لیڈن میں قیام اور اسلامیات کے درس و مطالعہ کے بعد جیسا کہ گولڈزیہر نے خود اپنی ڈائری میں تحریر کیا ہے، اسلام کا مطالعہ اور اس پر تحقیق اور ریسرچ ان کی علمی زندگی کا نہایت اہم مشن بن گیا۔

اس سلسلہ میں انھوں نے مشرق وسطیٰ کا سفر کیا اور ستمبر ۱۸۷۳ء سے اپریل ۱۸۷۴ء تک دمشق اور قاہرہ میں قیام کیا، جامع ازہر، قاہرہ میں کسی غیر مسلم کا داخلہ قانوناً ممنوع تھا، لیکن گولڈزیہر نے خصوصی اجازت حاصل کر کے اس میں داخلہ لے لیا اور بحیثیت طالب علم وہاں پڑھنا شروع کر دیا، گولڈزیہر نے جو زمانہ یہاں گذارا اس کو انھوں نے اپنی زندگی کی خوشگوار ترین اور مفید ترین مدت بیان کیا ہے۔

اگرچہ اپنے والد کی سخت علالت کے باعث جو مرض الموت ثابت ہوئی، وہ قاہرہ میں زیادہ قیام نہ کر سکے، اور وطن لوٹ آئے، پھر یہاں دیکھا کہ ان کے گھر کا تجارتی کاروبار بھی انحطاط پذیر ہے، علاوہ ازیں ہنگری گورنمنٹ کی وزارت تعلیم کا اب وہ پہلا سا ہمدردانہ اور حوصلہ افزا رویہ باقی نہ رہا تھا، اور ملک کی سیاسی صورت حال بھی بدل چکی تھی، ان تمام مشکلات اور موانع کے باوجود گولڈزیہر نے باقاعدہ و باضابطہ اسلام کا تحقیقی مطالعہ انہماک اور کامل توجہ و یکسوئی کے ساتھ جاری رکھا، چنانچہ ۱۸۷۶ء میں وائنا کی امپیریل اکاڈمی کی روداد میں گولڈزیہر کے علمی کارنامہ کی اشاعت ہوئی تو علوم شرقیہ اور خصوصاً اسلام اور اس کے متعلقات کے ایک جدید طرز کے محقق کی حیثیت سے لوگوں کی نگاہیں ان کی طرف اٹھنے لگیں، اور یہی واقعہ ان کی شہرت کا نقطۂ آغاز بنا۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب کہ ہنگری میں یہودیوں کے خلاف تحریک بڑے زور شور سے چل رہی تھی، اور اس بنا پر یہودیوں کو اکثر و بیشتر علمی اعزازات و تقررات سے [illegible] کر دیا گیا تھا، گولڈزیہر بھی اس کی زد سے نہ بچ سکے، چنانچہ وہ بلند پایہ علمی اور تحقیقی کارنامے جن کی دھوم ممالک غیر کے حلقوں میں مچی ہوئی تھی، خود ان کے اپنے وطن میں ان کی کوئی قدر نہ تھی، یہ زمانہ گولڈزیہر کے لیے بڑا صبر آزما تھا، ۱۸۹۴ء میں بوڈاپسٹ یونیورسٹی نے گولڈزیہر کو پروفیسر مقرر کیا بھی تو محض آنریری، یعنی پروفیسر کا لقب رکھنے کے باوجود گولڈزیہر کو نہ تنخواہ ملتی تھی اور نہ اور سہولتیں میسر تھیں، جو باتنخواہ پروفیسروں کو حاصل ہوتی ہیں، اور وطن میں ان کے ساتھ یہ معاملہ اس وقت تھا جب کہ ۱۸۸۹ء میں آٹھویں انٹرنیشنل کانگریس آف اورینٹیلسٹ نے گولڈزیہر کو انکے علمی اور تحقیقی کارناموں کی قدر افزائی کی غرض سے ایک تمغۂ طلائی دیا اور ۱۸۹۴ء میں کیمبرج یونیورسٹی نے گولڈزیہر کو ڈبلو رابرٹسن اسمتھ کی جانشینی کی غرض سے پروفیسر شپ کی پیش کش کی تھی، جس کو خود گولڈزیہر نے منظور نہیں کیا تھا۔

آخر معاشی ضرورتوں سے مجبور ہو کر گولڈزیہر نے یہودی کمیونٹی کی سکریٹری کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا جس کو مسلسل تیس برس ۱۸۷۶ء سے ۱۹۰۴ء تک کرتے رہے، اس میں اگرچہ تنخواہ کافی تھی، لیکن یہ کام گولڈزیہر کی طبیعت اور مزاج و مذاق کے خلاف تھا، لیکن اس میں مصروفیت کے باوجود شام کے اوقات، تعطیل کے ایام اور ہفتہ وار چھٹی کے دن جو وقت ملتا تھا، گولڈزیہر اسے علمی اور تحقیقی کاموں میں صرف کرتے اور انھیں شایع کرتے رہتے تھے، جس سے ان کی عظمت اور شہرت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا، انجام کار ۱۹۰۴ء میں عمر میں پہلی مرتبہ ان کا تقرر ایک باقاعدہ و باضابطہ اور باتنخواہ پروفیسر کی حیثیت سے بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں ہوا، پہلے یہ سامی زبانوں اور ان کے ادبیات کے پروفیسر رہے، ۱۹۱۴ء سے فیکلٹی آف لا کے ماتحت

اسلامی فقہ کے صدر شعبہ ہوگئے، ۱۳ر نومبر ۱۹۲۱ء کو ان کا انتقال ہوا۔[له]

پروفیسر گولڈزیہر کے بلند پایہ علمی اور تحقیقی کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے، لیکن چند کتابیں نہایت اہم اور بڑی معرکۃ الآرا ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ (۱) فرقۂ ظاہریہ، ان کا مذہب اور ان کی تاریخ " ۱۸۸۴ء میں شایع ہوئی، (۲) "اسلامیات کا مطالعہ" یہ کتاب دو جلدوں میں ہے، اور اول الذکر کتاب کے چند برس بعد منظر عام پر آئی ہے، (۳) اس کے بعد ۱۹۰۸ء میں گولڈزیہر کو امریکہ کی طرف سے اسلامی دینیات اور اسلامی فقہ کے عہد بعہد ارتقا پر چھ لکچروں کی دعوت موصول ہوئی، گولڈزیہر نے یہ دعوت منظور کرکے ایک برس کی مدت میں لکچر تیار کرلیے، لیکن کچھ صحت کی خرابی اور کمزوری اور چند اور اسباب کی بنا پر گولڈزیہر کو امریکہ کے سفر کا ارادہ فسخ کرنا پڑا، اور انھوں نے یہ لکچر کتابی شکل میں "اسلامی دینیات اور قانون" کے نام سے چھپوادیا (۴) اس سلسلہ میں چوتھی کتاب جو نہایت اہم ہے وہ "مذاہب التفسیر الاسلامی" کے نام سے ہے، جس میں تفسیر قرآن کے مختلف مناہج سے بڑی محققانہ بحث کی گئی ہے۔

یہاں تک ہم نے گولڈزیہر کے ذاتی اور شخصی حالات وسوانح اور ان کے علمی کارناموں کا مختصراً ذکر کیا ہے، آئیے اب اسلامی نقطۂ نظر سے گولڈزیہر کا بحیثیت ایک نامور مستشرق کے جائزہ لیں، جس زمانہ میں گولڈزیہر بد وشعور کے ناخن لے رہے تھے، وہ زمانہ تھا جب کہ پیام مشرق کے مقدمہ میں علامہ اقبال کے بیان کے مطابق المانوی ادبیات کی تاریخ میں تحریک مشرقی پیدا ہوچکی تھی، گوئٹے کا دیوان اسی تحریک کا نتیجہ تھا جس کی نسبت جرمنی کا اسرائیلی شاعر کہتا ہے:

"گوئٹے کا دیوان ایک گلدستۂ عقیدت ہے، جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے، اس دیوان سے امریکہ کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہوکر مشرق کے سینہ سے حرارت کا متلاشی ہے۔"

یہ تحریک مشرقی جس کا آغاز اس وقت ہوا جب ۱۸۱۲ء میں فان نے خواجہ حافظ شیرازی کے دیوان کا مکمل ترجمہ شایع کیا، بعد کے شعرا پلاٹن، روکرٹ اور بوڈن ہمیر اشاٹ نے اسے تکمیل کو پہنچایا، پلاٹن نے فارسی زبان سیکھی، قافیہ ردیف اور ایرانی قواعد، عروض کی پابندی سے غزلیں اور رباعیات لکھیں اور نپولین کی مدح میں ایک قصیدہ بھی فارسی زبان میں لکھا" روکرٹ عربی، فارسی اور سنسکرت، تینوں مشرقی زبانوں کا فاضل اور ماہر تھا، علامہ اقبال لکھتے ہیں:

"روکرٹ کی نگاہ میں مولانا جلال الدین رومی کے فلسفہ کی بڑی وقعت تھی اور اس کی غزلیات زیادہ تر مولانا کی

له یہ معلومات ان کی کتاب اسلامک تھیولوجی اینڈ لا کے ترجمہ کے دیباچہ سے لیے گئے ہیں۔

تقلید میں ہی لکھی گئی ہیں، مزید لکھتے ہیں۔ چونکہ رو کرٹ السنہ مشرقیہ کا عالم تھا اس لئے اس کی مشرقی نظم کے آخذ بھی وسیع تھے، مخزن الاسرار نظامی، بہارستان جامی، کلیات امیر خسرو، گلستان سعدی، مناقب العارفین، بہار دانش منطق الطیر عطار اور ہفت قلزم وغیرہ، جہاں جہاں اسے حکمت کے موتی ملتے ہیں رو ل لیتا ہے، ..... اسلامی تاریخ کے بعض واقعات بھی اس نے نظم کئے ہیں، رابوڈن اشاٹ: اس کی نسبت علامہ اقبال رقم طراز ہیں، گوئٹے کے بعد مشرقی رنگ کا سب سے زیادہ مقبول شاعر بوڈن اشاٹ ہے، جس نے اپنی نظموں کا مجموعہ مرزا شفیع کے فرضی نام سے شائع کیا، یہ چھوٹا سا مجموعہ اس قدر مقبول ہوا کہ تھوڑی ہی مدت میں ایک سو چالیس دفعہ شائع ہوا، اس شاعر نے عجمی روح کو اس خوبی سے جذب کیا ہے کہ جرمنی میں مرزا شفیع کے اشعار کو لوگ عرصہ تک فارسی نظم کا ترجمہ ہی تصور کرتے رہے یہ جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس سے دو باتیں صاف طور پر معلوم ہوتی ہیں۔ (۱) ایک یہ کہ گولڈزیہر کی پیدائش کے وقت تحریک مشرقی نے جرمنی کے ادبی حلقوں میں ایک ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ عجمی گلشن علم وادب کی بوئے جاں نواز سے اہل جرمنی کے دل و دماغ مہک رہے تھے، اور وہ اس کے ذریعہ سرور باطن وروح کا سامان کرتے تھے اور (۲) دوسری بات یہ ہے کہ تحریک مشرقی کا مقصد اور اس کی غرض وغایت خالص علمی اور ادبی تھی اور سیاست سے ہرگز اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

پروفیسر گولڈزیہر جو فطرۃً مذاق استشراق لیکر پیدا ہوئے تھے، اس فضا سے متاثر ہوئے بغیر کس طرح رہ سکتے تھے چنانچہ جیسا کہ ہم شروع میں بتا آئے ہیں، گولڈزیہر کی عمر ابھی سولہ برس کی تھی کہ یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں پر جن میں فارسی اور ترکی زبانیں بھی شامل تھیں، لکچروں میں شامل ہونے لگے، ساتھ ہی شامی زبانوں کی طرف توجہ ہوئی تو عربی زبان بھی سیکھ لی لیڈن میں اسلامیات کا شوق پیدا ہوا تو اس کے درس و مطالعہ میں مصروف ہو گئے، یہاں تشنگی نہ بجھی تو مشرق وسطیٰ کی راہ لی اور حد یہ ہے کہ جامع ازہر، قاہرہ میں داخل ہو گئے، یہ گولڈزیہر کی ایک ایسی خصوصیت ہے کہ غالباً کوئی اور مستشرق اس میں ان کا شریک وسہیم نہیں ہے، جامع ازہر کے ارباب بست وکشاد نے یقیناً گولڈزیہر میں اسلامیات کے درس و مطالعہ کے لئے غیر معمولی تڑپ اور لگن محسوس کی ہو گی، اور اب تک جو کچھ انھوں نے لکھا پڑھا تھا اس کی انھوں نے قدر کی ہو گی، جب ہی تو انھوں نے جامع ازہر کی قدیم روایات اور اس کے قواعد وضوابط کے خلاف ایک یورپین غیر مسلم کو جامع ازہر میں داخلہ کی اجازت دی، پھر تکمیل تحصیل کے بعد جب معاشی ضرورتوں سے مجبور ہو کر ایک دفتری ملازمت کرنے لگے تو اس عالم میں بھی اسلامیات کا تحقیقی مطالعہ بڑی لگن کے ساتھ کرتے رہے، جس کا نتیجہ نہایت بلند پایہ مقالات وتصنیفات کی شکل میں ظاہر

ہوا، یہ سب کچھ اس امر کی روشن دلیل ہے کہ گولڈ زیہر کو اسلامیات کے ساتھ فطری اور حقیقی لگاؤ تھا، ان کا مقصد زندگی صرف علم کی خدمت تھا، ان کو غرض نہ سیاست سے تھی اور نہ مشنریز کی طرح اسلام یا مسلمانوں کے خلاف پروپگنڈا کرنے سے تھی، اور یہ اس لئے بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ مشنریز صلیبی لڑائیوں کے زخم خوردہ تھے، اس لئے وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف رسوائے زمانہ کتابیں لکھ کر کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق اپنے دل کا بخار نکالنا چاہتے تھے، ان لوگوں کے برعکس گولڈ زیہر یہودی تھے اور ان کے زمانہ میں یہودی خود عیسائیوں کے ستم زدہ تھے، اور یوں بھی یہودی مذہبی معاملات و مسائل میں اپنے آپ کو بہ نسبت عیسائیوں کے مسلمانوں سے زیادہ قریب سمجھتے تھے، ان وجوہ کے باعث گولڈ زیہر نے اسلامیات پر جو کچھ لکھا ــــ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا لکھا کہ اس میں عبقریت کی شان نظر آتی ہے ــــ اس کے متعلق بدنیتی کا الزام نہیں دیا جا سکتا ''

لیکن اس کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ گولڈ زیہر نے غلطیاں نہیں کی ہیں؛ نہیں انھوں نے کی ہیں، اور ان کی غلطیاں دو قسم کی ہیں، (۱) مستشرقانہ غلطیاں اور (۲) علمی غلطیاں، مستشرقانہ غلطیوں کے سلسلہ میں ہم کو بنیادی طور پر یہ باور کر لینا چاہئے کہ کوئی مستشرق خواہ کیسا ہی انصاف پسند اور اسلام کی رفعت و عظمت کا دل و جان سے قائل ہو، بہرحال وہ غیر مسلم ہے، اور اس بنا پر وہ اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کا مطالعہ جس نقطۂ نظر سے کرتا ہے، وہ بے شبہ ایک مسلمان کا نقطۂ نظر ہرگز نہیں ہو سکتا، اور اس کا سبب یہ ہے کہ ایک شخص کے مسلمان ہونے کے لئے بعض جو بنیادی عقائد ناگزیر ہیں۔ اگر مستشرق بھی ان عقائد کا حامل ہو تو وہ غیر مسلم ہی کہاں رہے گا، مثلاً نبوت کا اسلام میں تصور اور اس تصور کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرسل من اللہ ہونا، علاوہ ازیں معراج نبوی اور قرآن کا کلام الٰہی ہونا۔ یہ اور اس طرح کی چند اور باتیں ہیں جو مستشرقین میں عام ہیں، اور گولڈ زیہر بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

(۲) دوسری قسم کی غلطیاں جو گولڈ زیہر سے ہوئی ہیں، وہ علمی غلطیاں ہیں یا تعبیر و بیان کی فروگذاشتیں ہیں لیکن یہ غلطیاں نہ چنداں تعجب انگیز ہیں اور نہ ان سے گولڈ زیہر کے بلند مرتبہ و مقام پر حرف آتا ہے، جو انھیں علم و تحقیق کی بارگاہ معلیٰ میں بجا طور پر حاصل ہے، کیونکہ دنیا میں کسی علم و فن کا کوئی بڑا سے بڑا محقق اور رویدہ نہ عالم بھی ایسا نہیں ہے جس سے غلطیاں نہ ہوئی ہوں اور جن کی نشان دہی خود اس کی زندگی میں یا اس کے بعد نہ کی گئی ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی ارتقا پذیر ہے، اور اس کی نمو پذیری اور ارتقا کے ساتھ ساتھ انسان کی معلومات اور ذرائع و وسائل معلومات میں بھی اضافہ

اور تنوع پیدا ہوتا رہتا ہے۔

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جہاں تک گولڈزیہر کی مستشرقانہ غلطیوں اور فروگذاشتوں کا تعلق ہے، مسلمان تو مسلمان، زمانۂ حال کے بعض مستشرقین نے خود ان کا اعتراف کیا ہے اور گولڈزیہر کی طرف سے ان کی معذرت کی ہے، چنانچہ گولڈزیہر کی کتاب انٹروڈکشن ٹو اسلامک تھیولوجی اینڈ لا کے حالیہ انگریزی ترجمہ مطبوعہ ۱۹۸۱ء پر پروفیسر برنارڈ لیوس نے جو مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں۔

"اس کتاب سے بوجوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گولڈزیہر کا زمانہ سیاسی اور عقلی حیثیت سے کس درجہ مختلف تھا، ہمارے زمانہ میں جو مغربی مصنفین اسلام پر یا کسی اور ایشیائی وافریقی موضوع پر کتابیں لکھ رہے ہیں، ان کے برعکس گولڈزیہر اور ان کے برعکس گولڈزیہر اور ان کے ہم عصر مصنفین کو اس کا خیال ہی نہیں تھا کہ ان کی کتابوں کے قاری مسلمان بھی ہوں گے، اس لئے یہ لوگ اپنا مخاطب مغرب کے قارئین کو ہی بناتے تھے، چنانچہ اس عہد کے دوسرے مصنفین کی طرح گولڈزیہر بھی قرآن کو پیغمبر اسلام کی تصنیف کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، مسلمانوں کے نزدیک ایسا کہنا اسلام کی سخت تنقیص ہے، علاوہ ازیں اسلام پر لکھنے والے عام مغربی مصنفین کی طرح گولڈزیہر نے بھی قرآن وحدیث میں عہد جاہلیت کے بعض اور اجنبی اثرات پر بحث کی ہے، یہ موضوع بھی حساس مسلمانوں کے لئے سخت تکلیف دہ ہے، اس بحث میں گولڈزیہر نے جو زبان استعمال کی ہے وہ اب سے اکیاون برس پہلے تو استعمال ہوتی تھی، لیکن مستشرقین اب ایسی زبان استعمال نہیں کرتے جو مسلمانوں کے لئے آزردگی کا سبب ہو"

پروفیسر برنارڈ لیوس نے سطور بالا میں گولڈزیہر کی مستشرقانہ غلطیوں کی ہی نشان دہی نہیں کی ہے بلکہ موصوف کی فروگذاشتوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں

"محاضرات اسلام، یعنی گولڈزیہر کی کتاب انٹروڈکشن ٹو اسلامک تھیولوجی اینڈ لا، بے شبہ اپنے زمانہ کی پیداوار ہے، چند مباحث میں، اور وہ بھی زیادہ تر تفصیلات وتشریحات کے معاملہ میں گولڈزیہر کی تحقیقات کو ان نئی معلومات اور دلائل کی روشنی میں ردوبدل کیا جاسکتا ہے، جو گولڈزیہر کے بعد سے اب تک حاصل ہوچکی ہیں، اور جن پر عصر حاضر کی تحقیقات نے مہر تصدیق ثبت کردی"

لیکن ان تمام غلطیوں اور فروگذاشتوں کے باوجود اس زمانہ میں اسلامیات پر لکھنے والے مغربی مصنفین کے درمیان گولڈزیہر کا انفرادی وصف اور امتیاز کیا ہے، پروفیسر برنارڈ لیوس نے اس پر بھی روشنی ڈالی ہے، لکھتے ہیں:

ہم نے اوپر جن فروگذاشتوں کا ذکر کیا ہے، ان سے قطع نظر گولڈزیہر نے اسلامی عقائد اور مسلمانوں کے کارناموں کے ساتھ جس غیر معمولی ہمدردی کا جابجا اظہار کیا ہے وہ نہایت اہم ہے اگر ایک طرف گولڈزیہر میں ہمارے زمانہ کے مصنفین کی محتاط روش کی کمی ہے تو دوسری طرف اس تنقیص و تہجین کی روش سے جس کا اظہار اس عہد کے یورپین مصنفین مسلمانوں اور ان کے مذہب، تہذیب و تمدن اور ان کی مقدس کتابوں کی نسبت کرتے تھے، گولڈزیہر کا قلم اس سے بالکل آزاد اور مبرا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ بہت اہم اور غیر معمولی بات ہے، اگرچہ گولڈزیہر اس عہد کی پیداوار ہے جس میں تبلیغ عیسائیت کا بڑا چرچا تھا، لیکن اس کے باوجود گولڈزیہر کی تحریروں میں اس کا کوئی اثر نظر نہیں آتا، اور صرف یہی نہیں، بلکہ گولڈزیہر کے معاصرین یا ان کے پیش رو مصنفین میں سے جن لوگوں نے اسلام کی تعلیمات کو مسخ کر کے اور ان میں رد و بدل کر کے اسلام پر اعتراضات کئے تھے، گولڈزیہر نے ان لوگوں کی پردہ دری کر کے اسلام کی حقانیت اور اصلیت اور ان کے استناد کو ثابت کیا، اس سلسلہ میں گولڈزیہر عیسائیت کے ان علماء کے خلاف بھی سخت احتجاج کرتا ہے، جو عیسائیت پر بحث کرتے ہیں تو اپنی ایک طرفہ عقلیت پر بھروسہ کر لیتے ہیں، لیکن جب وہ اسلام پر گفتگو کرتے ہیں تو اس کے لئے معیار تنقید بہت سخت کر لیتے ہیں۔

سطور بالا میں پروفیسر برنارڈ لیوس نے گولڈزیہر کے اسلام سے متعلق علمی اور تحقیقی کارناموں کا بالغ نظری سے جو تحلیلی اور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے، ہمارے نزدیک وہ بالکل صحیح، درست اور معروضی ہے، اور بڑی بات یہ ہے کہ عرب علمائے اسلام کا بھی نقطہ نظر یہی ہے، چنانچہ گولڈزیہر کی دو نہایت اہم کتابوں کا عربی ترجمہ جو ہماری نظر سے گذرا ہے، ہم ان کا تعارف کراتے ہیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ علمائے عرب گولڈزیہر کے علمی اور تحقیقی کارناموں کے کس درجہ قدردان تھے، اور انھوں نے کس طرح ان سے خاطر خواہ استفادہ کیا۔

(۱) ایک ضخیم کتاب جس میں قرآن مجید کی تفسیر کے مختلف مناہج اور اسالیب سے بحث کی گئی تھی، اس کا عربی ترجمہ "مذاہب التفسیر الاسلامی" کے نام سے قاہرہ یونیورسٹی کے استاذ ڈاکٹر عبدالحلیم النجار نے کیا ہے، جو چار سو کے قریب صفحات پر پھیلا ہوا ہے، یہ ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۹۵۵ء میں مصر سے شائع ہو کر ارباب علم و ادب میں بہت مقبول ہوا۔ اس ترجمہ کے پیش لفظ میں فاضل مترجم لکھتے ہیں: "کتاب مذاہب التفسیر الاسلامی" منہج اور اسلوب بحث اور قرآن مجید کے درس و مطالعہ کے مختلف پہلوؤں

کو نمایاں کرنے کے اعتبار سے اسلامی ثقافتوں کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا واحد، منفرد اور ایک بالکل نئے طرز کا کارنامہ ہے۔"

اس حیثیت سے یہ کتاب علمی بحث و نظر اور قرآن مجید کی تفاسیر میں جو تنوع ہے، اس کے مطالعہ کے لیے نئے میدان مہیا کرتی ہے۔ کتاب کی اہمیت اور افادیت کا اس طرح برملا اعتراف کرنے کے بعد فاضل مترجم لکھتے ہیں: گولڈزیہر نے اس کتاب میں تمام مذاہب تفسیر کا استیعاب و استقصا نہیں کیا، علاوہ ازیں بعض دینی عواطف و جذبات کی تشریح میں دوسرے مستشرقین کی طرح مصنف سے بھی غلطیاں ہوئی ہیں، اور پھر کتاب اغلاط سے بھی خالی نہیں ہے، جن پر ہم نے اپنے حواشی میں تنبیہ کر دی ہے، لیکن گولڈزیہر کو بحیثیت ایک عالم اور محقق کے جو مرتبۂ بلند حاصل ہے ان چیزوں سے اسے کوئی نقصان نہیں پہونچتا

(۲) دوسری اہم کتاب جس کا عربی ترجمہ بڑے اہتمام اور کاوش سے کیا گیا ہے، وہ یہی ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یعنی انٹروڈکشن ٹو اسلامک تھیولوجی اینڈ لا، اس ترجمہ کا نام ہے "العقیدۃ والشریعۃ فی الاسلام، تاریخ التطور العقدی والتشریعی فی الدین الاسلامی" اس کا ترجمہ جو حواشی کے ساتھ ۳۰۰ صفحات پر ہے، مصر کے تین افاضل علماء ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ، ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر اور پروفیسر عبدالعزیز عبدالحق نے مل جل کر کیا ہے، اس ترجمے کے مقدمہ میں ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ مستشرقین پر ایک عام گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں یورپ کے جن علماء نے اسلام اور مسلمانوں پر کسی حیثیت سے خامہ فرسائی کی ہے ان میں دو طبقے ہیں، ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہے جو اپنی خواہشات کے بندے تھے، اس لئے وہ خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا، لیکن ان کے برخلاف ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہوا جو انصاف پسند تھا، ان لوگوں کو تحقیق و تدقیق کے بعد جو بات حق نظر آئی اسے برملا کہا، اس کے بعد طبقہ ثانیہ کے چند نامور مستشرقین اور ان کے خاص خاص کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ اور پھر پروفیسر گولڈزیہر کو بھی اس طبقہ میں شمار کیا ہے، پھر گولڈزیہر کی کتاب کا تعارف ان لفظوں میں کراتے ہیں، "یہ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، عقیدہ اور شریعت کا نشو و نما اور عہد بعہد اس کا ارتقاء زہد اور تصوف، مختلف اسلامی فرقے، مذہبی تحریکات، اور ان کے اسباب و علل، ان سب کا وسیع مطالعہ پیش کرتی ہے، مصنف نے اس کتاب کی تصنیف میں انھیں مراجع سے کام لیا ہے جو اسلام کے معتبر مراجع ہیں، اور ان مراجع سے استفادہ میں مصنف کی غیر معمولی ذہانت اور گہری بصیرت اس کی معاون اور مددگار رہی ہے، لیکن ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کتاب میں غلطیاں بھی کم نہیں ہیں، اس کی وجوہ متعدد ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ غیر مسلم ہونے کے باعث وہ اسلام کے مبادی اور اصول کی اصل روح تک پہونچنے سے قاصر رہا۔

اس بنا پر فاضل مترجمین نے ایک طرف تو افادۂ عام کی غرض سے بڑی محنت اور کاوش سے گولڈزیہر کی اس اہم کتاب کو عربی جامہ پہنایا اور دوسری جانب اس کتاب پر محققانہ حواشی لکھ کر مصنف کی نوع بنوع غلطیوں اور فرو گذاشتوں کی نشاندہی کرکے ان کی تصحیح بھی کی،

پروفیسر اربری نے اپنی کتاب (Portraits of PersianPoets) کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ یورپ میں اسلام پر لکھنے والوں کے تین دور ہیں (۱) پہلا دور مشنریز کا ہے، یہ لوگ لکھتے ہی تھے اسلام کو رسوا اور بدنام کرنے کی غرض سے (۲) دوسرا دور استعمار کا ہے، اس دور میں مستشرقین جو کچھ لکھتے تھے، مثلاً براؤن، نکلسن اور ڈینی سن راس، وہ علمی ذوق وتحقیق اور کاوش سے لکھتے تھے، لیکن استعماری طاقتیں ان سے یہ فائدہ اٹھاتی تھیں کہ ان کی کتابوں کے ذریعہ مسلمانوں کے مذہب وتہذیب وتمدن اور ان کی تاریخ سے واقفیت ہوتی تھی، چنانچہ اس عہد کے مستشرقین برطانوی گورنمنٹ کے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ سے بھی بحیثیت مشیر کار کے تعلق رکھتے تھے (۳) اس کے بعد جب استعمار کا دور ختم ہوگیا تو اب مستشرقین خالص علمی ذوق اور اسلامیات سے طبعی دلچسپی کی بنا پر لکھنے لگے، جہاں تک مشنریز کے کام کا تعلق ہے اس کی سخت مذمت خود پروفیسر آربری نے کی ہے، اور مسلمانوں سے اس کی معافی مانگی ہے۔

ہمارے نزدیک پروفیسر اربری کی یہ تقسیم بالکل صحیح ہے، نمبر ۲ اور ۳ کے ماتحت جو مستشرقین آتے ہیں، مسلمانوں کو ان کے علمی اور تحقیقی کارناموں کی قدر کرنی چاہیئے اور جو روش علمائے عرب نے پروفیسر گولڈزیہر کی نسبت اختیار کی ہے وہی روش ہمیں گولڈزیہر جیسے دوسرے مستشرقین کے متعلق اختیار کرنی چاہیئے۔

مستشرقین، استشراق اور اسلام

از

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، ریڈر اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ، اسلام آباد

میرے مقالہ کا عنوان ہے "مستشرقین، استشراق اور اسلام"، یہ سیمینار کے مرکزی موضوع "اسلام اور مستشرقین" سے ذرا ہٹ کر ہے، سیمینار کے موضوع کا مطلب جہاں تک میں نے سمجھا، یہ ہے کہ مستشرقین اسلام کو کس نظر سے دیکھتے ہیں، اور اسلام کے ساتھ ان کا رویہ کیسا ہے، جب کہ میں نے اپنے مقالہ میں اس مسئلہ سے بحث کی ہے کہ اسلام مستشرقین کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔

سب سے پہلے میں موضوع پر شامل الفاظ کی مختصر لغوی اور معنوی تشریح پیش کرتا ہوں، اس سے آیندہ مباحث کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

مستشرق مشتق ہے استشراق سے جس کا مادہ شرق ہے، جو ضد متصور ہوتا ہے غرب کا، میں نے متصور ہوتا ہے کہا، اس لئے کہ میرے نزدیک یہ تقسیم و تفریق حقیقی نہیں، اعتباری ہے، اور غیر صحت مند رجحانات کی پیداوار ہے، شرق و غرب کے دو باہم متضاد اور اردو میں مستعمل مترادفات مشرق و مغرب ہیں، عربی میں مستشرق ہی نہیں خود اس کا اسم یا مصدر استشراق بھی مولّد یعنی نیا اور بعد کی پیداوار ہے، چنانچہ قدیم عربی لغات میں اس مادہ کا باب استفعال سرے سے مفقود ہے، جدید لغات میں یا قدیم لغات کے جدید ایڈیشنوں میں البتہ مستشرق اور استشراق کے الفاظ بطور اسم فاعل اور اسم مصدر کے ملتے ہیں، جن کا استعمال مخصوص بھی ہے اور محدود بھی ہے، استشراق بطور فعل کے ان لغات میں بھی مذکور نہیں ہے، عربی یا اردو لٹریچر میں بھی یہ لفظ زیادہ پرانا نہیں ہے، اور الفاظ پہلے استعمال میں آتے ہیں، اس کے بعد ہی لغات میں جگہ پاتے ہیں، درحقیقت یہ الفاظ ترجمہ یا چربہ ہیں اورینٹلسٹ اور اورینٹلزم کا، جو اورینٹ سے ماخوذ ہیں، انگریزی میں اورینٹ ایسٹ کا ہم معنی ہے، اہل مغرب نے یہ نام اپنے ان نام نہاد اسکالروں کو دیا جنھوں نے بزعم ان کے مشرقی علوم و فنون، زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کو جس میں مذہب بھی آجاتا ہے، اپنی دلچسپی کا موضوع بنایا، اور ان کا خصوصی مطالعہ کر کے براہ راست اس سے واقفیت حاصل کی، عربی میں اس کے لئے کوئی لفظ پہلے سے موجود نہیں تھا، اس لئے جب اس کی ضرورت پیش آئی تو انگریزی ہی کے طرز پر الفاظ وضع کر لئے گئے۔

عربی زبان میں ایک ہی مادہ کو مختلف ابواب میں لے جا کر بذریعۂ اشتقاق طرح طرح کے الفاظ بنانے کا ایک وسیع نظام موجود ہے، بایں طور کہ مادے کا اصل معنی باقی رہتے ہوئے اس میں تنوع پیدا ہوتا چلا جاتا ہے، عربی کی ایک نمایاں اور اہم خصوصیت جس کو خاصیت ابواب کہتے ہیں اس باب میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے، مثلاً عربی کا ایک باب تفاعل ہے، اس کی خاصیت یہ ہے کہ یہ اصل مادہ کے مفہوم کو بناوٹی طور پر اختیار کرنے کا تصور دیتا ہے، م ر ض ایک مادہ ہے، اس کے معنیٰ بیمار ہونے کے ہیں، وہی مادہ باب تفاعل میں جا کر جب تمارض بن جاتا ہے تو اس کا معنی ہو جاتا ہے جھوٹ موٹ کا بیمار بننا، ایک اور مثال لیجئے، شعر سے شاعر بنا تو وہ واقعی شاعر کے لیے استعمال ہوا، لیکن باب تفاعل سے متشاعر بنا تو اس کا مطلب ہوا جھوٹا بناوٹی شاعر، اسی طرح تجاھل کے معنیٰ جان کر انجان بننا۔

ثلاثی مزید کے ابواب میں سے باب استفعال جس کے وزن پر استشراق بنایا گیا ہے، اس کی ایک خاصیت صیرورۃ اور اتخاذ ہے، جس میں بن جانا، اپنانا یا حاصل کرنا مفہوم ہوتا ہے، مثلاً استحجر الطین مٹی پتھر بن گئی، استوطن القریۃ بستی کو اپنا وطن بنالیا، استفادہ فائدہ حاصل کرنا۔ اسی اصول اور قاعدہ کے تحت جب کسی زمانہ میں کچھ لوگوں نے باہر سے آکر جزیرۃ العرب میں بود و باش اختیار کی اور وقت گذرنے کے ساتھ وہ بھی عرب ہو گئے تو ان کو عرب کے قدیم اور اصلی باشندوں سے ممیز کرنے کے لئے اسی باب استفعال سے کام لے کر ایک لفظ بنایا گیا استعرب، عرب بن گیا، چنانچہ عرب کی قدیم تاریخ میں عرب، عاربہ اور مستعربہ کی اصطلاحیں ملتی ہیں، اردو میں ہم اسے اصلی عرب اور نقلی عرب بھی کہہ سکتے ہیں، نئے اور پرانے، سچے اور جھوٹے سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، اس مسئلہ کی میں نے تحقیق نہیں کی کہ عربی میں مستشرقین اور استشراق کا لفظ پہلے پہل کس نے وضع کیا، اگر اس کے واضع خود مستشرقین ہیں تو ان سے چوک ہوئی، اور اگر غیر ہیں تو ان کا تیر نشانہ پر لگا، استشراق کی حقیقت اور اس کی تاریخ جن کی نظر میں ہے وہ تسلیم کریں گے کہ یہ نام ان کے لئے انتہائی موزوں ہے، خود یہ نام ان کا راز فاش کرتا ہے، ان کے چہرے سے نقاب اٹھا کر ان کی اصلیت کو ظاہر کرتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ از روئے عربی زبان استشراق کے معنی ہوئے بہ تکلف مشرقی بننا اور مستشرق کے معنی وہ شخص جس نے بہ تکلف مشرقیت اختیار کی یا مشرقی بنا، اور ظاہر ہے کہ اس فعل کی نسبت کسی مغربی ہی کی طرف ہو سکتی ہے، خود کسی مشرقی کا مشرقی بننا مہمل سی بات ہے لیکن عموماً اہل لغت اس کو ظاہر نہیں کرتے، چنانچہ جب وہ مستشرق کے معنی لکھتے ہیں تو بلا کسی فرق و امتیاز کے علی الاطلاق اس کا ذکر کرتے ہیں۔

میں نمونۃً ایک معمولی عربی لغت المنجد کا حوالہ دوں گا جو بہت متداول ہے، اس کے قدیم ایڈیشنوں میں تو

یہ لفظ موجود ہی نہیں ہے، جدید ایڈیشنوں میں ہے: المستشرق، العالم باللغات والآداب والعلوم الشرقیۃ، یعنی مشرقی زبانوں، ادبیات اور علوم کا جاننے والا، کیا ہم مشرق سے تعلق رکھنے والے ایسے کسی عالم کو مستشرق کہہ سکتے ہیں جو مشرقی علوم والسنہ کا جاننے والا ہو، اسی طرح کیا ہم کسی ایسے مسلمان کو مستشرق کہہ سکتے ہیں خواہ اس کا تعلق مغرب ہی کیوں نہ ہو؟ ظاہر ہے نہیں کہہ سکتے معلوم ہوا کہ اصطلاحاً یا عرفاً یہ لفظ مخصوص ہے اُن غیر مسلم علمائے مغرب کے لیے جو مشرقی زبانوں اور علوم وآداب میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ خود مشرقی زبانوں اور علوم وآداب میں بھی تحدید کی ضرورت ہے، مشرق سے تعلق رکھنے والی غیر مسلم زبانوں، غیر اسلامی علوم وفنون اور اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے عالم کو بھی مستشرق نہیں کہہ سکتے، چاہے وہ کوئی غیر مسلم اور مغربی ہی کیوں نہ ہو، سنسکرت، ہندومت اور بدھ مت کے کسی عیسائی مغربی اسکالر کو کوئی مستشرق نہیں کہتا، تو گویا بات یہاں تک پہونچی کہ مستشرق مغرب کے ان غیر مسلم خاص کر یہودی اور عیسائی اسکالروں کو کہتے ہیں جو اسلام، اسلامی علوم اسلامی زبانوں اور اسلامی تہذیب وثقافت کے مطالعہ میں خصوصی دلچسپی لیتے ہیں، اور میں نے جہاں تک اندازہ لگایا ہے اس کانفرنس کے مرکزی موضوع میں لفظ مستشرق کا یہی تصور مراد ہے، ورنہ اگر ہم المنجد کے مذکورۃ الصدر مفہوم کو سامنے رکھیں گے تو اس سے کئی الجھنیں پیدا ہوں گی، میں نے تحقیق نہیں کی، مگر میرا اندازہ ہے کہ المنجد کا مؤلف خود مستشرق ہے اور خود اس لفظ کی تعبیر وتاویل میں بھی اس کے استشراق کی دانستہ یا نادانستہ طور پر کارفرمائی موجود ہے، مدعا کی وضاحت کے لیے میں لغت ہی سے متعلق استشراق کی ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا، الفرائد الدریہ کا مصنف جُنُب کا مفہوم بیان کرتا ہے تو نہ صرف اپنی طرف سے اس میں ذم کا پہلو شامل کر دیتا ہے، بلکہ زبردستی مسلمانوں کے ساتھ اس کی نسبت قائم کرتا ہے، عربی زبان کے مطابق جُنُب اس شخص کو کہتے ہیں جو حالت جنابت میں ہو، یا جسے جنابت لاحق ہو گئی ہو، جنابت ایک ایسی حالت ہے جس میں فی نفسہ ذم کا کوئی پہلو نہیں، اور یہ حالت مسلم غیر مسلم کسی کو بھی پیش آسکتی ہے، لیکن الفرائد الدریہ کا مصنف یاد آجب اس کے معنی لکھتا ہے تو اس کے ساتھ مسلم کا لفظ لگا کر اپنے استشراق کا مظاہرہ کرتا ہے، ج ن ب کی فصل ملاحظہ ہو:

جنب معنی Polloted Muslim یعنی غلیظ یا پلید مسلمان

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مستشرق کا مطلب بتاتے وقت جہاں لغوی اور اصطلاحی دونوں اعتبار سے اس کو مقید کرنے کی ضرورت تھی وہاں تو اس کو مطلق رکھا گیا لیکن جُنُب کا مطلب بیان کرنے میں جہاں تقیید وتحدید کی کوئی گنجائش

نہیں تھی وہاں کس طرح اپنی طرف سے اقوال کا اضافہ کر دیا گیا، گویا کہ اسلام اور مسلم دشمنی کا دوسرا نام استشراق ہے، اور ہر وہ عالم شخص جو اس رجحان کا حامل ہو وہ مستشرق ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک اور نکتے کی طرف اشارہ ضروری سمجھتا ہوں، بات مستشرق اور استشراق کی ہو رہی ہے جیسا کہ میں نے ابتدائی سطور میں عرض کیا، ان الفاظ کی اصل شرق یا مشرق ہے جو ضد ہے غرب اور مغرب کا، آپ ذرا غور کیجیے مشرق و مغرب کی تقسیم اور حد بندی کی حقیقت کیا ہے، یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ اس کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی، اور اس کے پیچھے کیا محرکات کارفرما ہیں؟ جہاں تک کہ ان کے امر واقعہ ہونے کا تعلق ہے تو یہ کائناتی صداقتیں ہیں، یہ مظاہر فطرت ہیں، ان کے وجود سے کون انکار کر سکتا ہے جس سمت سے سورج طلوع ہوتا ہے اس کو مشرق کہنا اور جس سمت میں غروب ہوتا ہے اس کو مغرب کہنا ایک قدرتی واقعہ کا اظہار ہے، لیکن اس کی بنیاد پر دنیا کو تقسیم کرنا انسانیت کی ردا کو تار تار کرنا ہے، یا اقبال کے الفاظ میں یہ تمیز فساد آدمیت ہے، یہ تدلیس ابلیس ہے، یہ فساد قلب و نظر کا شاخسانہ ہے، اہل ہوس نے ہوائے نفس کی تکمیل کے لیے جو حیلے تراشے ہیں ان میں سے ایک گمراہ کن حیلہ یہ بھی ہے ع "ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف"

اقبال نے جدید و قدیم کی تفریق کو ہدف ملامت بنایا۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک دلیل کم نظری قصہ جدید و قدیم

بالکل یہی حال مشرق و مغرب کی تقسیم کے اس افسوں کا ہے جو اہل مغرب نے اپنے غیر انسانی مقاصد کے لیے پھونکا ہے، آپ اپنی دنیا کی قدیم تاریخ پر نظر ڈالیے، کیا نام نہاد اہل مغرب کے ظہور سے پہلے بھی اس قسم کی تقسیم کا وجود اس تصور کے ساتھ کہیں ملتا ہے جو اہل مغرب نے دنیا کو دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ شرق و غرب یا مشرق و مغرب کی تفریق و تقسیم اور ان کے مابین تضاد کا موجودہ تصور بھی دین ہے اہل مغرب ہی کی جس کو انھوں نے اپنے استعماری مقاصد کے لیے عام کیا، ورنہ اسلام کے نقطہ نظر سے مشرق و مغرب دونوں ایک ہی دریا کے دو کنارے ہیں اور ان میں تفریق و تقسیم کی کوئی بھی واقعی یا حقیقی بنیاد موجود نہیں ہے، قرآن کہتا ہے:

لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ اللہ ہی کے ہیں مشرق و مغرب،

(بقرہ: ۱۱۵ و ۱۴۲)

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (شعراء ۲۸، مزمل ۹) رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ (رحمٰن ۱۷) مشرق و

کی بندر بانٹ کر کے اپنا حصہ ہی نہیں کل کا کل ہضم کرنے کے لیے مکر و فن سے کام لیں۔

مغرب سب کا خالق مالک پروردگار جب اللہ تعالیٰ ہے تو انسانوں کے ایک گروہ کو یہ کہاں سے حق حاصل ہو گیا کہ وہ دنیا

میں نے مشرق و مغرب کی غیر فطری تقسیم کے لیے بندر بانٹ کا استعارہ استعمال کیا ہے، اس کی بلاغت کا کما حقہ ادراک کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس استعارہ میں جو تلمیح ہے اس کو ذہن میں تازہ کر لیا جائے، دو بلیوں میں کسی شی کی تقسیم پر جھگڑا ہوا، وہ خود جھگڑا طے نہ کر سکیں تو تصفیہ کے لیے ایک بندر کے پاس گئیں، بندر چالاک تھا، اس نے اس شے کے دو غیر مساوی حصے کیے اور ان کو ترازو کے دو پلڑوں میں رکھ دیا، اس کے بعد جو حصہ زیادہ تھا اس میں سے اتنا نکال کر کھا لیا کہ جو حصہ زیادہ تھا وہ کم اور جو کم تھا وہ زیادہ ہو گیا، یہ عمل اس نے کئی بار دہرایا، یہاں تک کہ دونوں پلڑے خالی ہو گئے اور بلیوں کے لیے کف افسوس ملنے کے سوا کچھ باقی نہ رہا، ان دانایانِ فرنگ نے اب تک ہماری دنیا کے ساتھ کیا کیا ہے، جب سے ان کو دنیا کے معاملات میں عمل دخل کا موقع ملا ہے، ان کی بندر بانٹ جاری ہے، پہلے انھوں نے دنیا کو مشرق و مغرب میں تقسیم کیا اور حکمت عملی یہ اختیار کی کہ مغرب تو ان کا ہے ہی کہ وہ مغرب کے ہیں اور مغرب ان کا ہے، رہا مشرق تو اس کو انھوں نے طرح طرح کے حربے اور ہتھکنڈے اختیار کر کے اپنے استعماری اور استحصالی عزائم کی آماجگاہ بنا رکھا ہے، ان ہی حربوں اور ہتھکنڈوں میں سے ایک استشراق بھی ہے، یہ مستشرق جنھیں اسکالر کا پُرفریب نام دیا جاتا ہے، یہ درحقیقت مغربی استعمار کے ڈپاؤں میں سے ایک ہے، میں نے ان کے لیے ایجنٹ کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ ایجنٹ دوسروں کا کارندہ اور آلۂ کار ہوتا ہے، یہ کسی کے آلۂ کار نہیں، یہ ان کا اپنا کاروبار ہے، یہ فقط تقسیم کار ہے، ہاں ان کے آلۂ کار بھی ہیں، ان کا ذکر بھی میں کروں گا، ان کے ذکر کے بغیر یہ داستان نامکمل رہ جائے گی۔

مستشرقین کے نام میں بظاہر بڑی معصومیت ہے، اور نام ہی پر کیا موقوف ہے، ان کے کام کو بھی دیکھیں تو بادی النظر میں اس میں برائی کی بات نظر نہیں آئے گی، آخر اس میں برائی کی کیا بات ہے، اگر بے چارے مغربی اسکالر اور مفکرین مشرق علوم و فنون کی تحصیل و تحقیق میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں، وقت ہی نہیں سرمایہ اور ذہنی صلاحیتیں بھی، وہ کام جو ہمیں کرنا چاہیے، بے چارے وہ کر رہے ہیں، کیا یہ ان کا احسان نہیں ہے اہل مشرق پر؟ سادہ لوح اہل مشرق سادہ لوح مسلمان ان کا احسان مانتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ان کو گلہ بھی ہے ع

مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا!

اس لیے کہ ع — ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

اب میں عنوان کے تیسرے لفظ اسلام کی طرف آتا ہوں۔

اسلام کی دو تعبیریں ہیں، ایک لغوی، دوسری اصطلاحی، لغوی تعبیر کی رو سے اسلام ابتدائے آفرینش سے انسانیت کا آسمانی مذہب رہا ہے، آدم سے لیکر نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک معلوم نامعلوم، معروف غیر معروف تمام انبیاء دین اسلام ہی کے حامل، داعی اور نقیب تھے:

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ — اللہ کا اصل دین اسلام ہے

(آل عمران: ۹)

نوح، ابراہیم، داؤد و سلیمان، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام سب کا دین اسلام ہی تھا، اس لیے کہ انھوں نے جس دین کی دعوت دی اس کی روح بنیادی طور پر ایک تھی، لیکن اصطلاحاً بطور اسم علم کے یہ نام اس دین کو اس وقت دیا گیا جب نبی آخر الزماں صلعم کو اس کے بار امانت سے سرفراز کیا گیا۔

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ أَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا۔ (مائدہ: ۳)

اب میں نے تمھارے لئے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی، اور تمھارے لئے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند فرمایا۔

اس کی شہادت قرآن میں مذکور اس دعا سے بھی ملتی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے امت مسلمہ کے نام سے ایک نئی امت متعارف کرانے کے لیے کی، غالباً اسی لئے قرآن نے وجہ تسمیہ کے ذکر میں اس کی نسبت حضرت ابراہیمؑ کی طرف کی ہے: هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ (حج)، (حضرت ابراہیمؑ ہی نے تمھیں مسلم کا نام دیا) عرف عام میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے لیے اسلام کا لفظ خصوصیت کے ساتھ جو بولا جاتا ہے تو اس میں اسلام کی یہی اصطلاحی تعبیر مراد ہوتی ہے۔

اور آج کے موضوع میں بھی بالفعل اسلام کی یہی تعبیر مراد ہے، جس کی تاریخ خدا کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اس کی آخری کتاب قرآن مجید کے نزول سے شروع ہوتی ہے۔

استشراق کی تاریخ کا رشتہ یورپ کی نشأۃ ثانیہ اور تحریک احیائے علوم سے جوڑا جاتا ہے، لیکن یہ غلط ہے، استشراق کے لفظ اور اس کے ظاہر سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔ ع

میرے ظاہر سے نہ کر اندازۂ باطن میرا

یہ تحریک بہت پرانی ہے، اس کے ڈانڈے ازل سے ملے ہوئے ہیں ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز　　چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

زیر بحث موضوع کے دائرے میں ہم اسلام کے ساتھ اس کے تعلق کے آغاز اور اس کی نوعیت کا سراغ لگائیں اور عہد بہ عہد اس کی رفتارِ کار کا جائزہ لیں تو ہم جلد اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ الفاظ اور اصطلاحات سے صرفِ نظر کرکے دیکھیں تو نظر آتا ہے کہ روحِ استشراق روزِ ازل سے موجود ہے، موجود ہی نہیں فعال اور سرگرمِ عمل ہے، حالات کے تحت وہ بھیس بدلتی رہی، اپنی حکمتِ عملی تبدیل کرتی رہی، اس کے طریقِ واردات، حربی تدابیر، زور آزمائی کے داؤ پیچ میں کمی بیشی ہوتی رہی، اُتار چڑھاؤ آتا رہا اور رد و بدل ہوتا رہا، مگر یہ عمل اس وقت سے لے کر اب تک جاری ہے، اور آئندہ بھی کسی نہ کسی صورت میں جاری رہے گا، اور اس کا مقصد ان کے اپنے نقطۂ نظر سے جو بھی ہو، اور وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں، ان سے بھی نہیں، ہم سے بھی نہیں، مگر مقصد ہمارے نقطۂ نظر سے یہ ہے کہ ہمارے دعویٰ ایمان اور جذبۂ اسلام کا امتحان ہوتا رہے، اور اللہ یہ دیکھ لے کہ جو لوگ ایمان کے دعویدار ہیں ان میں کون اپنے دین پر ثابت قدم رہتا ہے اور کون گمراہ ہو کر دین سے پھر جاتا ہے، اس کی نشاندہی بھی قرآن مجید نے اپنے زمانۂ نزول ہی میں کر دی تھی، سورۂ بقرہ میں جہاں تحویلِ قبلہ کا ذکر ہے ذرا مختلف سیاق و سباق میں اس حکمت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا
إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ
يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ
(بقرہ : ۱۴۳)

اور جس قبلہ پر تم تھے ہم نے اس کو صرف
اس لیے ٹھہرایا تھا کہ ہم الگ کر دیں ان لوگوں
کو جو رسول کی پیروی کرنیوالے ہیں، ان لوگوں سے
جو پیٹھ پھیر کر جانے والے ہیں۔

یہی نہیں، ذرا دور تک گہرائی میں جا کر دقتِ نظر سے دیکھا جائے۔ تصادم، کشاکش اور آویزش کی داستان اتنی ہی قدیم ہے کہ جتنا خود انسان، روزِ ازل، آدم اور ابلیس کا قصہ، پھر آدم اور شیطان کا ایک ساتھ ہبوط، دنیوی زندگی میں حق کے ساتھ باطل، اسلام کے ساتھ کفر، ایمان کے ساتھ الحاد کو بھی اپنا کاروبار جاری رکھنے کی کھلی چھوٹ کا مقصد کیا ہے؟ معرکۂ خیر و شر اس دنیا میں کب برپا نہیں رہا، روزِ ازل سے یہ معرکہ جاری ہے اور رہتی دنیا تک جاری رہے گا۔ قصہ کوتاہ

یہ کہ وہ روح جسے استشراق کا خوشنما نام دیا جاتا ہے، بہت پرانی ہے، اس کا بھیس بدلتا رہتا ہے، اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات

جیسا کہ میں نے کہا استشراق ایک تحریک ہے، اسکی ایک تاریخ ہے، اس کا ایک مقصد ہے، اس کے ہاں مقصد کے حصول کا طریقہ بدلتا رہتا ہے، مقصد نہیں بدلتا، اسلام بھی ایک تحریک ہے، اس کی بھی ایک تاریخ ہے، اس کا بھی ایک مقصد ہے، لیکن اس کے ہاں مقصد کی طرح طریقۂ کار بھی نہیں بدلتا، ان دونوں میں فرق کی وجہ ان دونوں کا باہمی اختلاف ہے، یہ اختلاف سطحی نہیں، بلکہ بنیادی ہے، اور اس کا تعلق ان کی فطرت سے ہے، اسلام حق کا علمبردار ہے جو رنگ نہیں بدلتا، استشراق باطل کا حاشیہ بردار ہے جو موقع و محل دیکھ کر رنگ بدل لیتا ہے، اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ؎

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

استشراق کی ابتدا کب اور کن حالات میں ہوئی اور اس کے پیچھے کیا مقاصد تھے، کس قسم کے اسکالروں نے اس کی طرف توجہ کی، ان کے اپنے حالات و کوائف کیا تھے، اس زمرے سے تعلق رکھنے والے مختلف اسکالروں کا رویہ اور طرزِ عمل مشرق بالخصوص اسلام کے ساتھ کیا رہا ہے، ہمدردانہ یا غیر ہمدردانہ، حقیقت پسندانہ یا متعصبانہ، جانبدارانہ یا غیر جانبدارانہ، روادارانہ یا جارحانہ اور معاندانہ؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کے متعلق کافی بحث ہو چکی ہے اور اب بھی کوئی شخص ان کا تاریخی جائزہ لینا چاہے تو اس کی ضرورت یا افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، مگر مجھے بالفعل ان سوالات سے تعرض نہیں کرنا ہے؛ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ استشراق نے ایک روایت، تحریک بلکہ باقاعدہ منظم ادارے کی شکل اختیار کر لی جس کی اپنی ایک تاریخ ہے، یہ تحریک کس طرح پروان چڑھی، کس کے جلو میں مغرب کا یہ ابرِ رحمت مشرق میں آیا اور اہلِ مشرق پر سایہ فگن ہوا؟ یہ کوئی سربستہ راز نہیں، مغرب کے افق سے طلوع ہونے والا یہ سورج کیونکر دور دراز کا سفر طے کرتا ہوا مشرق میں لمعہ افگن ہوا، مشرق جسے مبدأ فیاض سے خلقۃً یہ شرف حاصل رہا کہ اس کے آفاق و مطالع سے آفتاب عالمتاب کا نور ہی نہیں پھیلتا اور ماہتاب کی چاندنی ہی نہیں چھٹکتی بلکہ علم کی روشنی اور دین و مذہب کا اُجالا بھی یہیں سے نمودار ہوتا رہا، اسے کیسے گہن لگ گیا؟ میں ان امور کو بھی نہیں چھیڑنا چاہتا، یہ طول طویل بحثیں ہیں، میں جن سے صرفِ نظر کر کے اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہوں

اسلام حق کا پیغام لے کر آیا تو اس کے راستے میں جو لوگ حائل ہوئے اُن میں کفار قریش کے علاوہ یہود و نصاریٰ بھی تھے، یہود و نصاریٰ کی نفسیات بوجوہ اس باب میں کفار قریش سے مختلف تھیں، ان میں نسلی تعصب کے علاوہ مذہبی عصبیت بھی تھی، نسلاً ان کا تعلق حضرت ابراہیمؑ کی دوسری شاخ حضرت اسحاقؑ سے تھا، جبکہ داعیٔ اسلام کا تعلق اس خاندان سے تھا جو حضرت اسماعیلؑ سے چلا، مذہبی اعتبار سے یہود و نصاریٰ پہلے سے حامل کتاب تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ آخری نبی کی بعثت بھی ان ہی میں ہوگی، خاندانی رقابت کا یہ احساس ان میں اس حد تک غالب تھا کہ انھوں نے قبلہ اور ذبح عظیم کے واقعہ کی اصلیت کو چھپانے کے لئے خود اپنی کتابوں میں تحریفیں کیں، اسلام جب انھیں ایک غالب قوت کی حیثیت سے اُبھرتا نظر آیا تو انھوں نے اس کا راستہ روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور حالات کے تحت ادل بدل کر وہ تمام تدبیریں اختیار کیں جو وہ کر سکتے تھے، ان ہی تدابیر میں سے ایک تدبیر وہ بھی تھی جسے آج کی زبان اور اصطلاح میں استشراق کا نام دیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اس کی نسبت اسلام کا رویہ مذمت اور اظہار نکیر ہی کا ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید نے اس زمانہ میں جو روح استشراق کی پردہ دری ان الفاظ میں کی ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (حم السجدہ ۲۶:۴)	اور کافروں نے کہا اس قرآن کی باتیں نہ سنو اور اس میں گڑبڑ پیدا کرو، شاید اس طرح تم غالب آجاؤ۔

آج اسرائیل اور بعض باطل پرست فرقے قرآن مجید کے غلط نسخے چھاپ کر پھیلانے کی جو ناپاک کوشش کر رہے ہیں، کیا وہ اسی سلسلہ کی کڑی نہیں جس کا ذکر مذکورہ بالا آیت میں کیا گیا ہے؟

اہل کتاب کے ایک گروہ نے یہ حربہ اختیار کیا کہ ان کے آدمی صبح اسلام لاتے اور شام کو دائرہ اسلام سے نکل جاتے تاکہ اس طرح لوگ اسلام سے برگشتہ ہوں جس کا ذکر آل عمران کی آیت ۷۲ میں کیا گیا ہے:۔

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۔ (آل عمران ۷۲)	اور اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں پر جو چیز نازل کی گئی ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو اس کا انکار کر دیا کرو تاکہ وہ بھی اس سے برگشتہ ہوں۔

باطل پرستوں کی ایک چال یہ بھی ہوتی ہے کہ کچھ دو اور کچھ لو کا معاملہ کرکے بیچ کا راستہ اختیار کریں، لیکن حق کے لیے یہ قابل قبول نہیں، آنحضورؐ کے زمانہ میں بھی یہ حکمت عملی موجود تھی جس کی نشاندہی قرآن مجید نے سورہ نون کی آیت ۹ میں کی ہے:

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (نون : ۹)	وہ چاہتے ہیں تم اپنے موقف سے ہٹو تو وہ بھی ہٹیں۔

یہ رجحان اس زمانہ ہی میں نہیں تھا، بلکہ آج کے استشراق میں بھی موجود ہے، مسلم کرسچین ڈائیلاگ کے عنوان سے آج جو کوششیں ہو رہی ہیں، ان کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ بیچ کی راہ نکال کر دفع الوقتی کی جائے، جبکہ اسلام اسکو پسند نہیں کرتا، وہ صاف صاف کہتا ہے:

اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً	اسلام میں پورے طور پر داخل ہو جاؤ

اس کے نزدیک دو ہی راستے ہیں، اسلام یا کفر:

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (البقرہ : ۸۵)	کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے دوسرے حصہ کا انکار کرتے ہو؟

یہ حکمتِ عملی اس کے نزدیک کفر ہی کی ایک صورت ہے، سورہ بقرہ کی آیت ۸۵ میں اس طرز عمل کی نشاندہی کرکے صرف دنیوی ذلت اور عذاب آخرت کی دھمکی دی گئی ہے، لیکن سورہ نساء کی آیت ۱۵۰ میں اس روش کو حقیقی کفر سے تعبیر کیا گیا ہے:

وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا۔ (نساء : ۱۵۰)	اور وہ کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں، اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی راہ نکالیں، یہی لوگ درحقیقت پکے کافر ہیں

قرآن شریف کی یہ چند آیات جو اوپر بیان کی گئیں ان کے آئینے میں ہم آج کے مستشرقین اور استشراق کا چہرہ برانگندہ نقاب دیکھ سکتے ہیں اور اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسلام ان کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے، قرآن واشگاف الفاظ میں یہود

ونصاریٰ کے ساتھ ربط وتعلق قائم کرنے سے منع کرتا ہے اور ایسے لوگوں کو جو ان کے ساتھ دوستی رکھتے ہیں ان کو انہی میں شمار کرتا ہے، سورۂ مائدہ کی آیت ۵۱ میں کس قدر دو ٹوک انداز میں اس کی صراحت ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (مائدہ: ۵۱)	اے ایمان والو! تم یہود ونصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور تم میں سے جو ان کو اپنا دوست بنائے گا تو وہ انہی میں سے ہے، اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔

عصر حاضر کے مستشرقین یہود ونصاریٰ نہیں تو اور کون ہیں، لیکن یا للعجب کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ آج مسلمانوں نے انہی یہود ونصاریٰ کے ساتھ مساویانہ حیثیت سے رسم وراہ رکھنا تو ایک طرف ان کو استاد کا درجہ دیکر اپنے دل ودماغ کی زمام کار ان کے ہاتھ میں دے رکھی ہے، اسلام اور مسلمانوں سے مستشرقین اور استشراق کے تعلق کے مختلف ادوار ہیں، ایک زمانہ میں انھوں نے مسلمانوں سے مختلف دنیوی علوم سیکھے، اس میں استادی کا درجہ حاصل کرنے کے بعد انھوں نے عربی اور اسلامی علوم کی طرف توجہ کی اور بڑی ہوشیاری سے آہستہ آہستہ ان کے بھی امام بن گئے اور نوبت بایں جا رسید کہ آج کسی کو طبعی اور سائنسی علوم میں ہی نہیں، عربی اور اسلامیات میں سند فضیلت لینی ہوتی ہے تو وہ یورپ اور امریکہ کی ان جامعات کا رخ کرتا ہے جہاں یہ نام نہاد اسکالر دام تزویر بچھائے دانہ ڈال کر شکار کی گھات میں بیٹھے ہیں، کیا ان کا مقصد واقعی مسلمان نوجوانوں کو عربی اور اسلامیات پڑھا کر اسلام اور ملت اسلامیہ کی خدمت کرنا ہے؟ پورے پورے شعبے انھوں نے اس لئے کھول رکھے ہیں کہ مسلمان ذہن تیار ہوں؟ اسکالرشپ میں بڑی رقم وہ اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل پیدا ہوں؟ کوئی ہوشمند ایماندار آدمی اس کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا۔

استشراق کی تاریخ یہاں پہونچ کر ایک نیا موڑ مڑ چکی ہے، وہ کام جو ایک صدی پہلے عیسائی مبلغین اور مستشرقین کر رہے تھے، اب اس کام کے لئے انھوں نے مسلمانوں میں سے آدمی تیار کر دیئے ہیں، اقبال کا مصرعہ یاد آتا ہے، انھوں نے ہمارے شاندار ماضی کے لئے کہا تھا ؎

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

آج صنم خانہ کعبہ سے پاسبان حاصل کر رہا ہے، پہلے اس طرح کی اِکّا دکّا مثالیں تھیں، آہستہ آہستہ ان میں اضافہ ہوتے ہوتے ان کی تعداد اتنی ہو گئی ہے کہ ہم اسے استشراق کے ایک علیحدہ دور سے تعبیر کر سکتے ہیں، میں نے بہت سوچا کہ استشراق کے ان علمبرداروں کو کیا نام دیا جائے، مستشرقین اور استشراق کی جو صحیح تعریف ہم نے آغاز کلام میں متعین کی تھی وہ تو ان پر صادق نہیں آتی، بعض لکھنے والوں نے ان کے لئے مستغربین لکھا ہے، مگر اس کی موزونیت میں مجھے کلام ہے، میں لفظیات اور اصطلاحات کے ماہرین کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس کے لئے کوئی مناسب لفظ تجویز کریں۔

شیطان اس دنیا میں انسان کو گمراہ کرنے کا مشن لے کر آیا تھا، اس کو جب انسانوں میں ہی ایسے شاگرد مل گئے جو اس کے مشن کو اس سے زیادہ مستعدی کے ساتھ تکمیل کرنے لگے تو وہ فارغ ہو گیا، اسی طرح ہمارے مستشرقین بھی اب فارغ ہو چکے ہیں، کچھ وقت گزرنے کے بعد ان کا نام صرف تاریخ میں رہ جائے گا، لیکن اسلام رہے گا اور اس مستشرقین کی جگہ ایک نئی مخلوق سے واسطہ ہوگا جو کام انہی کا کرے گا، لیکن اس کا نام کچھ اور ہوگا، یہ مشیتِ الٰہی ہے، جو لوگ اسلام کے نام لیوا ہیں، دل سے اسلام کی حقانیت کے قائل ہیں وہ خبردار ہو جائیں۔ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغ

سر ہیملٹن الیگزنڈر روسکین گب

(۱۸۹۵ء، ۱۹۷۱ء)

از

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، جامعہ ملیہ دہلی

مشرق کے مذاہب اور تہذیب وتمدن کے مطالعہ کے لیے مستشرقین نے جو کوششیں کی ہیں، ان کے مقام و مرتبہ کا ہمیں احساس ہے، اس میدان میں ان کی کاوشوں نے استشراق کو علم کا ایک ممتاز و وقیع شعبہ یعنی ایک مخصوص ڈسپلن بنادیا۔ مستشرقین نے مشرق کے علمی خزینے کے ایک بڑے حصّہ کو جو وقت کے دبیز دھندلکوں میں دفن تھا، نکالا، نادر اور نایاب کتابوں کا پتہ چلاکر اور انھیں حاصل کرکے ان کا مطالعہ کیا اور ان میں سے بہت سے نوادرات کو ایڈٹ کرکے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا، ان پر حواشی لکھے، بعض کی شرحیں کیں، مختلف زبانوں میں ان کے تراجم شائع کیے اور پھر ان سے مشرق اور مغرب کے عالموں اور محققین نے استفادہ کیا، انھوں نے تحقیق وتنقید کے ارتقاء پذیر اصولوں اور طریقوں کی مدد سے اپنے تحقیقی کام اور علمی مقاصد کو باوقار بنانے کی بھی کوشش کی، اس کے علاوہ تہذیبوں اور مذہبوں کے مطالعہ میں انھوں نے دوسرے علوم مثلاً لسانیات، علم الالسنہ، فلسفہ، تاریخ اور سماجی علوم سے بھی مدد لی، اور اس طرح علم الاستشراق کو ایک Irter disciplinary بنادیا۔

ہمیں ایسے مستشرقین کی علمی خدمات کا اعتراف ہے، لیکن ہمیں اس کا افسوس ہے کہ ان کے علمی کارناموں کی جو کوئی لحاظ سے قابلِ قدر ہیں، سب سے بڑی کمزوری ان کی موضوعیت اور داخلیت ہے، انھوں نے دعویٰ تو کیا معروضی مطالعہ کا، لیکن حقیقت میں ان میں شاید ایک بھی ایسا نہیں جو اپنے ذہنی تحفظات اور مذہبی وتہذیبی تعصبات سے اپنا دامن محفوظ رکھ سکا ہو، خاص طور پر اسلام، قانون اسلام، قرآن اور پیغمبر اسلام سے متعلق ان کے مطالعات غیر معروضی ہی نہیں، بلکہ اکثر مصنفین کے یہاں ان کا تعصب بھی صاف طور پر نمایاں ہے۔

مستشرقین میں عیسائی بھی ہیں اور یہودی بھی، لیکن عیسائیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، اور اس کے تاریخی د

سیاسی اسباب ہیں، یہ لوگ اسلام اور پیغمبرؐ اسلام سے نفرت اور تعصب کی جن روایات کے وارث ہیں، ان کی داستان صدیوں پُرانی ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ یہ داستان چودہ سو برس پر پھیلی ہوئی ہے، اس میں کئی اُتار چڑھاؤ ہیں، اس کے کردار بدلتے رہے ہیں، اس کے پلاٹ میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، لیکن داستان کا بنیادی نکتہ ایک اور صرف ایک رہا ہے۔

بیسویں صدی کے تیسرے دہے سے، اور خاص طور پر دوسری جنگ عظیم کے بعد مستشرقین کے رویے میں خاصی تبدیلی ہوئی ہے، اس تبدیلی کے سیاسی و معاشی اسباب ہیں، لیکن اس زمانہ میں علم الاستشراق یعنی اورینٹلزم کا علمی اعتبار سے انحطاط بھی ہوا ہے، اور اب ایسے عالم مستشرق نہیں ملتے جیسے کہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے اوائل میں تھے، بس ایک سنجیدہ اور بردبار مستشرق نظر آتا ہے جس کا علم بھی گہرا ہے اور نظر بھی دقیق ہے، لیکن وہ بھی مکمل طور پر غیر جانبدار نہیں ہے، اور ان کی بعض تحریروں میں ان نظریات و تصورات کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو اسے اس شعبۂ علم میں اپنے پیشروؤں سے ورثہ میں ملے ہیں، ہماری مراد سر ہیملٹن الیگزنڈر روسکین گب سے ہے جو علمی دنیا میں ایچ۔ اے۔ آر۔ گب کے نام سے مشہور ہیں اور یہی مقالہ کا موضوع ہیں۔

سر ہیملٹن گب ۲ر جنوری ۱۸۹۵ء کو اسکندریہ میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد ایک کمپنی میں ملازم تھے، ان کی تعلیم اسکاٹ لینڈ میں ایڈنبرا کے رائل ہائی اسکول اور ایڈنبرا یونیورسٹی میں ہوئی، ایڈنبرا یونیورسٹی میں وہ ۱۹۱۲ء میں داخل ہوئے، جہاں ان کے خاص مضامین سامی زبانیں یعنی عبرانی، عربی اور آرامی تھیں، پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو انھوں نے رائل فیلڈ آرٹیلری میں شامل ہو کر فرانس اور اٹلی میں فوجی خدمات انجام دیں، ۱۹۱۹ء میں انھیں ان کی درخواست پر یونیورسٹی سے زمانۂ جنگ کی ڈگری ملی، اور پھر وہ لندن کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں داخل ہوئے جہاں سے انھوں نے ۱۹۲۲ء میں عربی میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی، ۱۹۲۱ء ہی میں وہ سر تھامس آرنلڈ کی زیر نگرانی عربی کے لکچرر مقرر ہو گئے تھے، ۱۹۲۶ء میں انھوں نے مشرق وسطیٰ کا سفر کیا، جہاں وہ تقریباً ایک سال مقیم رہ کر جدید عربی ادب کا مطالعہ کرتے رہے، اس سے قبل وہ کئی مہینے شمالی افریقہ میں گذار چکے تھے، ۱۹۲۹ء میں وہ لندن یونیورسٹی میں تاریخ ادب عربی کے ریڈر مقرر ہوئے اور ۱۹۳۰ء میں آرنلڈ کے انتقال کے بعد وہ ان کے جانشین کی حیثیت سے اس شعبہ کے سربراہ بن گئے، آرنلڈ کے بعد وہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے انگریزی ایڈیٹر بھی مقرر ہوئے، اس حیثیت سے ۱۹۵۶ء تک

وہ اس انسائیکلوپیڈیا کی تالیف میں شریک رہے، اس کے دونوں ایڈیشنوں میں ان کے بہت سے مضامین شامل ہیں، لندن یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں وہ ۱۹۳۷ء تک رہے، اسی سال وہ عربی کے پروفیسر ہو کر آکسفورڈ چلے گئے جہاں ان کا قیام ۱۹۵۵ء میں امریکہ کی مشہور یونیورسٹی ہارورڈ نے انھیں عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے بلایا، اس خیال سے کہ امریکہ میں مشرق وسطیٰ سے متعلق علاقائی مطالعات کے وسیع امکانات ہیں، انھوں نے ہارورڈ یونیورسٹی کی پیش کش کو قبول کر لیا، ۱۹۵۷ء میں وہ ہارورڈ یونیورسٹی میں مڈل ایسٹرن اسٹڈیز سینٹر کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے، ۱۹۶۴ء میں وہ عربی کی پروفیسر شپ سے تو ریٹائر ہو گئے، لیکن سنٹر کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے، اسی سال وہ سخت بیمار پڑے اور ان پر فالج کا حملہ ہوا، اس کے بعد زندگی کے باقی دن انھوں نے آکسفورڈ میں گذارے جہاں ان کی اہلیہ لیڈی گب نے ۱۹۶۹ء تک، کہ اسی سال لیڈی گب کا انتقال ہوا، ان کی خدمت گذار اور تیمار دار تھیں، لیڈی گب کی وفات کے بعد کوئی دو سال وہ اور زندہ رہے، لیکن یہ دو سال اُن پر بڑے سخت گذرے، تنہائی اور بے بسی کی زندگی، مفلوج زندگی، اب وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتے تھے، آخر ۲۲ راکتوبر ۱۹۷۱ء کو انھوں نے اس دنیا کو خیرباد کہا۔

علمی دنیا نے سر ہیملٹن گب کے علمی کارناموں کا خوب خوب اعتراف کیا، کئی اعزاز ان کو ملے، کئی علمی و ادبی سوسائٹیوں کے وہ ممبر رہے، لیکن ان سب کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں، البتہ شاید اس بات کا جاننا لوگوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہو کہ گب قاہرہ کی اکیڈمی آف لنگویج اور دمشق اور بغداد کی عربی اکاڈمیوں کے بھی ممبر تھے، گب نے خود کافی لکھا اور بہت سی کتابوں کے ریویوز بھی لکھے، ان کے مضامین کی فہرست بھی خاصی طویل ہے۔ یہاں ان کی خاص تصانیف کی فہرست، تاریخ طباعت کی ترتیب سے درج کی جاتی ہے:

(۱) The Arab Corquestin Central Asia(London,1923)

(۲) Arabic Literature(London)1926 Revised Edition Oxford.1963

(۳) Ibn Baltula, Travels in Asia and Africa(London, 1929.

(۴) Damascus Chronicles of the Crusades(London) 1932

(۵) Modern Trends in Islam (Chicago, 1947)

(۶) Mohammedenism (London, 1949)
اب تک اس کتاب کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

(۷) Islamic Society and the West, Vol.I (Part I) London 1950, Part II London, 1957, with H. Bowen

(۸) The Travels of Ibn Battuta (Cambridge, Vol.I 1958. Vol. II, 1961

(۹) Studies on the Civilization of Islam (edd. S.J. Shaw and W.R. Polk. Boston, 1962)

(۱۰) The Life of Saladin from the Works of Imadudd-in and Baha'ud-Din (Oxford, 1973)

مغرب میں سر ہیملٹن گب کے عقیدتمندوں نے انھیں صف اول کے اسلامک اسکالرز میں شمار کیا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے ان کی مراد مغرب کے ان علمائے محققین سے ہے جنھوں نے اسلام کے مطالعہ میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ صرف کیا۔ وہ مسلمان بھی ان کی محققانہ قابلیت اور مورخانہ ژرف بینی کے قائل ہیں جنھوں نے ان کی تصنیفات کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پروفیسر گب کی بعض کتابیں اور مضامین ان کے وسیع مطالعہ، تعبیر و تشریح کی بھرپور صلاحیت، فکر کی شادابی و تازگی اور گہری تاریخی بصیرت کے شاہد ہیں، ذیل میں ہم ان کے چند مضامین کے عنوانات درج کرتے ہیں، یہ مضامین تھوڑے تھوڑے وقفہ سے دنیا کے مشہور علمی مجلات میں شائع ہوئے اور ان کے مضامین کے گراں قدر مجموعے Studies on the Civilization of Islam میں شامل ہیں۔

(1) An Interpretation of Islamic History (2) Social Significance of the Shu'ubiya (3) The Evolution of Government in Early Islam. (4) The Armies of Saladin. (5) The Achievement of Saladin. (6) Al-Mawardis Theory of the Caliphate. (7) The Islamic

Background of Ibn-e-Khaldun's Political Theory
(8) The Structure of Religious Thought in Islam

ان کے علاوہ جدید عربی ادب کے ارتقاء پر بھی اُن کے بعض مضامین ہیں، جن میں جدید رجحانات سے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پروفیسر گب اپنے اکثر معاصر مستشرقین کے مقابلہ میں عربی زبان وادب سے کہیں زیادہ واقف تھے، بلکہ ان سے ایک گہرا تعلق بھی رکھتے تھے، ان کے ایک مضمون Islamic Biographical Literature (اسلامی سوانحی ادب) سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اسلام اور تاریخ اسلام کے مطالعات میں عربی ادب کے وقیع مطالعہ کو کتنی اہمیت دیتے تھے، وہ درحقیقت عربی زبان کے شیدائیوں میں تھے، اور عربی ادب کے شہ پاروں کے تخلیقی حسن کے بڑے قدردان تھے، مقدمۂ تاریخ ابن خلدون کوئی چالیس[1] برس تک ان کے فکر و نظر کی جولان گاہ رہا، اور وہ اس سے علم وآگہی اور مسرت وانبساط حاصل کرتے رہے، اس کے ادبی محاسن کا ذکر انھوں نے کچھ اس طرح کیا ہے:

"ابن خلدون کا تخیل جو ایک حیات آفریں، براہ راست اور رنگین درعنا شخصیت کا حامل ہے، معنوی عظمتوں کو چھوتا ہے، اس کی طلاقت لسانی سے فراوانی اور وفور کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے خیالات آبشار آسا بڑھتے ہیں مگر کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ پُرجوش بے ربطی کی نیم ظلمتوں میں کھو جاتے ہیں، لیکن ابن خلدون کی خوش وضع اور خوش آہنگ نثر بڑی حد تک انھیں مربوط رکھتی ہے، جملوں میں تراکیب اور فقروں کی چست اور نفیس تنظیم انھیں قابو میں رکھتی ہے، وہ اپنے خیالات کا اظہار ایک ایسی تربیت یافتہ شائستگی اور لطافت سے کرتا ہے کہ ہر لفظ معنوی طور پر اس کے دلائل کا تابع ہوتا ہے۔"

دراصل ہیملٹن گب کا خاص میدان تاریخ وتمدن تھا اور ان دونوں کے ارتقاء ونشوونما میں وہ زبان وادب کے رول کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے، لیکن تاریخ وتمدن کے موضوعات پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ہمیں ان کی تمام تعبیرات وتشریحات سے اتفاق نہیں ہے، اور بعض مقامات پر صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پہلے ہی سے کچھ نظریے

Historians of the Middle East (edd. B. Lewis and P. M. Holt, 1962), London, 1962. pp. 54-58.

قائم کر لیئے ہیں، اور واقعات کو وہ اپنے انہی نظریوں کی روشنی میں دیکھتے ہیں، مثلاً اپنے مضمون An Interpretation of Islamic History میں وہ پورے یقین کے ساتھ لکھتے ہیں کہ چونکہ ناگزیر معاشی محرکات نے عرب کے حالات نے استحکام کی کسی صورت کو تقریباً ناممکن بنا دیا تھا، اس لئے بادیہ نشین قبائل کی مخالفت کو فوجی طاقت کے ذریعہ دبا دینا مسئلہ کا مناسب اور مستقل حل نہیں ہو سکتا تھا، اس کے لئے ضروری تھا کہ ایسے حالات پیدا کئے جائیں جن میں عرب کے قبائل اگر اسلام میں پورے طور پر داخل نہ ہوں تو کم از کم اسلام سے اپنے دنیوی مفاد کو وابستہ سمجھیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کی سرداروں کی قیادت میں قبائل کو شام کی سرحدوں پر حملہ کے لئے بھیجا، مقصود گویا یہ دیکھنا تھا کہ اگر قبائل کی توجہ دوسرے ملکوں کی طرف پھیر دی جائے تو ان پر اس کا کیا ردِ عمل ہوگا، اس میں کامیابی ہوئی تو پھر جنگوں اور فتوحات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔[۱]

تعبیر کا یہ وہ انداز ہے جسے ہم سرتاسر معاشی و مادی انداز فکر کہتے ہیں، اس میں آپ کو دین اسلام کی انقلابی و اصلاحی تعلیمات کی تاریخ ساز کارفرمائی کہیں نظر نہیں آئے گی، یعنی یہ کہ بدوی قبائل نے اسلام کو اس کے اپنے انسانی و روحانی اصولوں کی بنا پر نہیں اپنایا، بلکہ جب انھوں نے دیکھا کہ اس سے ان کا دنیوی و معاشی مفاد وابستہ ہے تو اسلام سے انھیں تعلق پیدا ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے پہلے گب نے اپنے ذہن میں ایک کلیہ قائم کیا اور پھر شام و عراق میں اسلامی فتوحات کو اسی کلیہ کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی، ہمارے نزدیک یہ رویہ فن تاریخ نگاری کے جدید اصولوں کے مطابق بھی نہیں ہے، اس لئے کہ اس رویہ سے اسی تاریخی معروضیت کا وقار مجروح ہوتا ہے جس پر مغرب کے جدید محققین ناز کرتے ہیں۔

یہی رویہ گب کا حدیث کے بارے میں ہے، اسی مضمون میں وہ اپنے قاری کو حسن بیان اور اپنے مخصوص طرز استدلال سے مسحور کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری کے ختم ہوتے ہوتے چونکہ قانون اور اس کے نفاذ کا پُرپیچ مسئلہ پیدا ہو گیا تھا، اور صورت یہ تھی کہ خلافت کے مختلف شہروں اور صوبوں میں مقامی علماء اپنی اپنی فہم کے مطابق آزادانہ رائے دیتے تھے جو بسا اوقات باہم مختلف اور متضاد ہوتی تھیں اور اس پر مستزاد تھیں عرف و عادت اور انتظامی ضوابط سے پیدا ہونے والی پیچیدگیاں، اس لئے مذہبی رہنماؤں نے اس صورت حال کو خطرناک سمجھا، خاص طور پر جب مقامی قوانین قرآن کے اخلاقی اصولوں سے متصادم معلوم ہوتے ہیں، اس مسئلہ کا حل انھوں نے یہ ڈھونڈا کہ

---

[۱] Studies on the Civilization of Islam, London, 1962. p. 6.

پیغمبر اسلامؐ کے معاصرین کے واسطہ سے "احادیث" بیان کرنی شروع کر دیں، جن میں واضح مسائل سے متعلق حضرت محمدؐ سے روایتیں منقول ہوتی تھیں، اور پھر یہ کہا کہ ان احادیث کی پابندی ضروری ہے اور یہ کہ ان کی حیثیت آیات قرآنی سے بمشکل ہی کمتر قرار دی جا سکتی ہے، اسی سلسلہ میں آگے چل کر جہاں وہ حدیث اور علم حدیث کی تدوین کا ذکر کرتے ہیں تو وہ اسے علمائے حدیث کی مصنوعی تخلیق سے تعبیر کرتے ہیں، ہم یہ نہیں سمجھتے کہ پروفیسر گب حدیث لٹریچر کے ارتقاء سے قطعی ناواقف ہوں گے یا انھیں اس "اسوۂ حسنہ" کا علم نہ ہوگا جس کا واضح ذکر قرآن کریم میں ہے، اس لیے اس کے علاوہ اور کیا کہیئے کہ وہ اپنی مذکورۂ بالا تشریح اور "مصنوعی تخلیق" جیسے الفاظ و تراکیب سے حدیث کے اس دینی وزن اور تشریعی اہمیت کو اپنے مسلمان قاریوں کی نظر میں کم کرنا چاہتے ہیں جو ان کے دل میں اپنے محبوب پیغمبرؐ سے اس کی اٹوٹ نسبت کی وجہ سے جاگزیں ہے اور جو گذشتہ چودہ سو برس میں اسلامی مذہبی ثقافت کے تسلسل و ارتقاء میں بنیادی حیثیت کی حامل رہی ہے۔

دوسری بات یہ کہ پروفیسر گب نے اپنے طریقہ سے وہی نقطۂ نظر دہرایا ہے جو حدیث کے سلسلہ میں گولڈ تسیہر، مارگولیتھ اور لیمنس وغیرہ کا تھا اور جس کی کمزوریاں مسلمان علماء و محققین پہلے ہی واشگاف کر چکے ہیں[1]۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ پروفیسر گب کو سلطان صلاح الدین ایوبی کی شخصیت سے گہرا شغف تھا، انھوں نے بارہویں صدی عیسوی کی اس پرکشش اور غیر معمولی اسلامی شخصیت کا گہرا مطالعہ کیا اور ہر پہلو سے کیا The armies of Saladin کے عنوان سے ان کے مضامین جدید طرز کی تحقیق و تفحص کے اعلیٰ معیار کے نمونے ہیں، جہاں تک ہمیں علم ہے اس موضوع پر اس دور کے مسلمان عالموں اور دانشوروں میں اس پایے کی تحقیق کا سراغ نہیں ملتا، لیکن سلطان صلاح الدین پر گب کا معرکۃ الآراء مضمون The Achievement of Saladin کے عنوان سے ہے، اس مضمون میں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ صلاح الدین ایوبی ایسی شخصیتوں میں سے نہیں تھے جو محض اپنے گرد و پیش کے حالات کی پروردہ ہوتی ہیں، بلکہ انھوں نے خود ایک بڑے مقصد کے لئے اپنی دینی اخلاق کے سہارے نہ صرف حالات کو اپنے موافق بنایا، بلکہ نئے حالات پیدا کئے، اور سیاسی انحطاط اور اخلاقی زوال کے اس عہد میں اسلام اور مسلمانوں کی آبرو باقی رکھی۔

---

[1] دیکھئے: سیرۃ النبیؐ جلد [illegible] نعمانیؒ، مقالات سلیمانی جلد دوم از سید سلیمان ندویؒ اور اسلام از فضل الرحمن (لندن، ۱۹۶۶)

پروفیسر گب نے لکھا ہے کہ عہد وسطیٰ کی تاریخ سے متعلق شاذ و نادر ہی ایسے مستند ماخذ ملتے ہیں جن کی مدد سے صحیح اور مثبت نتیجے نکالے جا سکیں اور جو تاریخی تنقید کے سخت سے سخت معیار پر بھی کھرے ثابت ہوں گے، سلطان صلاح الدین کی زندگی اور کارناموں سے متعلق خوش قسمتی سے عربی زبان میں اسی زمانہ کے پانچ مراجع دستیاب ہیں، ابن ابی طے، ابن الاثیر (الکامل فی التاریخ) قاضی بہاء الدین ابن شداد (النوادر السلطانیۃ) عماد الدین (البرق الشامی) اور القاضی الفاضل، گب نے ان پانچوں کی کتابوں اور تحریروں کو ہر پہلو سے جانچا ہے اور ان کی خوبیوں اور کمزوریوں کو تحقیق کے اعلیٰ معیار پر پرکھا ہے، ان مراجع میں وہ بہاء الدین، عماد الدین اور القاضی الفاضل کی تحریروں کو جو سلطان سے بہت قریب اور اس کی زندگی کے ہر گوشہ سے واقف تھے، سب سے زیادہ اہم قرار دیتے ہیں، اور انہی سے استفادہ کر کے وہ اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ صدیوں بعد یہ دیکھنے میں آیا کہ ایک مسلم حکمراں مسلسل تین سال تک میدان جنگ میں اپنی افواج کے ساتھ اپنے ایک مستعد دشمن کے مقابلہ میں ڈٹا رہا، جب کہ اس عہد کا فیوڈل فوجی نظام ایسی طویل جنگ کا بمشکل متحمل ہو سکتا تھا،[1] اور ان کے خیال میں یہ صورت صرف اس وجہ سے ممکن ہو سکی کہ باوجود اس کے کہ سلطان صلاح الدین کوئی بڑے ماہر جنگ یا تجربہ کار حکمراں نہ تھے، وہی ایک ایسی شخصیت تھی جو صلیبی حملہ آوروں کے خلاف مسلمانوں کے مختلف النوع عناصر اور ان کی باہم متصادم سیاسی قوتوں کو اتحاد اسلامی کے لئے ایک مرکز پر متحد و مجتمع کر سکتی تھی، ہمت و شجاعت اور صبر و استقامت، ان سب اخلاقی خوبیوں سے تو وہ متصف تھے ہی، اور یہ سب ان کے کام بھی آئیں، لیکن ان کی کامیابی میں ان خوبیوں سے زیادہ دخل تھا ان کی بے غرضی و بے لوثی، سخاوت و فیاضی اور اخلاق اسلامی کے اثبات برتری کو، جنھیں سلطان صلاح الدین نے دوست اور دشمن سبھی کے ساتھ یکساں برتا، وہ سادہ لوح نہ تھے لیکن ان میں غضب کا انکسار اور سادگی تھی، ان کی ایمانداری بے داغ تھی اور بلور کی سی چمک رکھتی تھی ان کے دشمن حیران تھے کہ ان کی اس بات پر کہ سیاست اور جنگ دونوں میدانوں میں ان کے عزائم اور ان کے طور طریقے کیوں مختلف ہیں، مکر و فریب سے وہ کوسوں دور تھے اور دوسروں کے مکر و فریب کو شاذ ہی سمجھ پاتے تھے، ان کے اسلامی اخلاق نے انھیں معاہدوں کا احترام سکھایا تھا، وہ ہر قیمت پر معاہدوں اور وعدوں کی پابندی کرتے تھے، اور معاہدہ توڑنے والے دشمن کو ہمہ وقت یہ خیال رہتا تھا کہ اسے عہد شکنی کی بھاری قیمت ادا کرنی ہوگی[2]

---

1. Studies on the Civilization of Islam, p. 104
2. Studies on the Civilization of Islam, p. 99.

ہمارا خیال ہے کہ شاید ہی کسی عیسائی مورخ یا سوانح نگار نے مستند معاصر ماخذوں کی اچھی طرح چھان بین کر کے بعد اور تاریخی تنقید کے سارے اصولوں کو برت کر سلطان صلاح الدین کی ایسی خوبصورت اور سچی تصویر پیش کی ہو۔ لیکن تاریخ و ادب سے ہٹ کر جب پروفیسر گب قرآن پاک اور سیرت رسول ﷺ کے موضوع پر لکھتے ہیں تو اکثر مقامات پر وہ اپنی تاریخی بصیرت اور علمی معروضیت سے بے وفائی کرتے نظر آتے ہیں، ان کے اس رویہ کی توجیہ اسکے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے مذہبی عقائد اور اس میدان میں تعصب اور جانبداری کی وہ روایات جو انھیں اپنے علمی ماحول اور اپنے پیش روؤں سے ورثہ میں ملی تھیں، ان کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔

قبل اس کے کہ دو تین مثالوں سے ہم اپنے اس خیال کی وضاحت کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کا ایک قول یہاں نقل کر دیں، اپنی کتاب Modern Trends in Islam کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں کہ

"ان استعاروں سے جن میں عیسائی عقیدہ روایتی طور پر محفوظ ہے، ذہنی طور پر میری تشفی ہو جاتی ہے، کیونکہ یہ استعارے اور علامتیں روحانی صداقت کی ان بلند ترین عظمتوں کی ترجمان ہیں جہاں تک میری فہم کی رسائی ہے، بشرطیکہ ان علامتوں اور استعاروں کی تشریح ایسی زبان میں کی جائے جس سے کسی تجسیمی و تشبیہی عقیدے کا اظہار نہ ہوتا ہو، بلکہ ایسے عمومی تصورات کی صورت میں ان کا بیان ہو جو کائنات سے متعلق ہمارے بدلتے ہوئے نظریوں سے مطابقت رکھتے ہوں[1]"

قطع نظر اس کے کہ گب کے اس قول کے حقیقی مالہ او رما علیہ کیا ہیں، اتنی بات صاف ہے کہ وہ عقیدۃ پکے عیسائی تھے، اور ہمارے نزدیک انھیں اس کا حق تھا کہ جس عقیدہ میں انھیں ذہنی و روحانی تسکین حاصل تھی، اسے وہ اپناتے، یہ بات خوشی کی ہے کہ وہ مسلمانوں کو بھی اس کا حق دیتے تھے، اور اسی لئے ان سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ مسلمانوں کے عقائد اور حضور ﷺ کی سیرت اقدس پر لکھتے وقت انصاف سے کام لیں گے، ہمارا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں انکی عیسائیت تاریخی معروضیت اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی اس بنیادی خصوصیت پر غالب آگئی جسے آج سے صدیوں پہلے ایک مسلمان عالم اور دانشور ابوریحان البیرونی نے الآثار الباقیہ اور کتاب الہند کی تصنیف کے سلسلہ میں اپنایا تھا۔ دوسروں کے مذہبی عقائد اور مذہبی روایات کے موضوعات پر لکھنے کی آزادی ہے، کسی ایک خاص مذہب کا پیرو دوسرے مذاہب کا مطالعہ کر سکتا ہے اور اپنے مطالعہ کے نتائج قلمبند بھی کر سکتا ہے، لیکن اس سلسلہ میں تصنیف

1. Modern Trends in Islam, Chicago, 1945, p.XI

وتالیف کا اولین اور بنیادی اصول یہ ہونا چاہئے کہ پہلے زیر مطالعہ مذہب کے ماننے والوں کے عقائد پوری وضاحت کے ساتھ مکمل طور پر اس طرح بیان کر دیئے جائیں کہ اس شکایت کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے کہ ان کے عقائد کو غلط طور پر یا توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے، اب اگر لکھنے والا کسی اور نظریے یا عقیدے کا حامل ہے اور وہ اپنے نظریے یا کسی اور کے نظریے کا ذکر کرنا چاہتا ہے تو اسے اس کا حق حاصل ہے، لیکن اسے چاہئے کہ وہ اپنے یا کسی دوسرے کے نظریے کو الگ سے اور پوری وضاحت سے پیش کرے۔

افسوس ہے کہ مستشرقین قرآن پاک اور سیرت پر لکھتے وقت اس بنیادی اصول کو عموماً فراموش کر دیتے ہیں، اور کچھ اس طرح کا خلط مبحث کرتے ہیں کہ صرف وہی لوگ جن کا اسلام کا مطالعہ اچھا ہے، یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ لکھنے والا اپنے ذاتی خیال اور عقیدے کو اپنے قاریوں کے ذہن میں اتار دینا چاہتا ہے، حیرت ہے کہ پروفیسر گب جیسا بالغ نظر مصنف بھی جس کی علمیت و متانت کے بہت سے مسلمان بھی معترف ہیں، اپنا دامن اس عیب سے پاک نہ رکھ سکا۔

پروفیسر گب نے اسلام پر جو کتاب لکھی ہے، اس کا نام محمڈن ازم ہے، مارگولیتھ کی کتاب اسی نام سے ۱۹۱۱ء میں چھپی تھی، پروفیسر گب نے اس خیال سے کہ بقول ان کے ۱۹۱۱ء کی علمی فضا اور تھی، نظریے اور تھے، ذہنی وجذباتی تحدیدات مختلف تھے، اور چونکہ ہر دور کے ذہنی تحفظات و تعصبات کی پرچھائیں اس دور کی تحریروں میں باقی رہتی ہیں، خواہ ان سے بچنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے، اس لئے انھوں نے اسلام پر ایک نئی کتاب کا لکھنا ضروری سمجھا۔

وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ پسند نہیں کہ انھیں محمڈن اور اسلام کو محمڈن ازم کہا جائے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اسلام کو محمڈن ازم کہنا ضروری سمجھا، ان کے خیال میں ایسا کہنا غلط بھی نہیں، کیونکہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ مسلمان بڑے فخر سے اپنے آپ کو "امت محمدیہ" کہتے تھے، دوسرے یہ کہ جب مسلمان لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ کر اسلام پر اپنے یقین کا اقرار کرتے ہیں تو اس کلمہ کے دوسرے حصہ کی اہمیت ان کے ذہن میں اس کے تمام مضمرات کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ موجود رہتی ہے، کیونکہ کلمہ کے پہلے حصہ پر مسلمانوں کے علاوہ بہت سے غیر مسلموں کا بھی اعتقاد و ایمان ہو سکتا ہے، حضرت محمدؐ کے زمانہ سے لیکر اب تک کوئی ایسی مثال نہیں کہ اس کلمہ کے دوسرے حصہ کے منکرین کو کبھی مسلم کہا گیا ہو، یا انھیں اسلامی برادری کا رکن سمجھا گیا ہو، برخلاف اس کے راسخ العقیدہ شارحین اسلام کا موقف ہر دور میں یہی رہا ہے کہ کسی ایسے شخص کو جو علانیہ پورے کلمہ کا اقرار کرتا ہو، غیر مسلم نہیں کہا جا سکتا۔[۱]

دیکھا آپ نے، کتنی چابکدستی سے اور کتنے لطیف پیرایے میں پروفیسر گب نے محمڈن ازم کی اصطلاح کو برحق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اور حقیقت اس ضمن میں وہ مار گولیتھ ہی کے پیرو ہیں، اور ان دونوں کی کتابوں کے مشمولات میں بڑی حد تک یکسانیت بھی ہے، اس لئے ان کی اس بات کا کھوکھلا پن صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ مارگولیتھ کے زمانہ کی علمی فضا اور تھی اور آج کی اور ہے، مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ انھیں مسلم کہا جائے، لیکن کہا یہ جاتا ہے کہ محمڈن کہنا بھی بیجا اور غلط نہیں، قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کو ایک اور صرف ایک ماننے والے اور محمدؐ کو رسول اور آپؐ پر ختم نبوت کا اقرار کرنے والے "مسلم" ہیں، لیکن پروفیسر گب اپنے مسلم اور غیر مسلم قاریوں کو یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کے لئے محمڈن ازم اور مسلم کے لئے محمڈن کی اصطلاح بھی صحیح ہے، دراصل یہ وہی تعصب اور اسلام کو مسخ کر کے پیش کرنے کا جذبہ ہے جو صدیوں سے عیسائی دنیا پر مسلط ہے، اور کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

اپنی اس کتاب کے پہلے ہی صفحہ پر پروفیسر گب یہ کہتے ہیں کہ "اسلام" کا لفظ حضرت محمدؐ نے بعد میں اپنے مذہب کے امتیازی نام کے طور پر اختیار کیا، دراصل ان کا یہ نظریہ ان کی اس بحث کا پیش خیمہ ہے جو انھوں نے کتاب کے تیسرے باب میں جس کا عنوان "قرآن" ہے، اٹھائی ہے، یہ بتاتے ہوئے کہ کس طرح پیغمبرؐ اسلام کے ذہن میں نظریۂ توحید کا ارتقار ہوا ہو گا، ان کا کہنا ہے کہ قرآن میں توحید کا جو نظریہ پیش کیا گیا ہے، اس کا تعلق درحقیقت ان "حنفاء" کے اعتقاد سے ہے جن کے بارے میں ہمیں کچھ زیادہ معلوم نہیں۔ حضرت محمدؐ نے اس پر فخر کیا اور اسے حضرت ابراہیمؑ سے ایک امتیازی شان کے ساتھ وابستہ کر دیا، قرآن کی اس آیت مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا کی ایک ابتدائی شکل (قرارت: Reading) میں جو اس سے مختلف تھی، اس بات کا اشارہ موجود تھا کہ حضرت محمدؐ جس عقیدہ کی تبلیغ کرتے تھے اس کے لئے حنیفیہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو بعد میں ہوا کہ حنیفیہ کی جگہ اسلام نے لے لی[1]

بیان القرآن (طبری) تفسیر کبیر (رازی) درالمنثور (سیوطی)، روح المعانی (آلوسی) اور فتح البیان (صدیق حسن قنوجی) میں سے کسی میں بھی آیت مذکورہ کی کسی مختلف قرارت Varient Reading کا سراغ نہیں ملا، اور خود پروفیسر موصوف نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، ایسی صورت میں جہاں تک ہم سمجھتے ہیں کسی کمزور روایت کا سہارا لے کر یا خود اپنے طور پر پروفیسر گب نے یہ قیاس آرائی کی ہے کہ پہلے حضرت محمدؐ نے اپنے عقیدۂ توحید کو حنیفیۃ

[1] Mohammedanism p. 38.

سے تعبیر کیا اور بعد میں اسلام کہا۔

درحقیقت تخیل کا یہ سارا فساد اس لئے ہے کہ پروفیسر گب قرآن کریم کو وحی الٰہی کے بجائے پیغمبرؐ اسلام کی تصنیف سمجھتے ہیں، چنانچہ محمڈن ازم کے تیسرے باب کا آغاز ہی اس جملہ سے ہوتا ہے :-

The Koran is the record of those formal utterances and disconses which Mohemmed and his followers accepted as directly inspired.[1]

جس سے مغرب کی علمی دنیا میں سائنٹفک تاریخی اصول تحقیق کا چرچا ہوا، اُس وقت سے مستشرقین یہ ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں کہ قرآن کریم کی اساس یہودی و نصرانی روایات ہیں، پروفیسر گب نے بھی مختلف انداز سے یہی بات کہی ہے غرض پچھلے دو تین سو برس کی طویل مدت میں اس سلسلہ میں بڑی بڑی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں، اور ان قیاس آرائیوں سے دوررس تاریخی ادبی اور دینیاتی نتائج نکالے گئے ہیں، اور پھر اس مفروضے اور ان نتائج کو اتنی بار دہرایا گیا ہے کہ انھیں حقیقت و واقعیت کا مرتبہ حاصل ہو گیا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج بھی یہ مفروضہ ویسے ہی ایک مفروضہ ہے جیسے دو سال پہلے تھا۔

کیسی عجیب بات ہے کہ ایک طویل عرصہ تک تمام ذہنی و مادی وسائل کے ساتھ تاریخی تنقید و تحقیق کے جدید اصول کو برت کر عیسائی دنیا اس بات کا کوئی قطعی اور فیصلہ کن ثبوت فراہم نہ کر سکی کہ قرآن کریم پیغمبرؐ اسلام کی تالیف ہے، جسے آپؐ نے یہودی و عیسائی روایات سے استفادہ کر کے اور توراۃ و انجیل سے بہت کچھ مستعار لے کر مرتب کیا، اس سلسلہ میں ہمارے نزدیک اگر کوئی معاصر اور زندہ شہادت ہے تو وہ خود قرآن کی ہے، جس سے اس طرح کا کوئی امکان خارج از بحث قرار پاتا ہے، تاریخی تنقید و تحقیق کے مستند اور جدید اصول کے مطابق اس بولتی ہوئی معاصر دستاویزی شہادت کو جس کے علاوہ اس مرتبہ کی کوئی اور شہادت موجود نہیں، تمام لایعنی قیاس آرائیوں سے بالاتر اور یقینی سمجھنا چاہئے، لیکن مستشرقین اس زندہ حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، کیونکہ اس سے ان کے نظریے اور عقیدے کی مکمل طور پر نفی اور تردید ہوتی ہے۔

رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کی پوری تفصیلات موجود ہیں، کسی دوسرے نبیؑ یا دنیا کی بڑی سے بڑی شخصیت کے حالات ہمیں اتنی تفصیل سے نہیں معلوم ہیں، لیکن پروفیسر گب اس سلسلہ میں اپنے قارئین کو شبہہ میں مبتلا کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اس لئے وہ بڑی چابکدستی سے آپؐ کے بچپن سے لے کر بعثت تک کے حالات و واقعات نظر انداز کر دیتے ہیں، بعثت سے

1. Mohemmedanism p.33

قبل کی آپؐ کی پاک صاف زندگی، بے مثال امانت و دیانت، دانشمندی و بصیرت، اہل مکہ کی اخلاقی پستی پر آپؐ کی غمگینی و دلسوزی، کمزوروں، مظلوموں، مسافروں اور اجنبیوں کی بیکسی و بے بسی پر آپ کا جذبۂ دردمندی اور گرد و پیش کے عمومی حالات پر آپؐ کی روحانی بے چینی ان سب باتوں میں آپ کی انسانی عظمت کے کوئی آثار انھیں نظر نہیں آتے، اور تاریخی معروضیت کے تمام تر بلند بانگ دعووں کے باوجود بالکل مارگولیتھ کے انداز پر پروفیسر گب کو یہ کہنے میں کوئی عار نہیں "پیغمبر اسلام کی شروع کی زندگی اور حالات سے متعلق ہمیں یقین کے ساتھ کچھ معلوم نہیں"[2] اور یہ کہ "ان کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ وہ مکہ کے رہنے والے تھے"[3] ع ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے۔

اب جب پروفیسر گب جیسے شریف طبیعت اور سنجیدہ عالم کو جن کا شمار صف اول کے مستشرقین میں کیا جاتا ہے اور جن کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام کا مطالعہ ایک ایسے عیسائی کی حیثیت سے کرتے تھے جسے دونوں مذاہب میں مشترک روحانی اقدار کی تلاش تھی، قرآن پاک کو یہودی عیسائی روایات سے مستعار سمجھنے اور وحی نہ ماننے پر اصرار ہو، پیغمبر اسلام کی سیرت میں انسانی و روحانی عظمت کا کوئی پہلو نظر نہ آتا ہو، تصور وحی، منصب نبوت اور شعور نبوت سے متعلق اسلامی موقف کا کوئی شعور نہ ہو تو بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دوسری صف کے مستشرقین مثلاً گیلوم روزنتھال برنارڈ لویس B. Lewis گرونے بام Grunebaum منٹگمری واٹ M. Walh اینڈرسن Anderson. جوزف شاخت J. Schacht اور کینتھ کریگ K. Cragg وغیرہم نے قرآن پاک اور سیرت اقدس سے متعلق کیا کیا گل افشانیاں کی ہوں گی۔

Guillaume Rosenthal

---

1. Morgoliouth, Mohammadenism, London, 1911. p. 51-52
2. Mohammadenism. p. 24. 3. Ibid. p. 25.

مستشرقین کے تصور اسلام کا تاریخی پس منظر

از

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی۔ دہلی یونیورسٹی

مشرق اور مغرب کا سابقہ، تاریخ کا نہایت مہتم بالشان واقعہ ہے، اس آویزش و پیکار کا اصلی سبب کیا تھا؟ ہیرڈوٹس سے لیکر اس وقت تک تمام محققین اور مورخین نے اس کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ابھی تک اس کا کوئی شافی جواب نہیں مل سکا ہے، اصل میں اس کا جواب ہو بھی نہیں سکتا، مشرق و مغرب کی پیکار صرف ایک جغرافیائی سادہ بیانی ہے، ورنہ اس کی سطح کے نیچے بہت سے پریچ اسباب چھپے ہوئے ہیں، جو نژادی اور نسلی بھی ہیں، علاقائی بھی، سیاسی بھی، مذہبی بھی، نفسیاتی بھی، اقتصادی بھی اور نظریاتی بھی۔ ...... اسی لئے ان اختلافات نے ہر عہد اور ہر زمانہ میں ایک نئی شکل اختیار کرلی ہے، ان ہی معرکوں میں وہ زبردست کش مکش نظر آتی ہے، جو صدیوں سے اقوامِ مغرب کی تہذیب و کلیسا، اور اسلام کے درمیان رہی ہے، اور جس کی ابتدا، ہیروکلس کی شکست سے ہوتی ہے، جو اس کو مسلمانوں سے یرموک کے مقام پر ۶۳۶ء میں اٹھانا پڑی، یہ آویزش کب ختم ہوگی، اس کا جواب بھی آسان نہیں ہے۔

اسلام جس برق رفتاری سے پھیلا ہے، اس کی مثال بھی تاریخِ عالم میں نہیں مل سکتی ہے، بہت جلد اس نے شام و مصر سے لیکر فرانس کے پایرنیز تک تمام ملکوں پر قبضہ کرلیا تھا، پھر نیل کے ساحل سے لیکر تا بہ خاک کاشغر ۷۱۱ء میں مسلمان اسپین اور ۷۱۲ء میں ہندوستان تک پہونچ گئے تھے، اسپین میں قدم جمانے کے بعد انھوں نے پراوانس، اٹلی اور سوئٹزرلینڈ پر حملے کئے اور اطالیہ اور فرانس پر اپنا تہذیبی اثر قائم کیا۔

قرطبہ کے فلسفہ اور ابنِ رشد کے افکارِ تازہ پر پیرس یونیورسٹی میں بحثیں ہوتی تھیں، عربوں کا فن تعمیر، عربوں کی سائنس، عربوں کا علم ہندسہ و جغرافیہ اور عربوں کی شاعری نے فکر و خیال اور زبان و بیان کو اتنا متاثر کیا کہ

ئن سے یورپ میں نشاۃ الثانیہ کا دور شروع ہوا۔

۱۰۹۶ء سے لیکر ۱۲۹۱ء تک صلیبی جنگیں بھی کسی نہ کسی شکل میں جاری رہیں، جن کی بدولت مشرق و مغرب میں شدید تصادم بھی ہوا اور پھر امتزاج بھی، مغرب نے مشرق کے اثرات قبول کئے اور اس کے علمی خزانہ سے استفادہ کیا، اور ان تمام اسباب و عوامل نے مل کر جدید یورپ کی تشکیل کی، جو نشاۃ الثانیہ دور اصلاح اور ایجاد و دریافت سے عبارت ہے۔

بحیرۂ روم کے مشرق میں بھی کم و بیش یہی صورت تھی، ۱۴۰۰ء سے ۱۵۵۰ء تک اسلام اور عیسائیت میں مسلسل آویزش رہی، مسلمان اپنے ولولہ انگیز مذہب، اپنی فصیح و بلیغ مذہبی زبان اور اپنی ہمہ گیر تہذیب کی بدولت تمام ایشیا اور افریقہ و یورپ پر چھا گئے تھے عثمانی ترک قسطنطنیہ (۱۴۵۳ء) پراگ، اور وائینا ۱۵۲۹ء تک پہنچ گئے تھے، ۱۵۲۶ء میں ہنگری ان کی مملکت میں شامل ہو گیا تھا، اور اسی سنہ میں ہندوستان میں بابر نے سلطنت مغلیہ کی بنیاد ڈالی اور ان کی حکومت بڈاپسٹ سے لیکر بنگال تک قائم ہو گئی، اور تجارت کے بیشتر بحری اور بری راستے ان کے قبضہ میں آ گئے، مصر، یورپ اور ایشیا کے درمیان دیوار بنا ہوا تھا، پانچویں صلیبی جنگ اسی کو لینے کے لئے لڑی گئی تھی، لیکن اس میں عیسائیوں کو ناکامی ہوئی، بحیرۂ ہند میں جو اب تک عربوں کی جھیل سی معلوم ہوتی تھی ان کا اقتدار تھا، ۱۴۹۸ء میں پرتگالیوں نے ہندوستان کا بحری راستہ معلوم کر کے عربوں کے اس بحری اقتدار اور تجارت کو سخت نقصان پہنچایا اور اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ مصر کی اقتصادی حالت تباہ ہو گئی۔ ترکوں اور مصریوں نے مل کر بحیرۂ ہند میں پرتگالیوں کی بحری قوت کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی (۱۵۳۸ء) ترک بار بار کہتے تھے، کہ "اللہ نے زمین تو ہمیں دے دی ہے، لیکن سمندر عیسائیوں کو بخش دیا ہے" اس وقت ترک سلاطین ہندوستان کے مغل بادشاہ اور قلمرو ایران کے صفوی حکمران یہ تینوں بڑی طاقتیں اس لائق نہیں تھیں کہ یورپ کی بحری قوت کا بحر ہند یا بحر اوقیانوس میں مقابلہ کر سکتیں، یورپ کو ایک نیا راستہ ہی نہیں، امریکہ کا ایک نیا براعظم بھی مل گیا تھا

پرتگال کو مسلمانوں سے جو عداوت رہی اس کو اس زمانہ کے تاریخی حالات کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے صلیبی جنگوں سے جو کدورت اور دشمنی کا جذبہ پیدا ہوا تھا، وہ جزیرہ نمائے [illegible] میں پندرھویں اور سولھویں صدی کے اندر تیز تر ہو گیا، اس کی ایک تو وجہ یہ تھی کہ مسلمان اسپین میں طاقتور حکمران کی حیثیت سے موجود تھے، اور

پرتگال کو اُن سے ہر وقت ڈر رہتا تھا کہ وہ بھی ضم نہ ہو جائیں، ان سے جنگ، مذہبی ضرورت بھی تھی، اور ملکی مصلحتیں بھی اس لڑائی کی متقاضی تھیں۔

یورپ کے بحری اقتدار سے تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے، رفتہ رفتہ ان کی حاکمیت، ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصوں میں قائم ہوگئی، اور سیاسی اور اقتصادی استحصال کے لئے ان کو بڑے بڑے ملک مل گئے، اطالوی اور فرانسیسی، شمالی افریقہ میں حکمراں تھے، جرمن ترکی میں بڑھ رہے تھے، روسی وسط ایشیا کو زیر و زبر کر رہے تھے اور ہندوستان، مصر اور عراق میں تاحدّ نظر، برطانوی اقتدار کا پرچم لہرا رہا تھا، اسی نقطہ سے مسلمانوں کا زوال اور یورپ کا عروج شروع ہوتا ہے۔

یورپ کی یہ توسیع سرتاسر مسلمانوں کے خلاف تھی، ان کی کمزوری ہی پر جو ۱۸۰۰ء سے ۱۹۱۰ء تک اپنی آخری حدوں کو پہنچ گئی تھی، یورپ کی ترقی کا محل تیار ہوا تھا، اس بات کے اعادے میں بھی مضائقہ نہیں کہ یورپ کی ترقی سے پہلے مسلمانوں کی سلطنت، ایشیا اور افریقہ میں پھیلی ہوئی تھی، اور اسی لئے یورپ کی توسیع پسندی اور سامراجیت کا خاص ہدف ایشیا اور افریقہ کے مسلمان ممالک تھے۔

اقوامِ یورپ نے اپنی حاکمانہ اور اقتصادی گرفت کو [illegible] طریقوں سے مضبوط کیا، جس کی تفصیل آگے آئے گی، اس وقت یہ اشارہ کافی ہے کہ مشرق میں قدیم و جدید، سائنس اور مذہب اور اسلام اور عیسائیت کی آویزش، خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی، اور اس نے پوری پوری آبادیوں کو جڑوں سے اکھاڑ دیا تھا، اس وقت ایشیا کا سیاسی، مادی اور اخلاقی تنزل انتہا کو پہنچ چکا تھا، یہاں اگر کچھ رہ گیا تھا تو صرف اوہام کا تار و پود۔ قوائے عمل شل ہو گئے تھے اور شعلۂ حیات سرد ہو رہا تھا۔ اور منفی طرز فکر نے اُن کو بے عمل بے ذوق، کاہل اور ناکارہ بنا دیا تھا۔ یورپ کا یہ حملہ صرف بحر و بر ہی پر نہیں تھا، یہ حملہ اُن کے عقائد، ان کے فلسفہ، ان کی روایات، ان کی تاریخ، ان کی بلند ترین شخصیتوں پر بھی تھا، ۱۸۵۷ء کے بعد تو بقول ٹوئن بی "مغرب کا تیر مشرق کی روح میں پوری طرح پیوست ہو گیا تھا"، اور وہ مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہے تھے، چند غیر معمولی اشخاص کو چھوڑ کر، سب ہی پر یاس و الم کے بادل چھا گئے تھے، شاعر جنازہ بردوش عالم تقلید پرست اور ذوق و جستجو سے عاری، صوفی، فنا کے راستہ میں مستغرق، استاذ تکوینی جوہر سے ناآشنا اور نئی تقاضوں سے یکسر بے خبر۔

مشرق کے خلاف، یورپ کی جارحیت ہمہ جہت تھی، ان کے حملے صرف فوجوں کے ذریعہ نہیں ہوئے، اس میں ان کے دانشور مستشرقین، اہلِ فکر، شعراء، علماء، اور اساتذہ بھی شامل تھے، اسی لئے اقبال نے مغربی مدرسوں کی کورنگاہی اور بے ذوقی کی شکایت کی ہے۔

ع نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

مغربی اثرات کے چیلنج کا ردعمل، مشرق پر ایک دائرہ کی شکل میں رونما ہوا جس میں رد و قبول، تقلید، ایجاد تنقیدی فکر اور بہترین اقدار کا انتخاب اور اعتماد کے ساتھ، اپنی صالح مشرقیت پر جمے رہنے کا انداز کارفرما ہے، لیکن مغرب نے نئے دام بچھائے تھے اور ایک ایسی نسل کو تیار کیا تھا، جو اپنی ذہنیت اور مرعوبیت میں بالکل مغرب زدہ اور مشرق سے بیزار تھی، دراصل اہلِ کلیسا کا یہ نظامِ تعلیم اقبال کے الفاظ میں :-

ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اقبال نے علامہ سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں صراحت سے لکھا ہے، کہ لندن میں مشرقی و افریقی علوم کا ادارہ صرف برطانوی سامراجیت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے، اسی قسم کے خیالات انھوں نے حافظ فضل الرحمٰن انصاری کے نام ایک خط میں ظاہر کئے ہیں :-

"جہاں تک اسلامی ریسرچ کا تعلق ہے۔ فرانس، جرمنی انگلستان اور اٹلی کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے مقاصد خاص ہیں، جن کو عالمانہ تحقیق اور احقاقِ حق کے ظاہری طلسم میں چھپایا جاتا ہے، سادہ لوح، مسلمان طالب علم اس طلسم میں گرفتار ہو کر گمراہ ہو جاتا ہے"

اقبال کو افسوس تھا کہ مغربی کالجوں کے پڑھے ہوئے مسلمان نوجوان، روحانی اعتبار سے فرومایہ ہیں ان کی نظر مساواتِ شکم سے آگے نہیں جاتی، وہ روح کو معدہ میں تلاش کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ روح کی قوت و حیات کا جسم سے کوئی تعلق نہیں، یہ اور اس کے بہت سے خیالات اُن مغربی دانش وروں کے ذریعہ پھیلے، جن کے آگے زانوئے تلمذ تہ کئے بغیر ترقی ممکن نہیں تھی۔

جب اقوامِ مغرب نے مشرق کا بحری راستہ معلوم کیا اور مشرق پر اپنی حاکمیت قائم کرنا شروع کی تو اس کی ضرورت بھی محسوس کی کہ ان کی زبانوں کو، اُن کے مذاہب کو اور ان کی تہذیب و تمدن کو سمجھیں، اور ان کو اپنے ڈھنگ میں

رنگ میں اس طرح پیش کریں کہ مغرب مقابلۃً اعلیٰ وارفع نظر آئے اور ان کی صنعت وحرفت اور سامان تجارت بہتر ٹھہرے۔

جن عالموں نے اس اقلیم میں قدم رکھا، وہ مستشرق کہلائے اور یورپ ایک نیا علم اورنٹیلزم کے نام سے وجود میں آگیا، یہ مشرق اورینٹ (ایسٹ نہیں) اصل میں مغرب کا زائیدۂ فکر ہے، جہاں تخیل ہی تخیل ہے، رومانس ہی رومانس ہے، اس میں شدید جلبیت ہے، عیش وعشرت کی بہتات ہے، بھوک اور بے رحمی ہے، اس کی میزان قدر میں قرآن پاک اہم نہیں ہے، الف لیلہ اہم ہے جو عربی ادبیات میں معمولی درجہ کی کتاب ہے، یہ مشرق مغرب کی مادی تہذیب کا حصہ بن گیا ہے، اس میں عجیب وغریب آدمی رہتے ہیں، نیم وحشی، نیم متمدن، نیم برہنہ، خواجہ سگ پرست بھی، نعمان سیاح بھی، زاہد بھی، رند بھی، اس مشرق کی دولت بے کراں ہے، اس کی خام پیداوار کے بغیر مغرب کے کارخانے نہیں چل سکتے، یہ مشرق تہذیب کا گہوارہ اور مذاہب کا سرچشمہ ہے، یہ مشرق، مغرب کے مادی مفادات کا مرکز ومحور ہے، اس مشرق کو یورپ نے سماجیاتی، فوجی، جنگی اور سیاسی طور پر پیدا کیا ہے اور اس پر اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، کہ ان سے ایک اچھا خاصا کتب خانہ تیار ہو سکتا ہے۔

اس مشرق کا جو کلیۃً مغربی تصورات اور مفادات کی پیداوار ہے، کچھ تھوڑا سا اندازہ دانتے کی مشہور و معروف نظم طربیۂ خداوندی سے ہو سکتا ہے، ۱۳۱۳ء اور ۱۳۲۱ء کے درمیان تصنیف ہوئی، اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ عہد وسطیٰ میں اہل یورپ، مشرق کے بالخصوص اسلام کے متعلق کیسے گھناؤنے تصورات رکھتے تھے، اور ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ عشق محمدؐ ان کے دل سے نکال دیں اس لئے کہ اسی آئیڈیل پر انکی عظمت قائم تھی، اس نظم نے یورپ کے ذہن وضمیر پر بے انتہا اثر ڈالا ہے اور اتنے ماہ وسال گزرنے کے بعد تو اسمیں تاریخ کی سی تقدیس اور سچائی پیدا ہو گئی ہے، طربیۂ خداوندی کے تین حصے ہیں، دوزخ، برزخ اور فردوس، دانتے مشرق ومغرب کی اہم شخصیتوں سے واقف تھا، مثلاً وہ ورجل، ہومر، ابن سینا اور ابن رشد سے واقف ہی اور مسلمانوں اور یہودیوں کی تاریخ سے بھی نا آشنا نہیں تھا، اس میں عیسائیوں کی کورنگی، تنگ دلی، اور عصبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، اس کا یہ ایمان ہے کہ مغفرت کے سزاوار صرف کیتھولک عیسائی ہیں، باقی سب دوزخ کا کندہ ہیں، دانتے نے دوزخ Inferno Canto 28 اور نویں طبقہ جہنم یعنی اقلیم عذاب

میں حضورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نعوذ باللہ بڑی ہی ہیبت ناک تصویر کھینچی ہے، نقلِ کفر، کفر نباشد، یہ دکھلایا ہے کہ شکم مبارک چاک ہے اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نعوذ باللہ انتڑیاں باہر نکلی ہوئی ہیں، اور وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جن کو خود نعوذ باللہ دو حصوں میں چیر دیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں دیکھو میری حالت، یہ سیاہ ترین بدمستیوں اور بدکاریوں کا نتیجہ ہے، یہ عیسائیت کو مسخ کرنے، فریب اور ریاکاری اور نفاق کو پھیلانے اور اختلاف کا بیج بونے کی سزا ہے۔ استغفر اللہ ـــــ دانتے کو پاپائیت اور کیتھولک فلسفہ اور عقیدے پر پورا یقین تھا، اور اس کے تخیل کے سارے نقش و نگار، اسی مذہبی تعصب کے پیدا کردہ ہیں، طربیۂ خداوندی کی تعمیر و ترکیب میں بھی یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کی روایتوں، تمثیلوں اور یونانی، رومی اور عرب ضمیات کے علاوہ سب سے زیادہ دخل اُس تعصب کو ہے، جو صلیبی جنگوں سے عیسائیوں کے دلوں میں، جاگزیں تھا اور اس میں سب سے بڑی کرشمہ سازی اُس زہریلے تخیل کی ہے، جو دانتے کی شاعرانہ تخیلات کا حصہ بن گیا تھا، اس کا اتنا گہرا اثر مغرب پر ہوا کہ انھوں نے طربیۂ خداوندی کو صحائفِ آسمانی میں شمار کر لیا تھا۔

میرا عرض کرنے کا یہ مقصد ہے کہ دانتے سے لے کر انیسویں صدی کے ڈاکٹر اسپرنگر اور سر ولیم میور اور بیسویں صدی کے مانٹ گمری واٹ تک اسلام کا کم و بیش یہی تصور اُن کے سامنے رہا ہے، اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ہندوستان میں، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز افسر آئے وہ بھی یہی تخیل رکھتے تھے، اور وہ عیسائیت کی سب سے بڑی خدمت یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو عیسائی بنالیں۔ ان کی عظمتِ دیرینہ کو ختم کر دیں اور اُن کے دل سے حضورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نکال دیں، وہ خوب جانتے تھے کہ اس محبت کے بغیر اسلام کی عمارت ڈھ جائے گی، ۱۸۳۱ء سے ۱۸۵۴ء کے درمیان مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جو مناظرے، پہلے آگرے، اور پھر دہلی میں ہوئے، اُن میں بھی یہی تخیل اور یہی تعصب کارفرما ہے۔

۱۸۰۳ء میں عیسائیوں نے دہلی میں قدم جمائے اور ۱۸۰۳ء ہی میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے فتویٰ دیا کہ ہنگلی سے لے کر دہلی تک سارا علاقہ، انگریزوں کے زیرِ اثر آگیا ہے، اس لئے ان کے خلاف لڑنا ہمارا دینی فریضہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ ہمیں اُن کے نئے علوم کو بھی سیکھنا چاہئے، ۱۸۴۲ء اور ۱۸۵۴ء میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں اور Rev Pfander کے درمیان آگرے میں جو مذہبی بحثیں اور مناظرے ہوئے ان سے بھی عیسائیو

کی یہی کور فہمی، تنگ نظری اور عصبیت جھلکتی ہے جو صلیبی جنگوں اور دانتے کی بدولت اُن کو وراثۃً ملی تھی، سرسید کا یہ خیال صحیح ہے کہ اسی کی وجہ سے ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں علماء نے قلم چھوڑ کر تلوار اٹھالی تھی۔

۱۸۳۳ء میں جو چارٹر ایکٹ آیا اس نے بھی مسیحی مبلغین کو بالکل بے لگام کر دیا تھا، اور انھوں نے مسلمانوں کی دل شکنی اور دل آزاری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، اس کی شہادت ڈپٹی نذیر احمد اور سرسید کی تحریروں سے بخوبی مل جاتی ہے۔

اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی میں مشرق کے زوال اور مغربی استحصال کے ساتھ ساتھ اسلام اور اسلامی ممالک کی غلط تعبیر کے لئے ایک نیا ڈسپلن وجود میں آیا جس کو اورینٹلزم کہا جاتا ہے، میں اس کا کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ اس شر میں خیر بھی شامل تھا، اس سے بالواسطہ تحقیق کی نئی راہیں بھی کھلیں اور سماجی اور سائنسی علوم کی مدد سے ریسرچ، پہلے کے مقابلے میں زیادہ خزینہ دار اور تونگر بن گئی، لیکن انیسویں صدی کے اواخر تک یہ کوشش جھوٹی سچی روایتوں اور افواہوں افسانہ طرازیوں اور صحیح و موضوع حدیثوں کا مجموعہ تھی، جس کے پیچھے سامراجی مقاصد تھے، ان مقاصد پر خوبصورت پردے پڑے ہوئے تھے اور عام طالب علم، ان پردوں کے نقش و نگاری کو حقیقت سمجھ بیٹھے تھے، ڈاکٹر اسپرنگر کی کتابیں بزبان انگریزی

Life of Mohammed from Original Sources by Dr.Sprenger, Allhd. 1851

Life and Doctrines of Mohammad from Sources hither to un-used in 3 Volumes by A. Sprenger.

اور بزبان جرمن جو برلن سے ۱۸۶۵ء میں شائع ہوئیں، اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں، اسپرنگر کا ماخذ واقدی ہے جس کے متعلق تمام دنیا یہ جانتی ہے کہ وہ اندھیری رات میں لکڑیاں چننے والا تھا، اور اس کی غلط روایتوں افسانہ طرازیوں اور جھوٹے قصے کہانیوں، اور بے سند باتوں کی وجہ سے اسے تمام علمائے اسلام نے جھوٹا اور نامعتبر قرار دیا ہے۔

یہی حال سر ولیم میور کا ہے جن کے اعتراضات سے سرسید کا کلیجہ چھلنی ہو گیا تھا، اور اسی کا جواب لکھنے کے لئے

وہ انگلستان گئے، اور اس کا جواب انھوں نے خطباتِ احمدیہ لکھ کر دیا جس کو انھوں نے ۱۸۷۰ء میں اپنے برتن بیچ بیچ کر لندن سے شائع کیا، یہاں یہ جملہ معترضہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ اس وقت ہندوستان دولت سے خالی ہوگیا تھا، اور یہ اسی کے خزانے تھے، جن کی بدولت انگلستان میں صنعت کو فروغ حاصل ہوا، ملک وہاں کے جانے کے بعد ہندوستان کا علمی خزانہ بھی خالی ہوگیا تھا، ۱۷۹۹ء، ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۷ء کے بعد یعنی میسور، اودھ اور دہلی کے سقوط کے بعد ہماری کتابیں بھی انگلستان چلی گئی تھیں، اسی لئے سرسید کو ضروری کتابیں دیکھنے کے لئے انگلستان جانا پڑا۔

غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن   کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

سرسید سر ولیم میور کی لائف آف محمد کا جواب لکھنا چاہتے تھے، میور نے یہ کتاب پادری فنڈر کے حکم پر اور اس کے مشن کو تقویت پہنچانے کے لئے لکھی، یہی وجہ ہے کہ سر ولیم میور نے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بڑی بڑی گستاخیاں کی ہیں اور نعوذ باللہ ان کو بازی گر، فتنہ پرداز، عیش پسند، فریبی اور ریاکار کہا ہے، غرض وہ تمام رکیک اور بے ہودہ الفاظ استعمال کئے ہیں، جو اس سے قبل صلیبی جنگوں اور دانتے کے ذریعہ رائج ہو چکے تھے۔

کارلائل اور گبن کے یہاں چند اچھے کلمات بھی مل جاتے ہیں، لیکن ان کی استثنائی حیثیت ہے، اور نہ وہ صحیح معنوں میں مستشرق ہیں، انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل تک حضور رسالت مآبؐ کو اور اسلام کو مسیحی تعصب سے ہی جانچا گیا، اور اسلامی تاریخ کو مسخ کرکے اسکولوں اور کالجوں میں پیش کیا گیا، عیسائیوں نے مسلمانوں کی عظمت دیرینہ اور تہذیبی برتری پر کاری ضرب لگائی، اس لئے بقول اسپرانگر جو قدیم دہلی کالج کا پرنسپل تھا، اسی عظمت کے احساس نے ان کو لکھنو اور دہلی کی مدافعت میں جو ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۷ء میں عمل میں آئی ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا کردیا تھا کہ وہ موت سے آنکھ ملا سکیں اور بے پناہ اور ناقابلِ تسخیر بن جائیں۔

بیسویں صدی میں سائنس اور ریائی ٹکنالوجی نے بے حد ترقی کی ہے، آج زمین کی طنابیں کھچ گئی ہیں اور ہم اسی وقت یہاں بیٹھے بیٹھے دنیا کی خبریں دیکھ اور سن سکتے ہیں، اس صدی کو صحافت اور ٹیلی کمیونیکیشن کی صدی بھی کہا جاتا ہے، لیکن انگلستان اور امریکہ کے بیشتر اخبارات New Statesman لندن سے لے کر نیویارک کے Times تک یہودیوں کے قبضہ میں ہیں اور انھوں نے اس آویزش و پیکار میں جو صلیبی جنگوں سے شروع ہوئی تھیں، ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے، اس معاملہ میں ہماری بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک بھی انگریزی اخبار، حالانکہ ان کی آبادی ۵،

کے قریب بتائی جاتی ہے۔

بیسویں صدی میں عیسائیوں کے ضمیر نے ایک نئی کروٹ لی ہے، یا یہ پرانے شکاری ایک نیا جال لائے ہیں، یا تیل کی اہمیت کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے بارے میں اپنی رائے کچھ نرم کرنا چاہتے ہیں، بہرحال اسی وجہ سے علم کی خاطر کم اور سیاست کی وجہ سے زیادہ Wood Brooke College نے Christian Muslim Dialogue شروع کیا ہے، اس سے امید بندھتی ہے کہ تعصب کے پردے چاک ہوں گے، اور اگرچہ ہے کس کس خرابی سے وے باایں ہمہ مسلمانوں اور عیسائیوں کی باہمی علمی کوشش سے ایک صحیح تصویر اُبھرے گی۔

یہاں عالمِ اسلامی کے سب سے بڑے سیرت نگار اور دیدہ ور مورّخ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ضروری ہے، جن کی ساری زندگی جہادِ علمی میں گذری اور انھوں نے مستشرقین کا جواب اپنی گراں قدر تصانیف کے ذریعہ دیا۔

مُستشرقین اور اسلام

از

استاذ انور الجندی، قاہرہ، مترجمہ عمیر الصدیق ندوی دریابادی رفیق دارالمصنفین

قرآن کریم، سیرتِ رسول اللہ ؐ اور سنتِ نبوی ؐ سے متعلق مستشرقین کے افکار کا تجزیہ کرنے سے پہلے ایک مختصر جائزہ اس لئے پیش کرنا ضروری ہے تاکہ معلوم ہوجائے کہ اسلام کے بارہ میں وہ کس انداز سے سوچتے ہیں۔

بنیادی طور پر اسلام کے بارہ میں مستشرقین کا موقف اُن کے مغربی طرز کے مذہبی فہم و ادراک سے ماخوذ و مستعار ہے، یہ فہم بیک وقت کوتاہ، محدود اور گنجلک ہے، کیونکہ اس کی بنیاد اسلام کی وہ تشریحیں اور تعبیریں ہیں، جن کو یہودی عالموں اور پادریوں نے پیش کیا ہے، اسلام اپنے آپ کو تمام آسمانی مذاہب کا خاتم کہتا ہے اور ان سابقہ مذہبوں کی تصدیق کرتا ہے، لیکن یہودیوں اور عیسائیوں کی تشریحیں، اسلام سے کسی قسم کا تعلق پسند نہیں کرتیں، اور یہیں سے وہ اسلام کو صحیح طور سے سمجھنے میں رکاوٹیں پیدا کر دیتے ہیں، حالانکہ یہ امر واقعہ ہے کہ گزشتہ الہامی کتابوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق خوشخبریاں اور پیشین گوئیاں موجود تھیں، لیکن یہودی اور عیسائی علماء کی کوتاہ نظری اور بے بصیرتی نے اس آئینۂ حق کو ہمیشہ گرد آلود ہی دیکھنا پسند کیا، انھوں نے اسلام پر اگر نظر بھی ڈالی تو اس طرح کہ گویا اسلام ان لوگوں کے اعتقادات و خیالات سے مخالف کوئی چیز ہے، یا پھر ان کی مذہبی کتابوں سے ماخوذ مسخ شدہ کوئی مذہب ہے، حق یہ ہے کہ سارے مذاہب خدا کی جانب سے ہی تھے، اور ان مذہبوں کا سلسلہ ازل سے تکمیل کے مراحل میں تھا، اسلام سے اس سلسلہ کی تکمیل ہوئی، دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ ان مختلف مذہبوں اور شریعتوں میں عقیدہ سے متعلق خدا کے دین کے تمام اصول تقریباً یکساں ہیں، اور یہ قطعاً حیرت انگیز بات نہیں، لیکن اصولوں میں اس اشتراک کی وجہ سے شبہات پیدا کر دینا، یا موازنہ کرنے کی کوشش بھی کرنا صحیح نہیں، جیسا کہ مستشرقین کرتے ہیں، دوسری الہامی کتابوں میں تحریف و ترمیم کا عمل ایک تاریخی حقیقت ہے، اور یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر ہے، کہ صرف قرآن ہی وہ الہامی کتاب ہے جو آج تک بعینہٖ نص ربانی کے مطابق اپنی اصلی شکل میں محفوظ و موجود ہے، مستشرقین کے رُخ کو سمجھنے کے لئے حسب ذیل چند نکات بھی نہایت اہم ہیں:

۱۔ مستشرقین نے اسلام کو سمجھنے کے لئے روحانیت سے صرف نظر کر کے خالص مادی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے، وہ یہ نہیں تسلیم کرتے کہ وحی، نبوت اور قرآن پاک کا سرچشمہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دوسرے مذہبوں کے بارہ میں بھی ان کا دائرۂ نظر محدود ہے، یہاں تک کہ وہ انجیل کو کلامِ الٰہی نہیں مانتے، بلکہ اس کو کلام الرسل ہی کہتے ہیں، اور اس طرح وہ الوہیت اور نبوت کے درجات میں خلط مبحث کر دیتے ہیں،

۲۔ اسلام کو جس طرح اچانک اور وسیع پیمانہ پر فروغ ہوا، اور جزیرۂ عرب میں وہ جس طرح بآسانی برسراقتدار ہوا، مستشرقین اس کا بھی جائزہ لیتے ہیں، لیکن ان کا تجزیہ صرف حقیقت کے برعکس ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ اس جوہر خاص کی قدر وقیمت کو بھی کم کر کے پیش کرتے ہیں، جس کو اسلام نے انسانیت کے لئے خصوصاً ان قوموں میں پیش کیا، جو عرصہ سے رومیوں کے پنجۂ استبداد میں جکڑی ہوئی تھیں، ان مستشرقین کا حاصل مطالعہ یہ ہے کہ عرب ایک ابھرتی ہوئی قوم تھی، اُن کی اپنی تہذیب تھی، وہ ترقی کی صلاحیت رکھتی تھی، ایسے میں نبی کریمؐ کا ظہور ہوا، اور آپ نے صرف یہ کیا کہ اس ابھرتی ہوئی قوم کی قیادت کی، اور اس طرح عرب شاہراہ ترقی پر گامزن ہوگئے، یہ تجزیہ بنیادی طور پر حقیقت کی تصویر کشی نہیں کرتا، بلکہ اس اسلامی دعوت کی اہمیت کو کم کر دیتا ہے، جو واضح طور پر انسانیت کو تاریکی سے روشنی میں لانے کا سبب بنی، اسلام کی تاریخ شاہد ہے کہ عرب کس طرح شروع کے تیرہ برسوں میں، اس دعوت کے ساتھ پیش آئے، اہل مکہ کے سخت غنا اور انتہائی مخالفت کے بعد نبی کریمؐ ایک ایسے دوسرے ماحول و معاشرہ کی تلاش کرنے پر مجبور ہوئے، جو خدا کی دعوت کو قبول کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا تھا، آپ نے یہ مطلوبہ معیار یثرب کی بستی میں پایا، اور اس طرح ہجرت کا تاریخی عمل وجود میں آیا، پھر یہ دعویٰ کرنا نری جہالت ہے کہ عرب ایک ترقی پذیر قوم تھی، یہ عرب عروج اور ترقی کی سمتوں اور جہتوں سے بالکل ناآشنا تھے، وہ بتوں کے پجاری، مُردار کھانے والے، بچیوں کو زندہ درگور کر دینے والے، شراب نوشی کے عادی، قتل وغارت گری اور زنا کے خوگر تھے، تمدنی ترقی کی کوئی رمق اُن میں موجود نہ تھی، یہ صرف اسلام تھا جس نے حیرت انگیز تیزی کے ساتھ ان کو خدائے واحد پر ایمان لانے اور اپنے رب کے لئے جانی ومالی قربانیاں دینے کے لئے تیار کیا، ان اخلاقی کمالات سے آراستہ ہو کر جب وہ آگے بڑھے، تو غیر قوموں اور غیر ملکوں نے خود اپنے دروازے ان کے لئے وا کر دیئے اور مسرت کے جذبات کے ساتھ ان کا استقبال کر کے ان کی عدل گستری اور رحم دلی پر اعتماد کیا،

۳۔ مستشرقین نے اسلام سے پہلے کے زمانۂ جاہلیت اور عربوں کی بت پرستی کے مطالعہ پر خصوصی توجہ دی اور

کوشش کی کہ ان جھروکوں سے عرب اور اسلام کے مختلف گوشوں کا جائزہ لیں، زمانۂ جاہلیت کے وحشیانہ افعال و اعمال میں ان مستشرقین کو زیادہ دلکشی نظر آئی، چنانچہ اس دور کو عہدِ شجاعت قرار دیا، ہیملٹن گب نے دورِ جہالت میں قوت و ثروت کے بعض مظاہر کو نمایاں کر کے یہی ثابت کرنا چاہا ہے، یہ صحیح ہے کہ اس بدترین معاشرہ میں کہیں کہیں قوت و حمیت اور سخاوت کی ایسی چنگاریاں بھی تھیں، جو دینِ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کے خاکستر میں کبھی کبھی چمک اٹھتی تھیں، لیکن ان جزئی و لمحاتی خوبیوں کو ایک پورے عہد کی خوبی قرار دینا صرف مستشرقین کا کارنامہ ہے، جن کا مقصد عربوں کی مدح نہیں بلکہ وہ تحسین ناشناس ہے، جس کے ذریعہ دورِ جاہلیت کو سربلند قرار دیا جاتا ہے، اور اسلام کو اس سربلندی کا محض ایک خوشہ چیں ثابت کیا جاتا ہے، مدینہ میں مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات میں اسی قسم کے سلسلے قائم کئے گئے، اسلام سے پہلے کے مذاہب اور عرب کی پڑوسی حکومتوں اور غسان و منذر کی سلطنتوں کو بھی ان مستشرقین نے اسی لئے زیادہ اہمیت دی تاکہ کسی طرح یہ ثابت کیا جاسکے کہ انہی سارے پس منظروں میں مسلمانوں نے اپنی راہ کا تعین کیا،

۴۔ واقعات کے استنباط میں مستشرقین کا طرزِ استدلال واضح طور پر ان کی بدنیتی کی غمازی کرتا ہے، مثلاً ہیملٹن گب اپنی کتاب بنیۃ الفکر الدینی فی الاسلام میں لکھتے ہیں، حالات و ماحول کے ماتحت قدیم عربی تہذیب کا احیاء ہو رہا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق اسی ماحول سے تھا، طبعاً آپ پر اس ماحول کے اثرات مرتب ہوئے، آپ نے اس قدیم عربی تہذیب میں چند مذہبی عقائد کا اضافہ کر کے اسے اسلام کی صورت میں پیش کر دیا، گب قدیم عربی تہذیب کے احیاء سے توہم پرستی اور جاہلانہ اعتقادات مراد لیتے ہیں، مثلاً جادو، ٹونا، ستارہ پرستی، اور کہانت وغیرہ، گب کی اس رائے کو یہاں نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس سے مستشرقین کے اس رویہ کی وضاحت کی جائے کہ یہ لوگ اول تو چند مفروضات قائم کرتے ہیں، پھر وہ واقعات اور قرائن سے ان مفروضات کو قطعی اور یقینی بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کوشش میں وہ واقعات کو گھڑنے میں یا ان میں کتر بیونت کرنے میں یا تحریف و تغییر میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے ہیں گب نے مندرجۂ بالا رائے کی تائید میں حجۃ اللہ البالغہ سے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا ایک قول نقل کیا ہے، حالانکہ چند ہی سطروں کے بعد ان کی رائے کی نفی میں شاہ صاحب کا قول موجود ہے، گب صاحب ایسے ہی مفروضات قائم کر کے یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ حضرت محمدؐ نبی نہیں تھے، عربوں کے وہ رسم و رواج جن کو عہدِ ابراہیمی کا ورثہ سمجھا جاتا تھا، دراصل ان عربوں کے اپنے قائم کئے ہوئے تھے، حضرت ابراہیمؑ سے ان رسموں اور رواجوں کا تعلق نہیں تھا، خود کعبہ کی تقدس

میں دعائے ابراہیمی کا کوئی اثر نہیں تھا، کعبہ کی حرمت، عرب ماحول کی ایک رسمی سی چیز تھی، گب یہ بھی کہتے ہیں کہ جنات محض ایک وہمی مخلوق ہیں، اور ان کے بارے میں قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے، یا دوسرے واقعات میں ان کا جو ذکر آتا ہے وہ بھی نرا وہم ہے، گب ان تمام مفروضات کو ثابت کرنے میں جملوں کے ہیر پھیر اور عبارت کو معمہ بنانے میں سارا زور صرف کرتے ہیں،

۵۔ مستشرقین جب واضح اور اہم حقیقتوں کا معروضی مطالعہ کرتے ہیں، اُس وقت بھی وہ عصبیت بلکہ اپنے نفس کے اسیر و مرید نظر آتے ہیں، مثلاً تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ مسلمان کثرت سے جنگوں میں فتح یاب ہوئے، اور ان معرکوں میں ان کی افرادی و عددی قوت ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں کمزور و کمتر ہی رہی، لیکن تعداد میں کم ہونے کے باوجود وہ فتحمند اور غالب رہے، لیکن جنرل گلوب اپنی کتاب الفتوحات العربیۃ الکبریٰ میں ایسا پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان فنِ حرب سے ناآشنا یا اس فن میں پس ماندہ تھے، حالانکہ فوجی صلاحیتوں اور جنگ کے حربوں میں مسلمانوں کی برتری ایک مسلّمہ حقیقت ہے، انصاف پسند مورخوں نے مسلمانوں کی ترقی یافتہ صلاحیت جنگ، موقع ومحل کے انتخاب اور تیکنیکی اعتبار سے اُن کی قائدانہ مہارت کی برتری کا اعتراف کیا ہے، اسلام کے آغاز میں جو جنگیں ہوئیں، اور جو اسلامی فتوحات حاصل ہوئیں، وہ تو اپنے امتیاز کی وجہ سے صدیوں اپنی مثال آپ رہیں، (علم الحرب منیر شفیق)

عصر اول میں مسلمانوں نے جنگ کے میدانوں میں ساری بلندیوں سے برتر بلندی پر اپنا علم نصب کیا، اور نپولین کے دور تک کوئی بھی اس چوٹی کو سر نہ کرسکا، اس کے علاوہ اسلامی جہاد کا مقصد صرف جنگ ہی تو نہیں ہے، بلکہ اس کے جلو میں خدا پر ایمان، اس کی راہ میں جان و مال کی قربانی اور وہ جذبہ حمیت بھی جلوہ گر رہتا ہے، جو شوق شہادت کا سامان فراہم کرتا ہے۔

۶۔ اسلام میں دنیا و آخرت کا جو تصور پیش کیا گیا، ان مستشرقین نے اس کا بھی جائزہ لیا، اور نتیجہ یہ پیش کیا کہ اسلام کا تصور حیات، دنیا سے روگردانی کی تعلیم دیتا ہے، ایک مستشرق فون درباندم کا خیال ہے کہ اسلام مسلمانوں کو دنیا اور دنیا کے مظاہر سے کنارہ کش رہنے کی تعلیم دیتا ہے، وہ مسلمانوں کو صرف آخرت اور اس کی ابدی نعمتوں کی تحصیل کی ترغیب دیتا ہے، زندگی کے بارہ میں اسلام کے اس نقطۂ نظر سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ علم، ادب، سیاست اور اقتصادیات وغیرہ فانی علوم ہیں، جو ہر حیات تو صرف نماز، روزہ جیسی عبادتیں ہیں، گویا موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی پس ماندگی و درماندگی

کی وجہ اُن کی رہبانیت ہے، اس غلط طرزِ فکر کا جواب ایک عرب اہلِ قلم ڈاکٹر ابراہیم محمد زرقانہ نے یہ کہکر دیا کہ مسلمانوں کی موجودہ خستہ حالی کی یہ تعبیر اسلام کی روح کے ساتھ میل نہیں کھاتی، اسلام عبادت کو عمل پر غالب نہیں کرتا، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ عمل ہی عبادت پر حاوی ہے، یہ تو سب پر روشن ہے کہ مسلمان صدیوں تک علم کے علمبردار رہے، یورپ کی موجودہ نشأۃ ثانیہ اور اس کے علمی عروج کے اسباب انہی مسلمانوں ہی کے تو مہیا کردہ تھے، مسلمانوں نے یہ مہیا نہ کیے ہوتے تو شاید یورپ ابھی محوِ خواب ہی رہتا، مسلمانوں کی خستہ حالی کی وجہ اسلام کا تصورِ حیات نہیں ہے، یورپ نے مسلمانوں پر سیاسی بالادستی حاصل کی تو ان کی سامراجیت نے عالمِ اسلام کو منظم طریقہ سے علمی، معاشی اور فوجی لحاظ سے مفلوج بنا کر رکھ دیا تاکہ پھر یہ مسلمان ان میدانوں میں پیش قدمی نہ کرسکیں، مسلمانوں کی موجودہ پس ماندگی اُن کے دشمنوں کی وجہ سے ہے، اس میں اُن کے مذہب کی تعلیمات کی مطلق کارفرمائی نہیں ہے، اور عجب کیا کہ مستقبل قریب میں مسلمان پھر یہ ثابت کردکھائیں کہ ان کا دین کبھی پسماندگی کی تعلیم نہیں دیتا، بلکہ یہ تو اسلام ہے، جو ہر ترقی کا ہمیشہ محرک اور سبب بنتا رہتا ہے، اسلام نے دین و دنیا میں ہمیشہ ایک مضبوط ربط قائم کررکھا ہے، مذہب کی صحیح روح کو سمجھنے کا فطری ثمرہ علم و عمل، سیاست و معاشیات میں ترقی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، دین و دنیا میں اگر صحیح مطابقت قائم نہ ہوسکی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ عیب خود مسلمانوں میں ہے، یا دنیاوی پس ماندگی مسلمانوں کی تہذیب کا ایک لازمہ ہے، مسلمانوں کی پس ماندگی کے اسباب تاریخی ہیں، اُن کے ازالہ کے ساتھ یہ پسماندگی خودبخود ختم ہوجائے گی، پھر مسلمانوں کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ وہ پس ماندہ ہیں، اگر یہ پس ماندگی ان کی تہذیب کا جزو ہوتی، تو پھر یہ احساس ہی کیوں پیدا ہوتا، ؟ آج مسلمان اپنی زبوں حالی کا تجزیہ کررہے ہیں، اور تقریباً ساری مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اُن کی خستگی کا سبب یہ ہے کہ وہ اسلام سے روگرداں ہوگئے، اور اس روگردانی میں سامراج کا بڑا ہاتھ ہی جس نے مغربی ادبیات اور نظریات سے ان کو ایک عرصہ تک مسحور کئے رکھا، مغربی اہلِ قلم نے سارا زور اسپر صرف کیا کہ وہ مسلمانوں کو اپنی تہذیب سے بیگانہ کرکے دوسری شاخہائے نازک پر آشیانہ بنانے کی ترغیب دیں،

۰. مستشرقین نے اپنی خواہشات اور جذباتِ تعصب کی بنا پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اسلام کا کوئی مستقبل ہی نہیں، مارگولیتھ نے ۱۹۱۰ء میں اپنے اسی نتیجۂ فکر سے دنیا کو باخبر کیا، لانس نے ۱۹۳۰ء میں یہی نعرہ بلند کیا، اور دوسرے مستشرقین اسی قسم کی گفتگو کرتے رہے، مگر حالات، واقعات اور اسلام کی روزافزوں اشاعت، زبانِ حال سے ان کے اقوال کی تردید کرتی رہی، پاکستان اور انڈونیشیا کی صورتوں میں نئی اسلامی مملکتیں وجود میں آئیں، خلافت ختم ہوئی، لیکن اسلام

زندہ رہا، حالانکہ یہی مستشرقین کہا کرتے تھے کہ خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد اسلام کا بھی سقوط ہو جائے گا، نئے تمدن کے ساتھ جب اسلام دوچار ہوگا، تو لامحالہ پاش پاش ہو جائے گا، لیکن مغربی تہذیب کا سامنا اسلام نے کیا، اور بجائے مرعوب و مغلوب ہونے کے اس نے جرأت کے ساتھ مغربی تہذیب کے ناسوروں کی نشاندہی کی، اس کے طوفان کا مقابلہ پامردی سے کیا، اور اس کے غلبہ سے خود کو آزاد رکھا، اور فکر اسلامی از سرِ نو اپنے اولین سرچشموں سے سرسبز اور شاداب ہو رہی۔ مستشرقین کا خیال تھا کہ مغرب کی مسیحی مشنریاں، اسلام کا خاتمہ کردیں گی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنی ساری قوت، ثروت اور وسائل کے باوجود یہ مشنریاں مسلمانوں کو اپنے مذہب سے برگشتہ نہ کرسکیں، ان ملکوں میں جہاں اسلام کا سیاسی اثر و نفوذ نہیں ہے، اور جہاں مسیحی مشنریاں لاکھوں کی رقم خرچ کرکے فلاحی ادارے قائم کررہی ہیں، وہاں اسلام اپنی فطری سادگی آسانی اور نرمی کی وجہ سے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہو رہا ہے۔

گب کو غرہ تھا کہ مغرب زدگی سے اس وقت سارا عالم اسلام متاثر ہے، لیکن اب مغربیت کا یہ طلسم ٹوٹ رہا ہے، مسلمانوں کو اپنی متاعِ گم گشتہ کا احساس ہو چلا ہے، وہ اپنے اولین سرچشموں کے آبِ نشاط انگیز کی افادیت سے باخبر ہو رہے ہیں، وہ اپنی زندگی میں شریعت کے نظام کو پھر سے جاری و ساری رکھنا چاہتے ہیں، اقتصادیات، سیاسات، سماجیات کے میدانوں میں اسلام کا جوہر کھل رہا ہے، گو خود شناسی کا یہ جوہر بعد از خرابیِ بسیار آشکارا ہوا ہے۔

مارگولیتھ جب اسلام کے بارہ میں گفتگو کرتے، تو وہ ایک سیاسی مورخ برائس کا یہ قول بار بار دہراتے، کہ اسلام کی زندگی اب صرف دو صدی اور ہے، اور مسلمانوں کی انتہائی تعداد دو کروڑ سے زیادہ نہ ہوسکے گی، لیکن آج مستند اعداد و شمار کے مطابق مسلمانوں کی تعداد ایک ارب تک پہونچ چکی ہے، اور اسلام کی وسعت اور فروغ کا عالم یہ ہے کہ وہ استعمار کے گھر اور اس کی توپوں کے پیچھے یورپ تک جا پہونچا ہے، امریکہ میں وہ ایک مانوس حقیقت ہے، اور پانچوں براعظموں میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں کسی نہ کسی مینارہ سے اللہ اکبر کی صدائیں نہ بلند ہوتی ہوں، انہی یہودی مارگولیوتھ نے بعد میں کہا کہ یہ کہنا کہ اسلام جلد ہی ختم ہو جائے گا، غور طلب مسئلہ ہے، اسلام روئے زمین پر ایک زندہ حقیقت ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے، کہ انسانیت روز بروز سائنس کی مدد سے اپنے رب کو پہچان رہی ہے، اور سارے وہموں اور غلط تعبیروں کو ختم کرتی جاتی ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام بڑی سیاسی اور فوجی حکومتوں کے اثر و نفوذ سے آزاد ہوتا جارہا ہے، اور ان حکومتوں کے اقتصادی اور ثقافتی اثرات سے نبرد آزما ہے،

مستشرق لانس کا خیال تھا کہ خلافت اسلامیہ کے سقوط کے اثرات یقینی طور پر اسلام کے مستقبل پر پڑیں گے۔ لیکن حالات نے دوسرا ہی رُخ دکھایا، مسلمانوں نے سقوطِ خلافت کے بعد وحدت کی بنیادیں پھر سے استوار کیں، مسلمانوں کے مسائل کو متفقہ طور پر حل کرنے کے لئے اجتماعات اور مشاورتی جلسے منعقد ہوتے رہے، شیعہ، سنی ہم آہنگی نے ان مفروضوں کو غلط ٹھرایا، جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وطنی تحریکیں، محدود قومیتیں اور نسلی تفریقیں مسلمانوں کی فکری وحدت کا خاتمہ کر دیں گی، اور ان کے عقائد اور اُن کی ثقافت کو قصۂ پارینہ بنا دیں گی اس عرصہ میں عرب قوم پرستی، فرعونی تہذیب کا احیاء، اور فینیقیت جیسے وقتی رجحانات ابھرے ضرور، لیکن مسلمانوں کا اسلام پر اعتقاد ایسا راسخ رہا کہ یہ رجحانات زیادہ مؤثر نہ ہو سکے،

موجودہ دور میں مسلمانوں کی آبادی میں جس قدر اضافہ ہو رہا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عددی تفوق مستقبل میں مسلمانوں کی [illegible]ات میں بہت مؤثر ثابت ہوگا،

اسی طرح مغربی اور لامذہبی اثرات سے چھٹکارا پانے کی کوشش کے ساتھ اب قرآن کی تعلیم از سر نو عام ہو رہی ہے اور مسلمان بجا طور پر یہ یقین کرنے لگے ہیں، کہ عالمِ اسلام کی ترقی اور کامرانی صرف ایسی شریعت کے زیر سایہ ممکن ہے جس میں علم، دین، روح، مادہ دنیا اور آخرت کی جامعیت ہو،

مستشرقین کی نسبت سے اسلام کے بارہ میں یہ ایک عمومی جائزہ تھا، اب ہم پہلے قرآن کریم اور مستشرقین سے متعلق علیٰحدہ گفتگو کریں گے،

مستشرقین اور قرآن کریم اسلام کے بارہ میں مستشرقین کا رویہ خصومت اور انکار کا ہے، اور یہی سلوک ان مستشرقین کا قرآن کریم سے ہے، اور جو ان مستشرقین کی فطرت کا عین غماز ہے، کیونکہ قرآن کریم، موجودہ توریت و انجیل کے متعلق صاف کہتا ہے کہ یہ دونوں تحریف شدہ کتابیں ہیں، اور یہ وہ نہیں ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے آسمان سے اتارا تھا، قرآن نے موجودہ توریت و انجیل کی پیش کردہ خرافات کی صحیح نقاب کشائی کی، عقیدۂ توحید سے متعلق قرآن نے صراحت سے کہا کہ توحید ہی دین حق کی روح ہے، عقیدۂ تعدد الٰہ اور عقیدۂ تثلیث اس روح کے منافی عقائد ہیں، حضرت عیسیٰؑ کے بارہ میں قرآن نے کہا کہ وہ خدا کے پیغمبر تھے، خدا نہ تھے، عیسائیوں کے عقیدہ کے برخلاف ان کو نہ قتل کیا گیا، نہ سولی دی گئی، بلکہ انہیں آسمان پر اٹھا لیا گیا، قرآن نے اس مضحکہ خیز عقیدہ کی بھی تردید کی کہ حضرت عیسیٰؑ نے مصلوب ہو کر ساری قوم کے لئے

نجات کا سامان فراہم کر دیا، قرآن نے اس تصور کو بھی باطل قرار دیا کہ کوئی خاص قوم خدا کی محبوب قوم ہے، ان کے علاوہ دوسرے کئی متنازعہ مسائل میں جن کے متعلق قرآن نے قطعیت سے اپنی رائے کا اظہار کیا، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت داؤد اور حضرت لوط علیہم السلام جیسے انبیائے معصومین سے متعلق توریت وانجیل میں بہت سی روایتیں ایسی داخل کر دی گئی تھیں، جن سے ان انبیائے معصومین کا مرتبۂ نبوت فروتر نظر آتا تھا، قرآن نے ان روایتوں کو باطل ٹھہرایا، قرآن کریم کی اس صدق بیانی کو مستشرقین کیسے گوارا کر سکتے ہیں، چنانچہ ان مستشرقین کی کتابوں میں اس خیال پر عام اتفاق ہے کہ قرآن کا سرچشمہ وحیٔ الٰہی نہیں، بلکہ وہ حضرت محمدؐ کا اپنا کارنامہ ہے، مستشرقین کے دوسرے دعووں کی طرح یہ دعویٰ بھی بے دلیل اور بے سند ہے، اس دعویٰ کی تہ میں یا تو قرآن دشمنی کا جذبہ کارفرما ہے، یا پھر وہ وحی کی فہم سے ناآشنا ہیں، یا ان کے پیمانے ایسے لوگوں کے قائم کردہ ہیں، جو صرف مادی نظریہ پر یقین رکھتے ہیں، ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انجیل کے بارہ میں ان کا اعتقاد ہے کہ وہ کلامِ الٰہی نہیں، بلکہ نتیجۂ فکر پیمبر ہے، اسی لئے وہ قرآن کو بھی اسی حیثیت سے جانچتے ہیں، قرآن کا کلام الٰہی ہونا ان مستشرقین کی سمجھ میں نہیں آتا، وہ بار بار اس سے متعلق اپنے شکوک وشبہات کی تکرار کرتے رہتے ہیں، اس شک کا اظہار اس کثرت سے ہوا کہ طٰہٰ حسین اور زکی مبارک وغیرہ جیسے عربی انشا پرداز اور دانشور بھی اس سے کسی حد تک متاثر ہو گئے،

قرآن کریم کے مضامین اور خاص طور سے قرآنی قصّوں کے بارہ میں ان مستشرقین کی رائے یہ ہے کہ نبی کریمؐ کچھ عیسائی اور یہودی علماء سے ربط ضبط رکھتے تھے، اُن سے یہ قصے سُن کر آپ نے اُن کو قرآن میں پیش کر دیا، لیکن مستشرقین کے اس شبہہ کا ازالہ اسی وقت ہو جاتا ہے، جب توریت وانجیل کے روایت کردہ افسانوں اور قرآن کے پیش کردہ قصوں کا موازنہ کیا جاتا ہے، قرآنی اسلوب، بلاغت وحکمت کے اعلیٰ معیار اور وسیع ودقیق معلومات کی بدولت یہ بات خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ کلامِ ربانی اور کلام انسانی میں کس قدر فرق ہے، صدق مقالی، عبرت خیزی، سادگی وپرکاری، حکمت ودانائی، افسانوی تفصیلات سے دوری، اور ایک مرتب ہم آہنگی قرآنی امتیازات ہیں، اور یہ وہ اسلوب ہے جس کے ذریعہ عالمِ انسانیت، سلامت فکر کے نئے دور اور ایک زندہ وپایندہ پیغام کے عہد میں داخل ہوا، لیکن اس کے ادراک کے لئے نگاہ بصیرت کی ضرورت ہے، مستشرقین کا اعتراض کوئی نئی بات نہیں، ہر دور میں اسلام کے دشمنوں کی زبان سے ایسے ہی کلمات سرزد ہوئے، نبی کریمؐ کے دور میں مشرکین مکہ کا الزام یہی تھا

کہ آپ نے یہ حکایتیں، مکہ میں مقیم ایک غیر عرب زبان داں سے سُن کر بیان کی ہیں،
مستشرقین میں گولڈ زیہر اور دام بلیشر نے انہی اندیشوں کا اظہار کیا کہ نبی کریمؐ نے شام کے سفر میں عہد نامۂ عتیق کی روایتیں سنیں، اور پھر ان کو قرآن میں دہرا دیا، گولڈ زیہر اور نولدیکی نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ نبی کریمؐ کی وفات کے بعد قرآن میں تحریف کی گئی، وہ مثال دیتے ہیں کہ آپ کا نام قثم یا قثامہ تھا، لیکن جب آیت ومبشراً برسول یاتی من بعدہ اسمہ احمد (اور خوشخبری دینے والے ایک ایسے پیغمبر کی جو ان کے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہوگا) اتری تو آیت کو منطبق کرنے کے لئے آپ کا نام بدل دیا گیا اور بجائے قثم کے محمدؐ نام رکھا گیا، اس تحقیق انیق کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ آپ کے بہت سے صفاتی نام ہیں، آپ کے دادا عبد المطلب نے محمد نام رکھنے سے پہلے قثم نام تجویز کیا تھا، اس روایت کو ان مستشرقین نے کہیں سے کہیں پہنچا دیا،

حالتِ وحی میں نبی کریمؐ کے چہرۂ مبارک سے گراں باری اور شدت کی کیفیت کا اظہار ہوتا تھا، مستشرقین نے اپنی تحقیق کے ذریعہ اس کیفیت کو نعوذ باللہ صرع کے دورے سے تعبیر کیا، وہ کہتے ہیں کہ نبی کریمؐ اپنا ہوش کھو بیٹھتے تھے، پسینہ جاری ہو جاتا، تشنجی کیفیت طاری ہوتی، منہ سے جھاگ نکلنے لگتا، اور جب آپ کو افاقہ ہوتا، تو آپ فرماتے، کہ مجھ پر وحی آئی تھی، اور پھر آپ اپنے اصحاب کے سامنے آیاتِ قرآنی تلاوت کرتے، رسول اللہؐ کی بشری حالت میں حضرت جبرئیلؑ کے ملکوتی وجود سے ہمدمی و ہمرازی، اور اظہار وحی ایسے اہم مسائل میں سے ہیں، جن کے بارہ میں علماء و محققین نے دادِ تحقیق دی اور جس کے سمجھ اور ادراک سے مادی علم و فہم عاجز و قاصر ہیں، لیکن مستشرقین کی تحریروں میں تعصب، عیب جوئی اور الزام تراشی کی کارفرمائی کے بعد یہ تحقیق ننگِ تحقیق بن جاتی ہے، جس پر ناطقہ سر بگریباں ہونے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا،

قرآن کی بعض سورتوں کا آغاز حروفِ مقطعات سے ہوتا ہے، مستشرقین نے یہاں بھی دادِ تحقیق دی ہے، نولدیکی اس نتیجہ پر پہنچے کہ حضرت زید بن ثابتؓ، کاتبِ وحی نے قرآن کے متعدد نسخوں کو ایک مصحف میں جمع کرنا چاہا، اس سلسلہ میں قرآن کے متعدد نسخوں کے مالکوں سے انھوں نے مدد لی، چنانچہ یہ حروفِ مقطعات، ان مالکوں کے مخفف نام ہیں، یہ تحقیق بعید از قیاس بلکہ مضحک ہے،

ایک مستشرق ایڈورڈ جونسر کا خیال ہے کہ یہ حروفِ مقطعات سورتوں کے قدیم ناموں کا اختصار ہیں، یہ خیال بھی خام نظر آتا ہے، کہ اگر یہ حروف سورتوں کے نام ہوتے تو ان کو بسم اللہ سے پہلے لکھا جاتا، نہ کہ بعد میں، اور اگر ایسا ہوتا

تو قدیم مفسرین کو اس کا علم ضرور ہوتا، اور وہ اس کی جانب اشارہ کرتے، اصل بات یہاں بھی وہی ہے کہ مقصد موشگافی نہیں ہے، صرف ثابت یہ کرنا ہے کہ یہ حروف مقطعات، وحی کے کلمات نہیں ہیں، بلکہ ان کو نبی کریمؐ کے بعد قرآن میں داخل کیا گیا ہے، حالانکہ یہ حروف نبی کریمؐ کی زبان مبارک سے ادا ہوئے، اور آپ نے اُن کو اصل قرآن ہی میں شمار کیا۔

مستشرق لوئیس جارڈیہ اور پادری قنواتی نے اپنی کتاب فلسفۃ الفکر الدینی بین المسیحیۃ والاسلام میں یہ دعویٰ کیا کہ قرآن کی ترتیب اور سورتوں اور آیتوں کی تقسیم حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں ہوئی، حالانکہ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی سورتوں اور آیتوں کی ترتیب نبی کریمؐ کے عہد ہی میں مکمل ہو چکی تھی، حضرت عثمانؓ کے دور خلافت تک مختلف لوگوں کے پاس نامکمل مصاحف موجود تھے، حضرت عثمانؓ کے دور میں صرف یہ ہوا کہ ان نامکمل مصحفوں کے بجائے قرآن کے مصحف کامل کا رواج عام ہوا،

بعض مستشرقین نے قرآن کریم کی موجودہ اور اصل ترتیب سے ہٹ کر اپنے طور پر ایک نئی ترتیب قائم کرنے کی کوشش کی، ان مستشرقین میں ولیم موبیر، ویل، روڈویل وغیرہ کے نام آتے ہیں، لیکن ظاہر کہ یہ سعی لاحاصل تھی، چنانچہ کچھ حاصل نہ ہوا، بعض مستشرقین نے چند ضعیف بلکہ موضوع حدیثوں کی بنیاد پر قرآن کی زبان میں شکوک وشبہات کا اظہار کیا کہ بعض صحابۂ کرام کو قرآن کریم کے بعض جملوں کی ساخت وترکیب سے اتفاق نہیں تھا، لیکن مستشرقین کی اس کوشش کو طفلانہ کوشش کے سوا کچھ نہیں سمجھا گیا۔

۳۔ مستشرقین نے زبان وبیان کی غلطیاں دکھانے کے بعد معنوی اعتبار سے بھی قرآن کا مرتبہ کم ثابت کرنے کی کوشش کی، ان کا خیال ہے کہ قرآن کوئی مکمل نظام نہیں ہے، اصلاح معاشرہ کی ایک وقتی کوشش ہے، نبی کریمؐ نے اپنی قوم کے طبقاتی نظام کی خرابیوں کو دیکھا تو اس کی جانب اس قرآن میں توجہ دلائی، اسی لئے آپ نے روز قیامت کے خوف کو نمایاں کیا، کم تولنے اور ناپنے والوں سے متعلق، اور یتیم پر ظلم ڈھانے سے متعلق اور سائل کو دھتکارنے اور ڈانٹنے کے بارہ میں آیتیں پیش کیں، گویا قرآن بجائے ایک ضابطۂ حیات کے صرف وقتی مسائل کے حل کرنے کی حد تک محدود تھا، حالانکہ ہر غیر متعصب اور انصاف پسند انسان قرآن کے مطالعہ کے بعد اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیگا کہ قرآن کی صورت میں خدائے تعالیٰ نے ایک مکمل وجامع، ضابطۂ حیات پیش کر دیا ہے، جو ہر زمان اور ہر مکان کے لئے

سامان ہدایت ہے، خواہ حالات اور واقعات کتنے رنگ بدلیں، قرآن کی تعلیمات کی جامعیت ہمیشہ موثر رہے گی، قرآن کی یہ جامعیت خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کوئی انسانی کارنامہ نہیں ہے، بلکہ اس کا سرچشمہ ذات ربانی ہے۔

مستشرقین کا دعویٰ ہے کہ نبی کریمؐ یہودی اور نصرانی عالموں کی تعلیمات سے متاثر ہوئے تھے، (حالانکہ نبی کریمؐ کا امی ہونا ہی اس دعویٰ کی تردید کرتا ہے) لیکن قرآن کے نظامِ حیات، معرفت کائنات، قوانین فطرت، تہذیبوں اور قوموں کے عروج وزوال کے اسباب جیسے قرآنی مضامین کی ایک جھلک بھی توریت وانجیل میں نہیں پائی جاتی، حد تو یہ ہے کہ اولین مسئلہ یعنی مسئلۂ توحید ہی میں ان کے درمیان شدید اختلاف ہے، لیکن مستشرقین پھر بھی یہی دہراتے جاتے ہیں، کہ نبی کریمؐ کی تعلیمات کے اصل ماخذ یہودی اور عیسائی علمار تھے،

۵۔ قرآن پر ایک اعتراض یہ ہے کہ وہ اپنے اسلوب میں سجع اور قوافی کا پابند ہے، تو ئی ماسین یوں ایسے ہی مستشرقین کی نمایندگی کرتے ہیں، حالانکہ واقعہ صرف یہ ہے کہ قرآن کے متعدد اسالیب ہیں، ان میں سے ایک سجع کا اسلوب بھی ہے، مگر یہ عام سجع سے منفرد اور انتہائی اثر آفریں ہے، اور کاہنوں کے سجع سے بالکل جدا ہے اور کہیں برتر ہے، اسی لئے ایک اہل زبان نے کہا تھا کہ بخدا یہ قرآن نہ تو شعر ہے، نہ سحر ہے، اور نہ ہی عمل کہانت ہے، یہ تو کچھ اور ہی شے ہے،

مغربی زبانوں میں قرآن کریم کے ترجمے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی ؟ تاریخ اس سوال کا دلچسپ جواب پیش کرتی ہے، صلیبی جنگوں کے خاتمہ کے بعد جب عیسائی فوجی اپنے اپنے وطن میں واپس آئے تو اپنے ساتھ مسلمانوں کے حسن سلوک اسلام کی تہذیب اور اس کی خوبیوں کی داستانیں بھی ساتھ لائے، چنانچہ یورپ میں اسلام کے خلاف نفرت اور دشمنی کے بجائے قربت اور دوستی کا سازگار ماحول بننا شروع ہوگیا، اس نئی رائے عامہ سے ارباب اقتدار کا پریشان ہونا فطری امر تھا، چنانچہ لوئس نہم کی تجویز یہ ہوئی کہ قرآن کریم اور اس کی تشریح اس انداز سے کی جائے جو صاحب قرآن کی تکذیب اور خود قرآن کی سلامتی وعظمت میں شکوک پیدا کر دے، ایک محقق کے قول کے مطابق صلیبی جنگوں کے بعد ارباب کلیسا نے یہ تلخ حقیقت محسوس کی کہ ان جنگوں کے بعد نہ تو عیسائیوں کو ارضِ مقدس پر کامل فتح نصیب ہوئی، اور نہ مسلمانوں نے مسیحیت کو گلے لگایا، بلکہ اس کے برعکس یہ ہوا کہ اسلامی تہذیب اور طرز معاشرت نے صلیبیوں پر قابل لحاظ اثر چھوڑا اور اسی وقت سے یہ منصوبے بننا شروع ہو گئے، کہ اسلام کا

مقابلہ میدان جنگ کے بجائے فکر ونظر کے میدان میں کیا جائے جو زیادہ بامقصد اور کارآمد ثابت ہوگا، اس سلسلہ میں اولین نام ایک صاحب طبری (م ۱۱۶۵ھ) کا آتا ہے، ان کو اسپین بھیجا گیا، انھوں نے وہاں مسلمانوں اور عیسائیوں کی باہمی آویزش اور مناظروں کا بنظر غائر جائزہ لیا، اور اسپین کے ان عیسائیوں کے طریق کار سے بھی واقف ہوئے جن کا خیال تھا کہ اسلام کا مقابلہ صرف عقلی اور منطقی دلائل سے ہی کیا جا سکتا ہے، عیسائیوں کی ان کوششوں کا ثمرہ اس وقت حاصل ہوا، جب لاطینی زبان میں قرآن کا ترجمہ مکمل ہوا، اس ترجمہ کا پہلا اڈیشن باجایتی نے ۱۵۳۰ء میں بندوقیہ سے شائع کیا، لیکن اس وقت کے پوپ پال سوم نے اُس کے تمام نسخے جلوا دیئے، اس کے بعد پوپ الیکزنڈر چہارم نے ایک حکم نامہ کے قرآن اور اس کے ترجمہ کی اشاعت ممنوع قرار دی، ۱۶۹۴ء میں ایک جرمن بشپ ابراہام ہیکمان نے قرآن کا ترجمہ شائع کیا، گویہ ترجمہ ۱۶۶۰ء میں تیار ہو چکا تھا، لیکن اس وقت اس کو شائع کرنے کی ہمت نہیں ہوئی، اپنے اس ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں وہ لکھتا ہے کہ اگر ہم اسلام کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کا گہرا مطالعہ کیا جائے، اس کے بعد ہی مشرق میں دین مسیحی کے فروغ کی راہیں ہموار ہو سکتی ہیں، گویا قرآن کا مطالعہ اور اس کے علوم کی معرفت حاصل کرنے کی نیت روز اوّل سے یہ تھی کہ اسلام کا مقابلہ کیسے کیا جائے، اور اس کی تعلیمات کو کن کن طریقوں سے باطل ٹھہرایا جائے، خشت اول کی اس کجی کے بعد پوری عمارت کے ناقص ہونے پر اس کے بعد زیادہ تعجب نہیں ہوتا، تعجب تو اس وقت ہوتا ہے جب، مستشرقین اپنے مطالعہ کو معروضی، تحقیقی اور خالص علمی ہونے کا نام دیتے ہیں، ان مستشرقین نے اپنے علمی کاموں یا کارناموں میں اپنے اسلاف کے طرز فکر کو راہنما بنایا، اور ان سب کی تحقیقات کا ماحصل یہ رہا کہ قرآن کریم یا تو نصرانیت سے ماخوذ ہے، یا یہودی تعلیمات سے نبی کریمؐ نے استفادہ کیا،

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام نے لفظ محمد کی تشریح میں ان ہی خیالات کو جگہ دی ہے، تاریخ کی بحث میں ٹائن بی نے ایسے ہی مفروضات کو داخل کیا، اور دارنر جانجر اور لوری وغیرہ سارے مستشرقین کی تحقیقات کا لب لباب یہ ہے کہ قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تالیف ہے، اور اس کے مصادر و مراجع توریت و انجیل ہیں سارے مستشرقین کا ایک نتیجہ پر متفق ہو جانا محض اتفاقی بات نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ وہ تعصب اور نفسانی خواہشات میں متفق ہیں، اس کے بعد کسی علمی مسئلہ پر کسی آزادانہ اظہار رائے کی توقع ہی کیوں کر کی جا سکتی ہے، محمد اسد کے قول کے مطابق مستشرقین کی تحقیقات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گویا اسلام ایک علمی مباحثہ کا موضوع بننے کا اہل ہی نہیں بلکہ وہ ایک مجرم ہے۔ اور اپنے منصفوں کے سامنے فیصلہ

کے لئے دست بستہ کھڑا ہے،

مستشرقین کے اعتراض کا جواب مسلمان اہلِ قلم نے بار بار دیا ہے کہ اگر قرآن نے توریت و انجیل سے استفادہ کیا ہوتا تو سب سے پہلے یہودی اس کا اعتراف کرتے اور قرآن کو تسلیم کرتے، لیکن یہود تو کسی نبی اور پیغمبر کے نہ ہوئے، سب کے ساتھ ان کا رویہ بغض و کینہ اور خبث باطن کا رہا، نبی کریمؐ کی مخالفت میں بھی انھوں نے مشرکین مکہ کے ساتھ سازباز کی، مقصد یہی تھا کہ قرآن، کریم کے وحی الٰہی ہونے پر طعن و طنز کا موقع ملے، اگر توریت و انجیل کی تعلیمات قرآن نے پیش کی ہوتیں تو یہودیوں کو تو سب سے پہلے قرآن کو تسلیم کرنا چاہئے تھا، مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں چند مغربی اہل قلم مثلاً ارنسٹ نے بھی اظہار خیال کیا ہے، وہ اپنی کتاب الاسلام والمسیحیۃ الحقیقیہ میں لکھتے ہیں، کہ انجیل کے صحیفوں میں جس عقیدہ اور دینی نظام کو پیش کیا گیا ہے، اسے حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات قرار نہیں دیا جا سکتا، آج مسیحیت اور اسلام کے درمیان موجودہ نزاع کا تعلق حضرت عیسیٰؑ کی انجیل سے نہیں بلکہ پال کی انجیل سے ہے جس نے انجیل کی غلط تشریح کی، اور متضاد قصوں اور افسانوں کو باہم خلط ملط کر دیا، اس کے علاوہ انجیل میں اسلوب کے لحاظ سے بھی بنیادی اختلاف موجود ہے، کیونکہ انجیل کے صحیفوں لوقا، متی، یوحنا، مرقس اور برنابا کے کاتب الگ الگ ہیں، اس لئے یہ قرآن معنی اور اسلوب دونوں طرح سے توریت و انجیل سے ممتاز ہے،

ولفریڈ کینٹویل اسمتھ

تعارف اور تجزیہ

از

ڈاکٹر مشیر الحق پروفیسر مطالعات اسلامی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

ولفریڈ کینٹویل اسمتھ کی پیدائش کناڈا کے مشہور شہر ٹورانٹو کے ایک مذہبی عیسائی گھرانے میں ۲۱ر جولائی ۱۹۱۶ء کو ہوئی، ان کے والد مشہور پارکر قلم بنانے والی کمپنی کے ڈائرکٹر تھے، اس حقیقت واقعہ اور اسمتھ کے مسلسل تصنیفی شغف کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ منھ میں چاندی کا چمچہ تو نہیں، لیکن ہاتھ میں قلم لیکر ضرور اس دنیا میں آئے، وہ تقریباً سو تحقیقی اور علمی مقالات اور لگ بھگ دس اہم کتابوں کے مصنف ہیں، ان کے بعض مضامین اور کتابوں کے ترجمے عربی، ترکی، اردو، فرانسیسی، جرمن، انڈونیشی، جاپانی، اسپینی اور سویڈش زبانوں میں بھی شائع ہو چکے ہیں،

اسمتھ نے جس ٹورانٹو میں آنکھیں کھولی تھیں، وہ اپنے تہذیبی اور مذہبی روایات میں آج کے ٹورانٹو سے بہت مختلف تھا، اس وقت وہاں کی عام شہری زندگی پر مذہب کی اتنی گہری چھاپ تھی کہ اتوار کے دن بازار میں چائے کی ایک پیالی مل جائے تو لوگ خوش نصیبی سمجھتے تھے، ٹورانٹو بدل گیا، لیکن اسمتھ کی مذہبیت میں تبدیلی نہیں آئی، مذہبی اقدار کی عملی پابندی کے معاملہ میں وہ آج بھی امریکہ میں رہتے ہوئے انیسویں صدی کی دنیا میں نہ صرف زندہ ہیں بلکہ خوش ہیں، اسمتھ بے عمل اشخاص کے ساتھ رہ تو سکتے ہیں، لیکن زندگی نہیں گذار سکتے، انھیں دوسروں کی لامذہبیت سے اذیت ضرور پہونچتی ہے، لیکن ان کی مذہبی زندگی کو ناپنے کا معیار اسمتھ اپنے مذہب کو نہیں بلکہ اس مذہب کو قرار دیتے ہیں جس کی پیروی کے وہ دعویدار ہوتے ہیں۔

کے عنوان سے ایک کتاب شایع کی، جب انھوں نے محسوس کیا کہ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کا میدان ان کے
ذہنی سفر کے لئے تنگ ہو گیا ہے تو ۱۹۶۴ء میں وہ ہارورڈ یونیورسٹی میں مذہب کے تقابلی مطالعہ کے مرکز کے ڈائرکٹر
ہو کر چلے گئے، میکگل انسٹی ٹیوٹ چونکہ اسلام کے مطالعہ کے لئے قائم کیا گیا تھا، اس لئے انھوں نے اپنے دوران
قیام اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا کہ اساتذہ اور طلبہ دونوں ہی کی تعداد میں مسلم اور غیر مسلم کی نسبت نصف
ضرور ہے، کیونکہ ان کے خیال میں کسی بھی مذہب کا مطالعہ اس مذہب کے ماننے والوں کی غیر موجودگی میں نہیں
کیا جا سکتا، ہارورڈ میں چونکہ ایک سے زیادہ مذاہب کا مطالعہ مقصود تھا، اس لئے وہاں پر انھوں نے سنٹر کو اقامتی
بنیادوں پر قائم کیا، تاکہ مختلف مذاہب کے لوگ ایک ہی چھت کے نیچے رہ کر ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔
۱۹۷۳ء میں وہ ہارورڈ سے کناڈا کی ڈلہوزی یونیورسٹی میں ریلیجن کے پروفیسر ہو کر چلے گئے، وہاں سے پانچ
چھ برس کے بعد دوبارہ ہارورڈ واپس آ گئے۔ اور تادم تحریر وہیں ہیں۔

اسمتھ اپنے فکر اور عمل دونوں کے اعتبار سے خود بھی مذہبی ہیں اور دوسروں کو بھی اپنے مذہب پر عمل پیرا دیکھنا
چاہتے ہیں، تقویٰ ان کے خیال میں کسی مخصوص مذہب کی ملکیت نہیں ہے، یہ دراصل انسان اور خدا کے باہمی تعلق
کے نتیجہ میں وجود میں آتا ہے، یہ تعلق جتنا مضبوط ہوگا، فرد کی مذہبی زندگی اتنی ہی قابل رشک ہوگی، اسمتھ کے
نقطۂ نظر سے مذہب کی دو جہتیں ہوتی ہیں، ایک کو وہ انفرادی کیفیت کہتے ہیں، اور دوسرے اجتماعی روایات،
انفرادی کیفیت کو اسمتھ اپنی زبان میں Faith اور ہماری زبان میں "ایمان" کہتے ہیں، اگرچہ ایمان کی دولت کے بغیر
کوئی شخص مذہبی نہیں ہو سکتا، لیکن ایمان کو ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے، یہ چونکہ ایک اندرونی کیفیت ہے، اس لئے
ضروری نہیں ہے کہ ایمان میں، حالات کے تحت تغیر و تبدل نہ ہو سکے، اور ہر شخص کے ایمان کا پلہ بھی برابر نہیں ہو سکتا
ہے، دوسرے لفظوں میں اسمتھ "ایمان ہر کس بقدر ہمت اوست" کے قائل ہیں، افراد کی سطح پر کیفیت کے فرق کے باوجود
مذہب کی دوسری جہت یعنی کسی مذہب کے پیرووں کی اجتماعی روایات کا نام اسمتھ Cumulative Tradition
دیتے ہیں، ظاہر میں ان کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، اگرچہ ان میں زمان و مکان کے فرق کی وجہ سے تغیر اور
تبدل ہوتا رہتا ہے، تاہم ان روایات میں چونکہ ایک تسلسل ہوتا ہے، اس لئے وہ کسی مذہب کا مطالعہ کرنے کے لئے
بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، اور چونکہ روایات زمان و مکان کے فرق سے تبدیل ہوتی رہتی ہیں، اس لئے اگر اس جہت

Faith

اسمتھ نے اپنی طالبعلمانہ زندگی ٹورانٹو، پرنسٹن اور کیمبرج کی تعلیم گاہوں میں گذاری، لیکن وہ جہاں بھی رہے، ایک ممتاز طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ وہاں کے طالب علموں کی مذہب پسند تحریکوں میں بھی جوش و خروش سے حصّہ لیتے رہے، ان تحریکوں میں ان کا ساتھ جن دوسرے طلبہ و طالبات سے رہا، وہ بالعموم عیسائی مشنریوں کی اولادیں تھیں، اپنے انہی ساتھیوں میں سے ایک۔ خاتون موریل میکنزی اسٹر وتھرز کو انھوں نے ۱۹۳۹ء میں اپنی شریک حیات بنالیا، ۱۹۴۱ء میں ان کا تقرر "فارمین کرسچین کالج لاہور" میں استاد کی حیثیت سے ہوا، جہاں وہ ۱۹۴۷ء تک مقیم رہے، انکی علمی زندگی میں ہندوستان کا یہ چھ سالہ قیام بڑی اہمیت رکھتا ہے،" ہندوستانی اسلام" کا قریب سے مطالعہ کرنے کے بعد انھیں اپنے اس خیال کی صداقت کا پورا یقین ہوگیا کہ اسلام صرف مشرق وسطیٰ کی سرحدوں میں محدود نہیں ہے اور برصغیر کو نظر انداز کرکے اسلام کا مکمل مطالعہ ممکن نہیں ہے، انھوں نے اپنی سب سے پہلی کتاب" ماڈرن اسلام ان انڈیا" یہیں کے دوران قیام ۱۹۴۳ء میں شایع کی جس کا شمار آج بھی نیم کلاسیکی ادب میں کیا جاتا ہے، وہ اس وقت تک تاریخ کے تجزیاتی مطالعہ میں مارکسی معیارات کو بنیادی جگہ دیتے تھے جس کی جھلک اس کتاب میں صاف نظر آتی ہے اس کی اشاعت کے بعد مارکسی نقطۂ نظر کی وجہ سے انھیں مذہبی عیسائی دنیا کی تنقیدوں کا ہدف بھی بننا پڑا، ہندوستان آنے سے پہلے وہ کیمبرج میں ہیملٹن گب کی نگرانی میں دو سال تک عربی اور اسلامیات کا مطالعہ کرچکے تھے، یہاں سے واپسی پر انھوں نے پرنسٹن میں فلپ کے ہٹی کی نگرانی میں" مجلۃ الازہر تجزیہ و تنقید" کے موضوع پر مقالہ پیش کرکے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی، ۱۹۴۹ء میں وہ کمپیریٹیو ریلیجن کے پروفیسر ہوکر مکگل یونیورسٹی چلے آئے، جہاں دو ہی سال کے عرصہ میں انھوں نے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی بنیاد ڈالی، مکگل آنے کے پانچ چھ برس کے اندر ہی ان کی دوسری معرکۃ الآرا کتاب" اسلام ان ماڈرن ہسٹری" شایع ہوئی جس نے ان کو پورے عالم اسلام میں متعارف کرادیا، لیکن اس کتاب کے شایع ہونے کے بعد وہ صرف اسلام کو اپنا موضوع مطالعہ بنانے کے بجائے دنیا کے مختلف مذاہب، بلکہ نفس مذہب کا مطالعہ کرنے میں مشغول ہوگئے، انھوں نے مانٹریال ریڈیو سے "دوسروں کا مذہب" کے عنوان سے تعارفی تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا جو ۱۹۶۲ء میں The Faith Of Other Men کے عنوان سے کتابی شکل میں شایع ہوا، ۱۹۶۳ء میں انھوں نے مختلف مذاہب پر اپنی تحقیقات کا نچوڑ" مذہب کا مطلب و منتہیٰ" The Meaning and End Of Religion

سے دیکھا جائے تو ایک سے زیادہ مذاہب کا وجود ثابت ہو جاتا ہے، لیکن اگر اندرونی کیفیت یا ایمان کو مذہب کا معیار مانا جائے تو پھر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک سے زیادہ ایمان کا وجود ممکن ہے، ایمان کی اجتماعی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں لیکن ایمان ہمیشہ واحد ہی رہے گا، اسے جمع کے صیغے میں استعمال نہیں کیا جا سکتا، یہی وجہ ہے کہ اسمتھ اپنی تحریروں میں Faith کو ہمیشہ واحد کے صیغے میں لکھتے ہیں، اپنی پرانی تحریروں میں انھوں نے جہاں کہیں اسے ضرورۃً جمع کے صیغے میں لکھا تھا اسے دوبارہ اشاعت کے وقت Forms of Faith (ایمان کی مختلف شکلوں) میں بدل دیا ہے۔

ایمان اسمتھ کے نزدیک ایک انفعالی کیفیت کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک معاہدہ ہے جو بندہ اپنے خدا سے کرتا ہے جس کی رو سے وہ اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں ایمان کا اظہار ہوتا ہے اور وہ شکل اختیار کر لیتا ہے، خدا پر ہمارا ایمان جتنا زیادہ مکمل ہو گا اتنا ہی ہم اس کے تابع اور فرماں بردار بندے ہوں گے اسی اتباع اور فرماں برداری کو اسمتھ "اسلام" کہتے ہیں، اسلام ان کے نزدیک دراصل ایمان کے اظہار کا نام ہے، اس نتیجہ پر پہونچ جانے کے بعد وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ. لیکن اس کی تشریح میں وہ ہم سے اختلاف کرتے ہیں، ہم یہاں اسلام کو اسم معرفہ سمجھ کر اس سے اپنا مذہب اسلام مراد لیتے ہیں، اور اسمتھ اسے "اطاعت خداوندی" کے معنوں میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اسلام کے اسم فاعل "مسلم" کی تشریح بھی وہ لغوی اور اصطلاحی دونوں طرح سے کرتے ہیں، لغوی حیثیت سے تو مسلم کا مطلب ہے "فرمانبردار بندہ" لیکن اب اصطلاحاً مسلم ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو تاریخی مذہب اسلام کی پیروی کو ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں، اگر ہم بات کو واضح کرنے کے لئے تھوڑی دیر کے لئے دو الگ الگ ہم معنی لفظ "مسلم" اور "مسلمان" استعمال کریں جن میں اول الذکر کو لغوی معنوں میں اور آخر الذکر کو اصطلاحی معنوں میں، تو پھر اسمتھ بلا کسی جھجک کے انگریزی میں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ "میں مسلمان نہیں ہوں" لیکن اسی بات کو وہ عربی زبان میں "مسلم" کے لغوی معنی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے بارے میں "لست بمسلم" کہنے پر کبھی تیار نہ ہوں گے، کیونکہ اس اعلان کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ خدا کے فرمانبردار بندے نہیں ہیں، اور یہ بات ان کے عقیدے اور عمل کے مطابق درست نہیں ہے، خدا کی مرضی کو وہ جس حد تک اپنی صلاحیتوں کے مطابق سمجھ پائے ہیں اس کے تحت ان کی پوری زندگی ایک بندۂ مسلم کی زندگی ہے، اپنے کو بندۂ مسلم سمجھنے لیکن اصطلاحی معنوں میں مسلم نہ کہنے کی ایک وجہ تو ان کے خیال میں یہ ہے کہ وہ اتفاق سے کسی مسلم گھرانے میں نہیں پیدا ہوئے، اور دوسری

وجہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے اس دعوے سے متفق نہیں ہیں کہ اصطلاحی طور سے مسلمان ہوئے بغیر خدا کی مرضی کے آگے سر نہیں جھکایا جا سکتا، انھوں نے جس طریقہ سے اپنے کو خدا کے سپرد کیا ہے، وہی سپردگی ان کے نزدیک "الاسلام" ہے، کیتھولک انسائیکلوپیڈیا کی تشریح کے مطابق دین" یا "ریلیجن" خدا کے حضور بندوں کی اختیاری سپردگی کو کہتے ہیں"۔ پروفیسر اسمتھ کا اصرار ہے کہ اگر ہم کیتھولک پادریوں یا دوسرے عیسائی علمار کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھ لیں گے کہ وہ ریلیجن کی مذکورۂ بالا تعریف کے پیش نظر صبح و شام اپنی زبان میں "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللہِ الْاِسْلَامُ" کا ورد کر رہے ہیں، اسکے باوجود انھیں اس پر بھی اصرار ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہیں، گویا اسلام ان کا دین تو ہے، لیکن وہ مسلمان نہیں ہیں، یہ ظاہری تضاد بیانی اُس وقت ختم ہو جاتی ہے جب یہ واضح کر دیا جائے کہ عیسائی علمار اور پادری اور خود اسمتھ جس اسلام کو اپنا دین کہتے ہیں، وہ اس اسلام سے قطعاً مختلف ہے جو صدہا برس کے تاریخی اور سماجی عوامل کے نتیجے میں ایک خاص مذہبی طرز فکر کا مرادف بن گیا ہے۔

اسمتھ کو یقین ہے کہ اسلام کا جو مفہوم وہ سمجھ رہے ہیں، وہ قرن اول کے مسلمانوں کی تشریحات سے مختلف نہیں ہے، مثلاً طبری اور ان کے ہمعصر مسلمانوں کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ لوگ اسلام کا مفہوم اطاعت اور بندگی ہی لیتے ہیں، یہ تصور کہ اسلام ایک مذہب کی حیثیت سے ایک مکمل، جامع اور متعین نظام ہے، ان کے خیال میں کم از کم قرن اول کے مسلمانوں کے لئے اجنبی تھا، مثلاً قرآنی آیات "وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ" اور "رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا" کی تشریح کرتے وقت طبری اسلام کا مطلب بتاتے ہیں: الاستسلام لامری والانقیاد لطاعتی علی ما شرعت لکم من حدودہ و فرائضہ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلمان بھی طبری کی اس تشریح سے اختلاف نہیں کرتے کیونکہ وہ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ اسلام اللہ کی مقررہ حدود و فرائض کی پابندی کا نام ہے، اور اسمتھ بھی یہی کہتے ہیں، لیکن جب ہم اس سے آگے بڑھ کر تفصیلات میں داخل ہوتے ہیں تو ہم اور اسمتھ الگ الگ راہوں پر چل پڑتے ہیں، ہمارے نزدیک اللہ کی مقرر کردہ حدود و فرائض "من وعن" وہی ہیں جنھیں ہم شریعت اسلامیہ کہتے ہیں، اس لئے مسلمان ہونے کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں کہ انسان شریعت اسلامیہ کی بالادستی کو بھی قبول کرے، اسمتھ کو ہماری تشریح سے اتفاق نہیں ہے وہ اطاعتِ الٰہی کو شریعتِ اسلامیہ میں محدود نہیں سمجھتے، شریعت اسلامیہ، اسمتھ کے نزدیک دراصل مذہب کے اس رُخ سے تعلق رکھتی ہے جسے وہ اجتماعی روایات کہتے ہیں،

جس کا وجود ایک سے زیادہ شکلوں میں ممکن ہے، یہاں پر اسمتھ تقریباً وہی بات کہتے ہیں جو مولانا ابو الکلام آزاد نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے ذیل میں یا پاکستان کے عالم مولانا جعفر شاہ پھلواری ندوی نے اپنی کتاب "الدین یسر" میں دین اور شریعت کی بحث میں لکھی ہے، کہ "دین ایک ہے، ایک رہا ہے اور ہمیشہ ایک رہے گا، ہاں شریعتیں بدلتی رہتی ہیں"۔ اسی کے ساتھ ساتھ مولانا آزاد یہ بھی کہتے ہیں کہ دوسرے مذاہب کے لوگ اگر اپنی اپنی اصل شریعتوں پر صدق دلی اور ایمانداری کے ساتھ عمل کریں تو انھیں محسوس ہوگا کہ ان کی شریعتوں کی دعوت بھی بعینہٖ وہی ہے جس کی طرف اسلام لوگوں کو بلا رہا ہے، اگر بات اسی اجمال میں چھوڑ دی جائے تو شاید اسمتھ کو بھی مولانا آزاد کے اس نکالے ہوئے نتیجہ سے اختلاف نہ ہوگا ہاں ان میں اختلاف اس وقت ہوگا جب شریعت اسلامیہ کو ایمان کا مرادف قرار دیا جائے اور اس کے بغیر تکمیل ایمان کو ناممکن کہا جائے۔

اسمتھ کو "شماریات" سے بھی کافی دلچسپی ہے اور نتائج نکالنے میں اس سے مدد لیتے رہتے ہیں، ایمان اور اسلام کی بحث میں یہ دکھانے کے لئے کہ اصل چیز ایمان ہے اور قرآن نے اسی پر زور دیا تھا، لیکن جیسے جیسے مسلم سماج منظم ہوتا گیا اور دوسرے مذاہب کی طرح ایک مخصوص مذہب کی شکل اختیار کرتا گیا، ایمان کے بجائے اسلام پر زور دیا جانے لگا، قرآن میں ایمان اور اسلام، نیز ان کے مختلف مشتقات کی تعداد کی بنیاد پر اسمتھ نے ۸۵ (٪۸۵.۱) اور ۱۵ (٪۱۴.۹) کی نسبت دکھائی ہے، اس کے بعد انھوں نے قرن اول اور زمانہ وسطیٰ کی عربی کتابوں کے ناموں کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ۱۳۰۰ھ تک یہ نسبت ۸۵ اور ۱۵ کے بجائے ۴۰ اور ۶۰ کی ہو جاتی ہے، عہد جدید یا چودہویں صدی میں ایمان اور اسلام کا تناسب بالکل بدل جاتا ہے، اور دونوں میں سات (٪۷.۱) اور ۹۳ (٪۹۲.۹) کی نسبت رہ جاتی ہے، ان اعداد و شمار کی روشنی میں اسمتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آج اسلام کو جو ایک جامع نظام کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور یہ تصور پیش کیا جا رہا ہے کہ نزول قرآن کا بنیادی مقصد ایک مسلم کمیونٹی کا قیام تھا، وہ عہد جدید کی پیداوار ہے، اسمتھ کے خیال میں اگر قرآن کا یہی مقصد رہا ہوتا تو پھر وہ ان یہودیوں اور عیسائیوں پر تنقید نہ کرتا جو جنت کو اپنے مذہبی دائرہ میں محدود سمجھتے تھے۔

اسمتھ ایک طرف خدا پر ایمان رکھنے کے باعث اپنے کو "مسلم" بھی کہتے ہیں، اور دوسری طرف وہ اس تاریخی حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرتے کہ "مسلم" ایک اسم معرفہ ہے، اس کا اطلاق اُن لوگوں پر ہوتا ہے جنھوں نے محمد صلعم

کے ذریعہ ایمان کی دولت پائی ہے، اسی لئے وہ مسلمانوں اور ان کے مذہب کو صرف "مسلم" اور "اسلام" کے الفاظ سے متعارف کراتے ہیں، یورپ میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے مختلف زبانوں میں جو نام رائج رہے ہیں، ان کے بارے میں اسمتھ کا یہ خیال ہے کہ وہ کسی بدنیتی یا توہین کے باعث نہیں تھے، یورپ جن جن طریقوں سے اسلام سے واقف ہوا اسی قسم کے نام وہ اسے دیتا گیا، کسی زمانہ میں اسے "گروہ ساراسین" کہا گیا، پھر جب ریناساں اور ریفارمیشن کے دور میں ریلیجن (مذہب) کی اصطلاح یورپ میں رائج ہوئی تو اسلام کو "مذہب ساراسین" بتایا گیا، پھر اسے تاتاریوں اور ترکوں کا مذہب" نام دیا گیا، حیرت یہ ہے کہ سترہویں صدی میں پہلی بار جب یورپ نے لفظ اسلام کا استعمال کیا تو اس وقت بھی اسے مذہب کے لئے نہیں، بلکہ اہل مذہب کے واسطے بولا گیا، اور اسلام کی تعریف "کیتھولک یا صحیح العقیدہ مسلمان" Right Believing کے الفاظ سے کی گئی، انیسویں صدی تک یورپ کی تحریروں میں ہمیں اس قسم کے جملے مل جاتے ہیں، جن میں کہا گیا ہے کہ "اپنے عقیدہ کے اعتبار سے تم ایک اسلام ہو" جب تک اسلام بمعنی مسلم مستعمل رہا اس وقت تک مذہب اسلام کے لئے "اسلام ازم" کا لفظ رائج رہا، انیسویں صدی سے محمڈن اور محمڈن ازم کے الفاظ مختلف ہجے کے ساتھ رائج ہوئے، اس صدی کے نصف اول سے بالعموم اسلام اور مسلم بولا جانے لگا۔

خود اسمتھ نے اپنی تحریروں میں ہمیشہ یہی دو الفاظ استعمال کئے ہیں، بلکہ ان الفاظ کو رواج عام دینے کے لئے وہ پچھلے چالیس پینتالیس برسوں سے قلمی اور زبانی جہاد بھی کر رہے ہیں، اس معاملہ میں وہ اس حد تک زود حس ہیں کہ ۱۹۲۹ء میں جب ان کے استاد سر ہیملٹن گب کی مشہور زمانہ کتاب "محمڈن ازم" شائع ہوئی تو اسمتھ نے کتاب کے نام کو پسند نہیں کیا اور نہ ہی وہ گب کی اس معذرت سے متاثر ہوئے کہ یہ نام ان کی اپنی پسند سے نہیں، بلکہ ناشر کی تاجرانہ پالیسی کی وجہ سے رکھنا پڑا، لیکن اب اسمتھ آہستہ آہستہ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ اس معاملہ میں خود ان کا بے لچک اصرار شاید ضرورت سے کچھ زیادہ ہے، اور گب کی کتاب کے عنوان کو بالکل ہی بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا، اسمتھ نے کھل کر تو یہ بات نہیں کہی ہے کہ وہ اب اسلام کے بجائے محمڈن ازم کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب اگر کوئی شخص اسلام کے بجائے محمڈن ازم پر اصرار کرے تو اسمتھ کا رد عمل اتنا سخت نہ ہوگا جتنا گب کی محمڈن ازم شائع ہونے کے وقت تھا، اس کا سبب معلوم کرنے کے لئے ہمیں اسمتھ کے ایک اور خیال کا جائزہ لینا پڑے گا۔

اسمتھ کے خیال میں کسی بھی مذہب کا صحیح اور مکمل مطالعہ اس مذہب کے ماننے والوں کے احساسات اور جذبات

ان کے افکار و اعمال، نیز مذہب کے تاریخی تسلسل اور "شعار" Symbol کو نظر انداز کر کے صرف ان کی کتابی الہیات کی روشنی میں نہیں کیا جا سکتا، اسلام میں رسول اللہ صلعم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اسے ہمیں فراموش نہیں کرنا چاہئے، اپنی کتاب The Faith of Other Men میں انھوں نے دنیا کے چند بڑے مذہبی طریقوں کا تعارف کراتے ہوئے مذہبی شعار یا Religious Symbol کی بحث اٹھائی ہے، اور بتایا ہے کہ ہر مذہب کا ایک نہ ایک شعار ہوتا ہے، کسی مذہب میں یہ شعار صوری ہوتا ہے، جیسے عیسائیوں کی صلیب، اور کہیں معنوی ہوتا ہے جیسے اسلام کا کلمہ شہادت، کلمہ شہادت سے ایک مسلمان اگر ایک طرف اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے تو ساتھ ہی ساتھ اس کی بھی شہادت دیتا ہے کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، کلمہ شہادت کی تشریح کرتے ہوئے اسمتھ یہ بتاتے ہیں کہ کلمہ کے دوسرے جزو محمد رسول اللہ کے ذریعہ آنحضرت صلعم کے رتبہ کا تعین مقصود نہیں ہے، بلکہ اس کی مراد آپ کے منصب کا اظہار ہے، اس منصب کی رو سے رسول اللہ حقیقتاً انسانوں تک "مرضیٔ الٰہی" کی ترسیل کا ایک ذریعہ تھے، اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے مسلمانوں کے ان باہمی مناظروں کو یاد کریں جو "ذات نبویؐ" کے تعین کے سلسلہ میں ہوتی رہی ہیں، اور آج بھی ان کا سلسلہ جاری ہے تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ اسمتھ ایک طرح سے ان مسلمان علماء کے ہمنوا ہیں جنھیں خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت کے درمیان واضح خط کھینچنے کے الزام میں مختلف خطابات سے نوازا جاتا رہا ہے، لیکن مسلمانوں کو اپنے رسول سے جو جذباتی محبت ہے اسے کس طرح نظر انداز کر دیا جائے" با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار" کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان اللہ کے ساتھ تو بے تکلفی برتنے کی جرأت کر لیتا ہے لیکن رسولؐ کے معاملہ میں اسے محتاط رہنا پڑتا ہے، ایک مسلمان توحید خالص پر عقیدہ رکھنے کی وجہ سے کسی رسول یا نبی کو اللہ کی الوہیت میں شریک تو نہیں مانتا، لیکن اس کے باوجود وہ عشق رسول کا مظاہرہ ان الفاظ میں بھی کرتا ہے ؎

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہو کر — اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفےٰ ہو کر

اس موقع پر ہمیں "نور محمدی" اور "امتناع نظیر" کی بحثوں کو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے جس نے اس عقیدہ کو جنم دیا کہ "الوہیت نے جب تعین اختیار کیا تو وہی حقیقت محمدیہ" ہو گئی اور یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ مسلمان آنحضرتؐ کو صرف خدا کا قاصد نہیں بلکہ شارع بھی مانتے ہیں، آپؐ کے فرمودات کا درجہ اگرچہ قرآن کے بعد آتا ہے، لیکن اسے "ناسخ قرآن" کہنے والے لوگ بھی اسی دنیا میں موجود ہیں، مسلمانوں کی یہ کلامی بحثیں بھلے ہی عمومی نہ ہوں لیکن اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں

کے عقیدے کے مطابق اسلام کی تکمیل (خواہ اسے لغوی معنوں میں بولیں یا اصطلاحی معنوں میں) ذات اقدس کے بغیر ممکن نہیں ہے، دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صحیح اسلام (یا اسمتھ کے لفظوں میں صحیح طریق سپردگی)، مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق وہ ہے جس کا نمونہ رسول اکرمؐ نے اپنے قول و عمل سے پیش کیا، اس پس منظر میں جب ہم اسلام کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اسمتھ اپنے اس خیال میں بہت حد تک حق بجانب نظر آتے ہیں کہ اسلام کو اگر کوئی شخص محمڈن ازم (یا محمدیت) کے عنوان سے پیش ہی کرتا ہے تو اس کے پاس اس کے لئے کچھ نہ کچھ بنیادیں ہوتی ہیں،

آپ نے ایسے مضامین پڑھے ہوں گے جن میں ایک شاعر یا افسانہ نگار یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ افسانے کیوں لکھتا ہے، یا شعر کیوں کہتا ہے، اسمتھ نے اس قسم کا کوئی مضمون نہیں لکھا ہے، یا کم از کم میری نظروں سے نہیں گزرا ہے کہ وہ اسلامی موضوعات پر کیوں لکھتے ہیں، لیکن اگر اس سوال کا جواب ہم ان کی مختلف تحریروں میں تلاش کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ نہ تو اتنے بددیانت ہیں کہ دنیا کے سامنے اسلام کی غلط تصویر پیش کرنے کی خاطر اس میدان میں آئے ہیں، اور نہ ہی اتنے خوش فہم ہیں کہ سمجھتے ہوں کہ وہ اس طرح چند مسلمانوں کے دلوں میں گھس کر انھیں اسلام سے برگشتہ کر سکیں گے، اور یوں عیسائیوں کی تعداد میں اضافہ کا سبب بنیں گے، اسمتھ کو اس بات پر انشراح صدر ہے کہ یہ دور بڑے پیمانہ پر اجتماعی تبدیل مذہب کا نہیں ہے، اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ عالمی سطح پر انسانی معاشرہ اتنا کاسموپولیٹن ہوتا جا رہا ہے کہ اب ایک عیسائی یا ایک یہودی، یا ایک "لاادریا" Agnostic خود اپنے گھر میں اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ اس کا پڑوسی ایک ذہین، باعمل، متقی، پرہیزگار بدھسٹ ہو یا ہندو ہو یا مسلمان ہو، اب ان سب کو اگر ایک ساتھ رہنا ہے تو انھیں ایک دوسرے کے مذہب سے بھی پوری واقفیت رکھنی چاہیے۔

یہاں ایک مسئلہ اور چھیڑنے کو جی چاہتا ہے، اکثر لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر مستشرقین اپنے اس دعوے میں صادق ہیں کہ وہ اسلام کا مطالعہ خالص نیت کے ساتھ کرتے ہیں تو پھر وہ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے، یہ سوال خاصا اہم ہے، اور چند لفظوں میں اس کا جواب نہیں دیا جا سکتا، ممکن ہے کہ کسی دوسرے پرچہ میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہو لیکن جہاں تک اسمتھ کا سوال ہے، ان سے اگر خود انھی کے بارے میں یہ بات پوچھی جائے تو ممکن ہے وہ پلٹ کر جواب دیں کہ کیوں، آخر میں مسلمان کیوں ہو جاؤں؟ جب میں خود ایمان کی دولت سے سرفراز ہوں اور عیسائی ہوتے ہوئے مجھے قلب کا اطمینان حاصل ہے، تو پھر میں اپنا مذہب کیوں چھوڑوں، جی نہیں شکریہ! لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ،

قرآن اور مستشرقین

از

جناب سید اطہر حسین ریٹائرڈ آئی ۔ اے ۔ ایس، لکھنؤ

قرآن اپنے آپ کو الفرقان یعنی حق و باطل میں امتیاز کرنے والا کہتا ہے، اس کا پورا مضمون گویا ان الفاظ میں جمع ہوگیا ہے ۔

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ	حق آگیا اور باطل نابود ہوگیا، تحقیق کہ باطل
إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا	اسی لئے تھا کہ نابود ہو کر رہے

(۱۷ ۔ ۸۱)

قرآن کی غرض وغایت حقیقت الٰہیہ کو پیش کرنا ہے، قرآن دراصل مجسم سچائی اور قانون ہے، وہ تذبذب اور شک وشبہ یا بالفاظ دیگر باطل اور گناہ کو نیست ونابود کرتا ہے، باطل سے مراد یہ عقیدہ رکھنا کہ ذات مطلق کا وجود ہی نہیں ہے، یا یہ کہ اس کی ایک اضافی حیثیت ہے، یا یہ کہ ذات مطلق ایک سے زیادہ ہو سکتے ہیں، یا یہ کہ خود اضافی ہستی ہی ذات مطلق ہے ۔

اسلام کی بنیاد ذات مطلق سے تعلق رکھتی ہے، قرآن کی رو سے اس کی ذات کا یقین فطرت انسانی میں ودیعت کر دیا گیا ہے، انسان کی تخلیق پر اسے ذات مطلق کی جھلک ملی تھی، اور اسے مقصد کائنات اور اشیاء کے اسرار ومفہوم سے واقفیت کرادی گئی تھی، یہ امر اس کی فطرت کے خلاف ہوگا کہ وہ کائنات کے قوانین اور اشیاء پر غور کرے، اور خالق کائنات سے انکار کردے، کائنات میں جو منصوبہ، توازن اور ہم آہنگی کی کارفرمائی ہے، وہ خود بزبان حال پکار پکار کر کہتی ہے کہ ان کا خالق عظیم ترین وجود ہے، جو کائنات کا مالک ہے، اور جسے اقتدار اعلیٰ حاصل ہے ۔

دوسرے الہامی مذاہب کے برخلاف اسلام کا سب سے بڑا اور بنیادی عقیدہ ہے، کہ کوئی الوہیت یا حقیقت الٰہی یا ذات مطلق توحید باری تعالیٰ یعنی حقیقت الحقائق یا ذات مطلق کے سوا نہیں ہے، اور تمام انبیاء علیہم السلام

انسانیت کو یہی پیغام پہنچانے کے لئے مبعوث ہوئے تھے، قرآن صرف توحید باری تعالیٰ پر زور دیتا ہے، بلکہ اس پر بھی یقین لازمی ہے، کہ اپنی اصلی شکل میں تمام انبیاء علیہم السلام کا یہی عقیدہ اور پیغام تھا، قرآن کسی ایک فرقہ، یا قوم یا گروہ کے لئے نہیں ہے بلکہ پوری انسانیت کے لئے پیغامِ خداوندی ہے، تمام الہامی مذاہب کی ایک ہی بنیاد تھی، اور صرف شریعت اور قوانین و دستور میں جزوی فرق اس وقت کے معاشرہ اور ذہن انسانی کے عروج کے اعتبار سے تھا، لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، دوسرے مذاہب کے پیروؤں نے تحریف و تخریب سے کام لیکر ان کی شکل بگاڑ دی، پیغامات کو اصلی رنگ و روپ میں پیش کرنے کے لئے اور لوگوں کو ان کے انحراف اور تخریب پر آگاہ کرنے کے لئے اور حقیقی اور ازلی صراط مستقیم پر لانے کے لئے یہ آخری پیغام خداوندی خاتم الانبیاء سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نازل ہوا، یہ وحی اس وقت نازل ہوئی، جب عقل و دانش کے دور کا آغاز ہو چکا تھا، اور انسان غور و فکر اور تدبیر سے کام لینے لگا تھا، اور حقائق کی قدر و قیمت پہچان سکتا تھا، اور انسان کی مادی ترقیوں نے وہ ذرائع فراہم کرائے کہ پیغام خداوندی عالم کے کونے کونے تک پہنچ سکتا تھا، قرآن کہتا ہے کہ اسلام انسان کا فطری مذہب ہے' اور اس فطرت کے مطابق ہے جس پر انسان کی تخلیق ہوئی، اور خداوند کریم کے دستور اور طور و طریقہ میں کبھی کوئی فرق نہیں ہوتا ہے، اور اسلام ہی صحیح مذہب ہے۔

صرف اس وجہ سے کہ اسلام عقیدۂ تثلیث کا حامی نہیں ہے، عیسائی مشنری اور یہودی پیشواؤں نے اور ان کے زیر اثر مستشرقین نے اسلام پر بے بنیاد الزامات تراشے اور اس کی مذمت کی، اپنے عقیدوں اور اصولوں کی بقا اور برتری ثابت کرنے کے لئے ان مستشرقین نے اس بات پر سب سے زیادہ زور دیا کہ قرآن کتاب الٰہی نہیں ہے، بلکہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق ہے، اور جو اس میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات و قصص ہیں، وہ عیسائیوں اور یہودیوں کی کتابوں سے لئے گئے ہیں، اور یہ کہ قرآن کی آیتوں میں تکرار ہے، اور کہیں ناقابل فہم ہیں اور قرآن کی موجودہ سورتوں اور آیتوں کی ترتیب میں کوئی منطق نہیں ہے،

ان تمام اعتراضات اور مفروضات کا ماخذ عیسائیوں کی مشنری کاوش ہے جس کا نصب العین اسلام کے چہرے کو داغدار دکھانا تھا، اس کی تبلیغ و اشاعت میں رکاوٹ پیدا کرنا تھا، اور اپنے مذہب کی فوقیت ظاہر کرنا تھا، یہ اعتراضات اور مفروضات قرآن کے بنیادی اصول اور عقائد سے لاعلمی پر یا قرآن کے طرز بیان سے ناواقفیت یا ان غلط تراجم پر مبنی ہیں، جو مستشرقین کے ہاتھوں انجام پائے تھے، جنھوں نے نادانستہ یا دانستہ طور پر قرآن کی بہت سی آیتوں کے معنیٰ و

مفہوم کو بدل کر یا مسخ کر کے پیش کئے اور علمی تحقیق اور صحیح جائزے کے منافی ہیں، شروع میں یہ اعتراضات اور ریشہ دوانیاں بھونڈے طریقہ یا بدزبانی کے ساتھ اٹھائے گئے، لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا گیا اور تحقیقی کاموں میں کچھ صداقت آنے لگی اور اسلام کے تہذیب وتمدن اور اس کے اثاثہ کی گہرائی وسعت اور حقیقت کا زیادہ انکشاف ہوتا گیا، تو انھوں نے تنقید کا طریقہ بدل دیا، اور اپنی ستائش آمیز حکمت عملی کے ساتھ تیر ونشتر لگانے لگے۔

جارج سیل نے جنھوں نے انگریزی زبان میں سب سے پہلی بار قرآن کا ترجمہ ۱۷۳۴ء میں کیا، اپنے ترجمہ کے دیباچہ میں لکھا ہے، کہ اس سے قبل جو لاطینی زبان میں ترجمے تھے، ان میں اصل سے انحراف تھا، بیلینڈ Bibliander نے جو ۱۵۴۳ء میں لاطینی زبان میں ترجمہ کیا، اس کو ترجمہ ہی نہیں کہا جا سکتا ہے، کیونکہ اس میں اتنی کثیر غلطیاں ہیں، اور اتنی جسارت سے کام لیا گیا ہے، اور اتنی چیزوں کا اخفا کیا گیا ہے، یا تبدیلی کی گئی ہے کہ اس کی اصل سے کوئی مطابقت یا مماثلت نہیں ہے، ایک اور مستشرق کے لاطینی ترجمہ کے متعلق جارج سیل نے لکھا ہے کہ وہ اور بھی ناقص ہے، اور جو ترجمہ Ardree Arrivaabere نے فرانسیسی زبان میں کیا ہے، وہ کسی طرح ترجمہ کہلانے کے لائق نہیں ہے، کیونکہ اس کے ہر صفحہ پر بے شمار غلطیاں ہیں، جا بجا تحریف یا اضافے ہیں، اور آیتوں کو مسخ کیا گیا ہے، جو ناقابل معافی ہے، اسی فرانسیسی ترجمہ کو الکزنڈر روز Alexander Ross نے انگریزی زبان میں کیا، جس کے متعلق جارج سیل کی رائے ہے، کہ Alexander Ross عربی زبان کے متعلق نہیں جانتے تھے، اور نہ انھیں فرانسیسی زبان پر عبور تھا، اور انھوں نے Duryer کی غلطیوں میں اپنی طرف سے اضافہ کیا، اور انھوں نے بہت ہی مذموم زبان استعمال کر کے ترجمہ کو مضحکہ خیز کر دیا Father Lewis Marracci نے ایک لاطینی زبان میں ۱۶۹۸ء میں ترجمہ کیا تھا جس کے متعلق سیل نے یہ اظہار خیال کیا ہے، ان کی تفسیر اور ترجمہ میں تمام تر تکرار ہے جس کی وجہ سے ضخامت تو بڑھ گئی مگر نا ہی غیر اطمینان بخش ہے، اور کہیں کہیں زبان میں جسارت اور گستاخی سے کام لیا گیا ہے،

خود اپنے ترجمہ کے متعلق سیل کا کہنا ہے کہ ان کا مقصد اس غلط فہمی کو دور کرنا ہے، جو لوگوں میں بہتر ترجموں سے پیدا ہو گئی ہے، اور Protestants ہی کامیابی کے ساتھ قرآن پر حملہ کر سکتے ہیں اور بھروسہ ہے کہ قدرت نے Protestant کا ہی انتخاب کیا ہے کہ وہ قرآن کو شکست فاش دیں، انھوں نے اُن کے پیش رو مترجموں اور مستشرقین

کی مذمت کی، جنھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی یا قرآن عظیم پر بے بنیاد الزامات تراشے اور نہایت ہی قابل اعتراض زبان استعمال کی، مگر اپنی بے لوث کوشش اور فراخ دلی کے متعلق فرماتے ہیں، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نعوذ باللہ کتنے ہی بڑے مجرم کیوں نہ رہے ہوں، کہ انھوں نے انسانیت پر ایک غلط مذہب تھوپا، مگر ان کی ذاتی صفات سے انکار نہیں ہوسکتا ہے، اور میں لائق اور متقی Spanhemius کو داد وتحسین دیتا ہوں کہ ہر چند وہ سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (نعوذ باللہ) ایک جعل ساز تھے، مگر انھیں بھی تسلیم ہے کہ قدرت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام کمالات سے متصف کیا تھا، جس میں جسمانی خوبصورتی، لطیف زیرکی، اخلاق حمیدہ، غربا پروری، تواضع، حریفوں اور غنیموں کے مقابلہ میں استقلال وثابت قدمی، خدا کی حمد وستائش کرنے والے مکاروں، زناکاروں، قاتلوں، حریصوں، افترا پردازوں کے خلاف سخت شامل تھی، اور ہمت واستقلال، سخاوت، ترحم، شکر، والدین اور بزرگوں کی عزت کے بڑے داعی ومبلغ تھے، اور ہمہ وقت حمد باری تعالیٰ میں لگے رہتے تھے،

جارج سیل نے خود حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی توصیف ان الفاظ میں کی ہے، آپ کی ہوش مندی، عاقلانہ و کریمانہ برتاؤ اور رویہ جس کے تحت اپنے مشن میں مصروف رہے، اسی جاہلانہ اعتراض کی تردید کرتے ہیں، کہ آپ ایک سخت خو مذہبی پیشوا تھے، سورۂ فاتحہ کے متعلق وہ کہتا ہے، کہ اگر یہ مان لیا جائے، کہ آپ کے جذبات وخیالات کی صحیح ترجمانی کرتی ہے، تو وہ دیدہ ودانستہ جعل سازی سے کام نہیں کرتے تھے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سورۂ فاتحہ نماز کی ہر رکعت میں بڑے خضوع وخشوع سے پڑھتے تھے، لیکن جارج سیل نے اس میں شک ظاہر کرنے سے گریز نہیں کیا،

Rd. E. M. Wherry نے سیل کے ترجمہ کو اپنی تفسیر کے ساتھ چار جلدوں میں شائع کرایا، اور خود دیباچہ میں انکشاف کرتے ہیں کہ یہ تفسیر اپنے جیسے لوگوں کے لئے ہے، جو مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ میں لگے ہوئے ہیں، انھوں نے اپنے فاسد خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ نعوذ باللہ قرآن خود ثبوت فراہم کرتا ہے کہ وہ جعل سازی کی پیداوار ہے، اور پیغمبر اسلام کا یہ جھوٹا دعویٰ ہے کہ قرآن سابقہ کتب الٰہی کی تصدیق کرتا ہے، اس نے اپنا مقصد ان الفاظ میں واضح کیا کہ منازعہ اور نزاع کی تمام تنقیحات کو اس وجہ سے واضح کیا جارہا ہے کہ مسلمانوں کو اس عظیم ہستی حضرت عیسیٰؑ کا صحیح علم ہوجائے جن کے متعلق تمام انبیاء علیہم السلام نے پیشین گوئی کی کہ وہ خداوند قدوس کے فرزند تھے، اور گنہ گاروں کے نجات دہندہ،

ان تمام تراشیدہ الزامات اعتراضات، بہتان، اور مفروضات پر بحث کرنے اور ان کو تمامتر غلط ثابت کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ وہ تمام باتیں سامنے لائی جائیں جو بین اور ناقابل تردید ثبوت پیش کرتی ہیں کہ قرآن عظیم کسی انسان کی تخلیق ہو ہی نہیں سکتی، اور خالق کائنات کے سوا اس کا کوئی خالق نہیں ہو سکتا ہے، اللہ تعالیٰ قرآن میں خود فرماتا ہے :-

"اس کتاب کو ہم نے آپ (محمدؐ) پر اس لیے نازل کیا ہے، کہ آپ بنی نوع انسان کو ان کے رب کے حکم سے تاریکیوں سے نکال کر خدائے غالب و ستودہ صفات کے نورانی راستے کی طرف لے جائیں" (ابراہیم)

"اور جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جو (قرآن) آپ پر نازل کیا گیا ہے، وہ حق ہے، اور اس خدا کا راستہ بتاتا ہے جو غالب اور محمود ہے" (سبا)

یہ ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شبہ نہیں ہے، پرہیزگاروں کے لئے (چشمہ) ہدایت ہے،

قرآن خود اس بات کی شہادت دیتا ہے، کہ وہ اللہ کا کلام ہے، قرآن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی تو بالراست مخاطب کرتا ہے۔ اور کبھی بصیغہ غائب، اس کا انداز بیان حدیث سے مختلف ہے، اگر احیاناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی لغزش ہو جاتی، یا کسی معاملہ میں آپ کو پس و پیش ہو، تو وحی الٰہی سے آپ کی رہنمائی ہو جاتی تھی، اور کبھی کبھی آپ کو اس کا انتظار کرنا پڑتا تھا،

جو لوگ قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں شک و شبہ کرتے ہیں، انھیں قرآن پہلے تو یہ چیلنج دیتا ہے، کہ اس کے مماثل کوئی کتاب پیش کریں، اگر ایسا نہیں کر سکتے، تو یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اس کے ان سورتوں کے مماثل سورتیں بنا لائیں اس کے بعد چیلنج دیتا ہے، کہ کم از کم ایک سورہ کے مانند یا اس سے ملتی جلتی ہی کوئی سورہ بنا کر پیش کریں، واضح رہے کہ یہ چیلنج صرف زمانۂ نزول قرآن کی حد تک محدود نہیں تھا، بلکہ ہر زمانہ اور ہر وقت کے لئے کھلا ہے، قرآن نہ صرف اپنے مضامین کی بلند پائگی اور اپنے پیام کے اعتبار سے بے نظیر اور ناقابل نقل ہے، بلکہ اپنے باوقار اسلوب بیان، تشبیہ و استعارات کے تنوع اور الفاظ میں عکاسی کے لحاظ سے بھی بے مثل ہے، اس کی اہمیت اور اس کا طرز بیان انسانی طاقت سے باہر اور ناقابل تمثیل ہے، قرآن کی ادبیت کا کچھ اندازہ جامع الازہر کی حسب ذیل تحریر سے ہوتا ہے،

(۱) قرآن کا انداز بیان نہ کسی مہذب شہری کی بزم نگاری و نزاکت کے مانند ہے، اور نہ ایک خانہ بدوش

بدوی کی درشت کلامی کے مماثل ہے، بلکہ وہ اول الذکر کی شیریں کلامی اور ثانی الذکر کے زور کلام کا حسین مجموعہ ہے،

(۲) نثر میں الفاظ کا وزن اور نغمہ اس طرح برقرار رکھا گیا ہے، جیسا کہ منظوم کلام میں ہوتا ہے، وقفے نہ بالکل نثر کی شکل میں آتے ہیں، نہ نظم کی صورت میں بلکہ عبارت میں موزونیت اور نغمہ کا ایک نرالا تناسب پایا جاتا ہے،

(۳) الفاظ کا انتخاب ایسا ہے کہ نہ وہ ٹکسال باہر ہیں، اور نہ ایسے جن سے کان آشنا نہ ہوں، بالفاظ دیگر شوکت الفاظ کا وہ عالم ہے کہ کہیں بھی فصاحت سے تجاوز نہیں،

(۴) جملوں کی ترکیب شاندار ہونے کے باوجود کم سے کم الفاظ میں بلند سے بلند خیالات کا اظہار ہوا ہے،

(۵) اظہار خیال ایسے مختصر جامع مگر سلیس الفاظ میں کیا گیا ہے کہ معمولی سمجھ کا آدمی بغیر کسی دقت کے قرآن کا مفہوم سمجھ سکتا، . . . .

(۶) قرآن میں وہ باریک بینی، لچک اور تنوع ہے کہ وہ اسلامی علوم وفنون کے علاوہ شریعت و فقہ کی بنیاد کا کام بھی دیتا ہے۔

(۷) نفسیات کا یہ قانون ہے کہ عقل اور جذبات باہم متضاد ہوتے ہیں، مگر قرآن کی عبارت اس قانون سے بالاتر ہے، کیونکہ وہ مافوق البشر ہستی کی بنائی ہوئی ہے، قرآن میں عقل اور جذبات کی باہم متضاد قوتوں میں حیرت انگیز ارتباط پایا جاتا ہے، اور قرآن میں عبارت کی متانت اور عظمت حیرتناک طریقہ پر برقرار رکھی گئی ہے، اور یہ کہیں بھی ٹوٹنے نہیں پاتی ہے،

(۸) جب ہم کسی ایسے جملہ یا چند جملوں کی ساخت سے گذر کر جو ایک ہی مضمون پر مشتمل ہوں غور کرتے ہیں، بلکہ بحیثیت مجموعی پورے قرآن کی ہیئت ترکیبی پر غور کرتے ہیں، تو ہم ایک ایسا ہر جہتی نقشہ یا منصوبہ پاتے ہیں، جو انسانی دماغ کی پیداوار نہیں ہو سکتا ہے،

اسلام کی بے پناہ اشاعت بھی قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کا ایک ثبوت ہے جیسا کہ ایک مشہور مصنف اور فلسفی کہتا ہے،

قرآن کے آسمانی کتاب ہونے کا ثبوت نہ صرف اس کے پیش کردہ عقائد، اس کی نفسیاتی اور مابعد الطبیعیاتی صداقت اور جادو بیانی سے ہوتا ہے، بلکہ اس کے بیرونی اثرات اور اسلام کی معجزانہ اشاعت سے بھی یکساں طور پر ظاہر ہوتا ہے،

قرآن نے پہلے سے ہی پیشین گوئی کردی تھی، کہ اسلامی تحریک کن کن مراحل سے گذرے گی، (سورہ ۔ ۳۴) مخالفین کے ردعمل کی پیشین گوئی ہو چکی تھی، کہ کس طرح وہ ابتدا میں بے فکر رہیں گے، پھر کچھ موافقت اور دلچسپی کا اظہار کریں گے، پھر مخالفت اور دشمنی پر اتر آئیں گے، پہلے اور سخت مقابلہ میں اہل مکہ کی مسلمانوں کے ہاتھ شکست ہوگی، قرآن نے اسکی

بھی پیشین گوئی کر دی تھی کہ اسلام کی فتح ہو گی، اس کے عقائد اٹل اور ابدی ہیں، اس کی نوزائیدہ حکومت ترقی پذیر رہیگی، اور دنیا کی کوئی طاقت اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹا نہیں سکتی ہے، (۱۳۔۱۸ و ۱۴۔۲۴ و ۵۵ و ۸۔۳۶) اسلامی مشن کے انصرام حتی کہ پیغمبر اسلامؐ کی وفات کا پیشگی سے اعلان ہے، کوئی چیز گڑھی ہوئی نہیں ہے، بلکہ ہر تفصیل ایک بے داغ منفق کا جزء لاینفک کا کام دیتی ہے،

قرآن جستہ جستہ طور پر حسب ضرورت تیئیس سال کی مدت میں نازل ہوا، قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ ہر سورہ یا آیۃ نہ صرف پیدا شدہ حالات کے متقاضی تھی، بلکہ قرآن کے پورے پلان کے مطابق بھی تھی، جیسے جیسے قرآن نازل ہوتا گیا، آیتوں و سورتوں کو ترتیب دینے کا کام ہوتا گیا، اور آیتوں کی نمبر اندازی کر دی گئی، ہر آیت کے دو سلسلے ہیں ایک بحسب تنزیل اور دوسرا بحسب ترتیب، سلسلۂ نزول کے اعتبار سے ہر آیت اس وقت کی ضرورت کے لائق تھی، اور پورے پلان کے لحاظ سے ہر آیت ماقبل آیت اور بعد کی آیتوں سے مربوط ہو گئی، سلسلۂ تنزیل کے اعتبار سے آیتوں میں رابطہ، تسلسل، ہم آہنگی، اور منطقی ارتقا تھا، اور جب اس ترتیب سے بالکل مختلف ترتیب میں آیتوں کو پرو دیا گیا، تب بھی اتنا ہی اعلیٰ رابطہ، تسلسل، ہم آہنگی، اور منطقی ارتقا پایا جاتا ہے، اگر یہ غور کیا جائے کہ قرآن میں ۱۱۴ سورتیں ہیں، اور ان میں سے زیادہ تر سورتیں ایسی ہیں، جو مختلف سنین میں جستہ جستہ اور کئی کئی سال کے وقفہ سے نازل ہوئیں، تو استعجاب حیرت میں بدل جاتا ہے، یہ انسانی کام نہیں بلکہ معجزہ ہے، یہ بالکل ظاہر ہے کہ اگر کوئی بھی مصنف پہلے سے ایسا کوئی خاکہ یا منصوبہ بنائے، تو اس کے لئے یہ جاننا ضروری ہو گا کہ آئندہ ۲۳ سال میں کیا کیا واقعات رونما ہوں گے، کون کون سے مسائل درپیش ہوں گے، الفاظ کی کیسی موسیقیت ہو گی، اور آنے والی آیتوں کا اس خاکہ میں کون کون سا مقام ہو گا، ظاہر ہے کہ قرآن کا مصنف خدائے عالم الغیب کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔

قرآن کوئی سائنس کی کتاب نہیں ہے، مگر وہ بہت سے مظاہر قدرت کی نسبت اشارے یا معلومات بہم پہنچاتا ہے جن کے متعلق انسان کو صدیوں بعد تک مطلق کوئی علم نہیں تھا، چند مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

زمین کی گولائی اور گردش (۳۹۔۵۱)

سینہ کی تشکیل، (۴۰۔۶۸)

ہوا کے ذریعہ نر و مادہ پھولوں کے تولیدی مادہ کا اتحاد، (۱۵۔۲۲)

تمام اشیاء میں زو مادہ کا وجود، (۳۶-۳۵)
چاند سورج اور سیاروں کا مقررہ برجوں میں گردش، (۳۶-۲۹ تا ۳۸)
سورج کی از خود روشنی اور چاند کا اس کی روشنی سے منور ہونا،
تمام جانداروں کا آبی ماخذ، (۲۱-۳۰)
شہد کی مکھیوں کا طرز زندگی، (۱۶-۹۶)
بچہ کی رحم مادر میں تدریجی تشکیل اور اس کے تین پردوں میں رہنا، (۲۳-۲۲-۱۴)

اس کے علاوہ واقعہ پڑھیے اور قرآن خود گواہی دیتا ہے، اور تمام مستشرقین کو تسلیم ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے، یعنی پڑھے لکھے نہ تھے، لیکن اپنی ہٹ دھرمی اور قرآن کے آسمانی کتاب کے ہونے کے انکار میں مستشرقین پھر بھی کہتے ہیں، کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق ہے، قرآن نے کتنے متنوع مضامین، کتنی اعلیٰ اور بنیادی باتوں پر روشنی ڈالی ہے، اُس نے پہلی بار اللہ تعالیٰ کی یکتائی اور اس کا ماورائی تصور اس طرح پیش کیا ہے، کہ دلوں میں خدا کے وجود کا متحرک احساس پیدا ہو جائے، اس کی حکومت اور اقتدار اعلیٰ پوری کائنات کا ایک مفصل اور مربوط منصوبہ جس میں تمام مظاہر فطرت کا خاص قوانین کے تحت کار فرمائی، انسان اس کے خالق کے درمیان ایک مابعد الطبیعیاتی رشتہ، انسان کے روحانی اور مادی پہلوؤں میں امتزاج، ایک مکمل دستور حیات کے تمام بنیادی اصول روح انسانی کا تخلیق کے وقت سے لیکر ابد تک کی زندگی، اور اس کے مراحل، اس کے عقائد اور اعمال اور خیالات اور کردار میں صدق پر زور دینا، انسان کا بحیثیت اشرف المخلوقات درجہ و مرتبہ، عقل و فہم کے استعمال پر زور انسان کے بنائے ہوئے امتیازات کی نفی جو فرقہ، نسل و رنگ وغیرہ پر مبنی ہوں پوری انسانیت کا ایک برادری ہونا، ایک نئی تہذیب اور تمدن کی داغ بیل ڈالنا، اس کے اصول اور ہدایت کی ابدیت اور حقوق اللہ اور حقوق الناس پر زور اور ان کی نسبت انسان کی ذمہ داریاں وغیرہ وغیرہ مضامین پر بحث کی گئی ہے، دنیا کا بڑے سے بڑا دانشور اور ادیب ایسی کتاب نہیں لاسکتا ہے، ایک ان پڑھ آدمی کا ذکر کیا ہ جارج سیل کو بھی تسلیم ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم یافتہ نہیں تھے، مگر وہ پھر بھی کہتا ہے، کہ قرآن کے مصنف وہی تھے، اور ہو سکتا ہے، کہ انھوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کی صحبت میں یہ تمام علم حاصل کر لئے ہوں، حالانکہ مکہ معظمہ میں اگر کچھ عیسائی یا یہودی تھے تو وہ معدودے چند رہے ہوں گے، ان کی جو تعداد بتائی جاتی ہے، وہ بالکل ناقابل اعتبار ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے، کہ قرآن میں

متشرقین نے قیاس آرائی کی ہے کہ جو رشد و ہدایت پر جا بجا زور ہے، وہ حضورؐ کی سیاحت اور سفر کا نتیجہ ہے، یا انجیل و تورات کی تمام الہامی باتیں حضورؐ نے ایک عیسائی پادری بحیرہ کی ایک روزہ ملاقات سے حاصل کیں، اور نہ اس وقت تک ان کا قصص سے حاصل کیں، حالانکہ اس کو تسلیم ہے، کہ یہ کتابیں حضورؐ کو دستیاب نہیں تھیں، اور نہ اس وقت تک ان کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا تھا، ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے، کہ جو کچھ حضورؐ نے ان آسمانی کتابوں سے حاصل کیا اس کو ایک نئے انداز میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے طور پر پیش کر دیا، جو ایک بہت اعلیٰ مصنف اور ادیب کا ہی کام ہو سکتا ہے، اس نے اپنے بغض میں یہاں تک کہہ دیا کہ اہل قریش کی مخالفت اس بات کی دلیل ہے، کہ حضورؐ نبی نہیں تھے، حالانکہ ایک قلیل مدت میں قریش کے بچہ بچہ نے اسلام قبول کر لیا تھا،

قرآن اور دوسری کتب الٰہی میں ابتدائے آفرینش، حضرت آدمؑ کی تخلیق، ان کا جنت سے نکالا جانا، انبیاء علیہم السلام کے قصص، جنت اور دوزخ، دنیوی اور ابدی زندگی کے تذکروں میں جو مماثلت ہے، اس سے مستشرقین نے یہ نتیجہ نکالا کہ حضورؐ نے تمام باتیں دوسرے مذاہب سے اخذ کیں، انھوں نے یہ بات بالکل نظر انداز کر دی ہے کہ خالق کائنات ایک ہے، انسانیت اور اس کی بنیادی ضرورتیں ایک ہیں، ابدی حقائق اور تمام انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ نازل پیغام خداوندی اپنی اصلی شکل میں ایک ہے، اور اگر ہر نبی کے زمانے میں ان کی تالیف ہو جاتی، اور دوسری کتابوں میں تحریف، اضافہ، تغیر و تبدل نہ کیا گیا ہوتا تو مماثلت ہی نہیں، ان سب کی شکل ایک ہی ہوتی، اور صرف شریعت میں معاشرہ میں تدریجی ارتقار کے اعتبار سے تھوڑا بہت فرق ہوتا۔

ان تمام باتوں اور دلائل کے پیش نظر کوئی معمولی سمجھ کا آدمی بھی قرآن عظیم کے کتاب الٰہی ہونے سے انکار نہیں کر سکتا ہے، ہٹ دھرمی، بغض اور محرومی کی بات دوسری ہے،

مستشرقین نے اسلام پر یہ بھی الزام لگایا، کہ وہ صرف قضا، و قدر پر زور دیتا ہے، اور انسان کی ذاتی فکر و کوشش کو سلب کر لیتا ہے، چنانچہ سر ولیم میور کہتے ہیں، اسلام میں اللہ کا رشتہ دنیا کے ساتھ اس طرح ہے کہ انسان کا اختیار اور ارادہ ختم ہو جاتا ہے، اور امید اور توقع اللہ کے آہنی شکنجہ میں ہلاک ہو جاتی ہے، اس طرح وہ کہتا ہے کہ اسلام نے خدا کو دیکھا، انسان کو نہیں، اللہ کے حقوق جانے مگر انسان کے حقوق کو نہ جانا، اس نے جبر اور اقتدار دیکھا آزادی نہیں، اور اس وجہ سے ایک استبدادی ضابطہ بن گیا، جو سخت ہو کر آہنی ڈھانچہ ہو گیا

اور بالآخر ہلاک ہو گیا،

یہ الزام سراسر بے بنیاد اور لغو ہے، اور صرف بغض اور عناد پر مبنی ہے، اسلام کے نظریات اور تاریخ کے خلاف ہے، اور جناب کلارک کی بد خواہی کے باوجود اسلام حیرت انگیز طریقہ سے پھیلتا گیا اور زمانہ اس کی طرف آرہا ہے، اللہ تعالیٰ قادر مطلق ضرور ہے، اور کائنات کی ہر شئی تابع تقدیر ہے، اسی نے ہر شئے کو اس کی صفت دی، اور اسی قانون سے وابستہ ہے، جو اس کے لئے اس نے مقرر کیا، انسان بہت حد تک تابع تقدیر ہے، مگر اس کو بہت حد تک آزادی بھی ملی ہے، ہر شخص کے ضمیر اور فطرت میں یہ تمیز دی گئی ہے کہ وہ اچھائی اور برائی میں تمیز کر سکے، اور اس کو نیکی کے راستے پر چلنے کی ہدایت دی گئی، مگر یہ اس پر ہے کہ وہ کون سا طریقہ اختیار کرتا ہے، اچھا اور بُرا، اس کے اچھے کی جزا اور برے کی سزا سے بھی آگاہ کر دیا گیا ہے، مگر اسے مجبور نہیں کیا گیا، کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے، تقدیر الٰہی کہیں کہیں علم الٰہی سے متعلق ہے، جو ہر شئے کے متعلق اللہ تعالیٰ کو پہلے سے ہے، کہ وہ کیا کرے گا، اور کہیں کہیں اس قانون سے جس کے تحت اس کی پیدائش، اس کی نمو، اس کی بقا اور اس کا وجود ہوا ہے۔

قرآن عظیم میں بے شمار ایسی باتیں ہیں کہ انسان کو خود کوشش کرنی ہے اسے وہی ملے گا جو وہ کوشش کریگا انسان کو اپنی عقل و فہم سے کام لے کر اور مظاہر قدرت کا بغور مشاہدہ کر کے گذشتہ قوموں کے واقعات اور انجام سے عبرت لے کر خدا کی قدرت کو سمجھنا ہے، اور اس کی تابعداری اخلاص و انہماک سے کرنی ہے، اور اس سے اپنی امیدوں کو وابستہ کرنا ہے، جو اس کا سب سے بڑا دوست، نگہبان، پرورش کرنے والا، ہدایت دینے والا اور مہربان ہے، بطور نمونہ کے چند آیتیں لے لیجئے۔

سورہ ۵۳ کی ۳۹ آیت ہے کہ انسان کو وہی ملے گا جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے، یا سورہ ۱۳ کی گیارہویں آیت کہ خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا ہے، جب تک وہ خود اپنی حالت کو بدلتی نہیں ہے، یا سورہ ۶۲ کی دسویں آیت کہ جب نماز ختم ہو جائے تو خدا کی نعمت حاصل کرنے کے لئے زمین میں منتشر ہو جاؤ اور خدا کا ہمہ وقت خیال رکھو، تاکہ فلاح پاؤ،

ان مستشرقین کا یہی حال ہے، جس کے متعلق قرآن نے پیشگی اعلان کر دیا ہے، ان کے دماغ ہے، مگر سوچتے نہیں، انکے آنکھیں ہیں، مگر دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں مگر سنتے نہیں، (سورہ ۷، آیت ۱۷۹) اور جن لوگوں نے دنیا میں حقیقت سے

چشم پوشی کی وہ آخرت میں بھی اندھے اٹھیں، اور صحیح راستہ سے بہت دور ہوں گے (سورہ ۱۷-۷۲) قرآن انہی کو ہدایت دیتا ہے جو اس کے طلب گار ہیں،

جارج سیل Arberry Rodvell Richre Bell Dherry Picktball نے قرآن کے ترجمہ میں جو غلطیاں کی ہیں، ان کے چند نمونے میں نے اپنے انگریزی کتابچہ میں پیش کئے ہیں، اس مختصر مقالہ میں انھیں دہرانا ممکن نہیں ہے، انھوں نے جو غلطیاں کی ہیں، وہ عبارت کی ہیں، اور عربی زبان، قرآن کے اسلوب بیان اور عربی محاوروں سے پوری واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے کی ہیں پکھتال کی غلطیاں ترجمہ میں اصل کی طرح موسیقیت و نغمہ لانے کی کوشش کی وجہ سے ہوئیں، اور کچھ عربی محاوروں سے ناواقفیت کی بنا پر ہوئیں، اوروں نے دیدہ و دانستہ اور بدنیتی سے فاش غلطیاں کیں۔

براؤن اور اسلام

از

ڈاکٹر امیر حسن عابدی شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی

فارسی سے پہلے یورپ میں عربی کی ابتدا ہوئی، جس کے ذریعے یونانی فلسفہ خاص کر ارسطو کے خیالات سب سے پہلے مغربی یورپ کو معلوم ہوئے، اتیرہویں صدی عیسوی میں البرٹس میگنس نے فارابی اور ابن سینا کی کتابوں سے اخذ کر کے ارسطو کی تعلیمات کو پیرس میں پیش کیا، اسی صدی میں راجر بیکن اور ریمانڈ لل نے مشرقی زبانوں سے واقفیت حاصل کرنے پر زور دیا، تاکہ اُن کے فلسفہ اور سائنس کا مطالعہ ہوسکے،

چودھویں صدی کے شروع میں پانچویں پوپ نے یورپ کے مختلف شہروں میں عربی وغیرہ کی پروفیسر شپ قائم کروائی، مگر اس کا خیال رکھا گیا، کہ اس سے عیسائی مذہب کو کوئی نقصان نہ پہونچے، سولھویں صدی کے شروع میں باقاعدہ یورپ میں مشرقی علوم کا باقاعدہ چرچا اور رواج ہوا، آج دنیا پر مسلمانوں کا یہ احسان ہے کہ انھوں نے یونانی علم وفنون کو زندہ رکھا، اور آج یورپ والے ان ہی کے عربی ترجموں سے استفادہ کر کے آگے بڑھے ہیں،

یورپ میں عربی، فارسی، وغیرہ جیسے مشرقی علوم کی طرف توجہ کرنے کے دو اسباب تھے، ایک تو یہ کہ ان زبانوں خاصکر عربی کے ذریعہ سے وہ یونان اور خاصکر سقراط افلاطون اور ارسطو وغیرہ کے فلسفہ کو سمجھ سکیں، دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ وہ اسلام، قرآن، اور مسلمانوں میں طرح طرح کی خامیاں اور کمزوریاں دکھا کر، ان پر کیچڑ اُچھالیں، پھر بھی بہت ایسے مستشرق ہیں، جنھوں نے اسلام اور اسلامی علوم وفنون کا مطالعہ بڑی دیانتداری سے کر کے ان سے پورا پورا استفادہ کیا، اور مسلمانوں کی علمی دین کے معترف ہوئے، پروفیسر ایڈورڈ جی براؤن کا شمار انھیں مستشرقین میں کیا جانا چاہئے، انھوں نے فارسی ادب کی تاریخ لکھنے میں مسلمانوں کی خدمات کا صحیح جائزہ لیا، اور اپنے کو ایک سچے ایماندار محقق کی حیثیت سے پیش کیا، انھوں نے ابن ہشام، الفخری، دینوری، بلاذری، مسعودی، یعقوبی وغیرہ کے حوالہ سے اپنی تحقیقات کی تکمیل کی، وہ لکھتے ہیں کہ نوشیرواں کی شاندار حکومت (۵۳۱ء تا ۵۷۸ء) کے زمانہ میں سب سے زیادہ اہم اس کا

بیالیسواں سال (سنہ ۵۷۰ء) جسے عرب عام الفیل کہتے ہیں، اسی سال ایک طرف تو ایران نے یمن کی سلطنت پر فتح پائی، مگر دوسری طرف مکہ معظمہ میں محمد صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی ولادت ہوئی، جن کی تعلیمات کے نتیجہ میں ساسانی سلطنت کا خاتمہ ہوا۔

یہاں یہ بھی لکھ دیا جائے کہ خسرو نوشیرواں (۵۳۱ء تا ۵۷۸ء) سخت قسم کا جابر، ظالم اور سفاک بادشاہ تھا جس نے زرتشتی مذہب کے علاوہ کسی مذہب وملت کو پنپنے نہیں دیا۔ بلکہ سب کا قلع قمع کر دیا۔ مزوک اپنے زمانہ کا کمیونسٹ تھا، ۵۲۸ء میں اس کا خاتمہ کر کے اس کی تحریک کو کچل کر رکھ دیا۔ عیسائیوں کو وہ بڑی حقارت سے دیکھتا تھا، مانی، آخری اشکانی بادشاہ اردوان کے چوتھے سال ۲۱۶ - ۲۱۵ء) میں پیدا ہوا، اس کے دین یعنی مذہب مانی کو زرتشتیوں نے کچلا، پھر بھی تیرہویں صدی تک اس کے ماننے والے موجود تھے، مگر زرتشتیوں کا اس نے پورا احترام کیا، اور انھیں ہر طرح کی سہولتیں دیں، نیز ان کے لئے وہ بڑا مہربان اور عمدہ بادشاہ تھا، اسی لئے انھوں نے اسے نوشیرواں عادل کا خطاب دیا، جو آج ہماری روایتوں کا جز بن گیا ہے،

بہرحال ایک طرف تو براؤن نے نوشیرواں کو کٹر متشدد اور متعصب بتلایا ہے، مگر دوسری طرف اسے مامون الرشید اور اکبر جیسے بادشاہوں کا ہم پلہ قرار دیا ہے، اس لئے کہ اس نے سات، نو افلاطونی فلسفیوں کو جنھیں شہنشاہ جسٹینین نے اپنے وطن سے نکال دیا تھا، پناہ دی"

بہرحال پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے براؤن لکھتے ہیں کہ آپ کا کام بہت مشکل تھا، اس لئے کہ ریگستانِ عرب دل سے مادہ پرست اور متشکک تھے۔ انھیں ماوراء الطبیعیات اور الٰہیات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، نیز انھیں ایسے خدا کی ضرورت نہیں تھی، جو طاقتور تو ضرور ہو مگر اُن سے خدمت اور نفی ذات کا خواہاں ہو،

براؤن کے نزدیک ہجرت (۶۲۲ء) سے لے کر حضرت عمرؓ کی وفات (۶۴۴ء) تک کا زمانہ مقدس اسلام کا سنہرا عہد ہے، جو فلسفی اسلام سے جدا اور الگ ہے،

ایران پر عرب حملہ کے باب میں براؤن نے ڈوزی کی کتاب کی بڑی تعریف کی ہے، اس سے ایک طویل عبارت نقل کی ہے، جس کے کچھ حصے یہاں دیئے جا رہے ہیں وہ لکھتا ہے:-

"ساتویں صدی کے پہلے نصف حصہ میں بیزنطینی اور ایرانی . . . . حکومتیں مغربی ایشیا پر قبضہ کرنا چاہتی تھیں، بظاہر دونوں سلطنتیں ٹیکسوں کی وجہ سے بیحد خوش نظر آ رہی تھیں، اور اُن کی شان و

شوکت اور تعیش کی زندگی ایک مثل بن گئی تھی، لیکن اندر سے ایک مرض نے دونوں میں گھن لگا دیا تھا، لوگ مطلق العنانیت کے بوجھ کے نیچے دبے جا رہے تھے، دونوں شاہی خاندانوں نے مسلسل دہشت پھیلا رکھی تھی، اور مذہبی تعصب کی وجہ سے لوگوں کو اذیتیں دی جا رہی تھیں، کہ اچانک عرب کے ریگستان سے کچھ نئے لوگ نمودار ہوئے، جو اس سے قبل بے شمار قبیلوں میں بٹے ہوئے اور باہمی جنگ و خونریزی میں مبتلا تھے، مگر اب سب ایک ہو گئے تھے، یہی لوگ تھے جو آزاد، لباس و غذا میں سادہ، شریف اور مہمان نواز اور سمجھدار تھے، لیکن اسی کے ساتھ وہ ایسے غیور اور خود دار، تند مزاج، انتقام جو، سخت دشمن سفاک اور ظالم بھی تھے، کہ دیکھتے دیکھتے قابل قدر، مگر ہٹری گلی، ایرانی سلطنت کا خاتمہ کر دیا، قسطنطنیہ کے جانشینوں سے ان کے اچھے صوبے چھین لیے، ٹیوٹنی نسل کی حکومت کو اپنے قدموں سے کچل دیا، اور بقیہ یورپ میں ایک دہشت پھیلا دی، دوسری طرف اُن کی فاتح فوجیں ہمالیہ میں داخل ہو گئیں، پھر بھی یہ دوسرے فاتحوں کی طرح نہ تھے، اس لئے کہ یہ ایک نئے مذہب کی تبلیغ کر رہے تھے، ایرانیوں کی ثنویت اور بگڑی ہوئی عیسویت کے خلاف انھوں نے وحدت کا اعلان کیا، جسے لاکھوں آدمیوں نے قبول کیا، اور جو آج بھی انسانوں کے دسویں حصہ کا مذہب ہے۔"

براؤن نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی، خلفائے راشدین کا عہد حضرت عثمانؓ کے قتل، حضرت علیؓ کی خلافت اور معاویہ کا اس سے انکار، جنگ صفین وجمل و نہروان، خوارج، معاویہ کے ساتھ صلح اور امام حسنؓ کی خلافت سے دست برداری، یزید، معرکۂ کربلا، ابن زبیرؓ اور مختار کی بغاوت، عبد الملک کی حکومت، حجاج کے مظالم، لوگوں کے بنی امیہ کے خلاف ہونے، بنی امیہ کے زوال کے اسباب، عمر بن عبد العزیزؒ اور بنی عباس کے پروپیگنڈے، ایرانیوں کا ان کے ساتھ ہونے، ابو مسلم خراسانی، انقلابیوں کی آنکھ کھلنے، عباسی حکومت، برمکیوں، نوروز کے تہوار کے احیا وغیرہ کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے،

معتزلہ کے ذکر میں براؤن نے دو مستشرق ڈوزی اور اسٹیر کا حوالہ دیا ہے، جنھوں نے ان کے متعلق بحث اور تحقیق کی ہے، براؤن کے خیال میں شروع ہی سے معتزلہ یونانی فلسفہ سے متاثر تھے، اُن کا خیال ہے کہ عباسی خلیفہ متوکل (۸۴۷ء ۸۶۱ء) کی تخت نشینی پر وہ سیاسی حیثیت سے ختم ہو گئے، لیکن ان کے دبستانِ خیال کی تین سو سال

بعد بھی زمخشری جیسے مفسر قرآن نے نمایندگی کی ہے، اس مستشرق نے متوکل کے عہد کو تقلید پسندی کا زمانہ کہا ہے، پھر بھی اشعریوں کے مقابلہ میں اس عہد کو ذہنی قابلیت کے لحاظ سے بلند قرار دیا ہے، اس مستشرق نے ابوالحسن اشعری کا ذکر کرکے ان کے بزرگ، بوموسیٰ اشعریؓ کو بے عقل کہکر یاد کیا ہے،

اخوان الصفار کو براؤن نے غیر معمولی جماعت قرار دیا ہے، اس سلسلہ میں فلوگل اور ڈیٹرسی جیسے مستشرقون کے حوالے دے کر ان کا اچھا تعارف کرایا ہے، ان کا خیال ہے کہ اخوان الصفا نے معتزلہ کے کاموں کو آگے بڑھایا، اور انھوں نے سائنس اور مذہب، اسلام اور یونانی فلسفہ میں تطبیق کی اور تمام علوم کو ملا جلا کر ایک انسائیکلو پیڈیا پیدا کر دیا،

براؤن نے زرتشتیوں کے صاحبِ کتاب ہونے کے مسئلہ کو بھی اٹھایا ہے، اور اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جمشید کو حضرت سلیمانؑ بتلایا گیا ہے، اسی طرح کوروش کی قبر کو مسجد مادر سلیمان اور مرغاب کی ایک تاریخی یادگار کو تختِ سلیمان کہا گیا ہے، ان کے خیال میں یہ سب اس لئے کیا گیا تھا کہ ابتدائے اسلام میں زرتشتی یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں سے اپنی قدر وقیمت میں اضافہ کروائیں، اور اپنے کو اہلِ کتاب کہلوائیں، لیکن ابن مقفع جیسے دانشور نے بہت پہلے اس قسم کی باتوں سے انکار کیا ہے، حضرت عمرؓ کو مجوسیوں کے ساتھ اہلِ کتاب جیسا سلوک کرنے میں جھجک ہو رہی تھی لیکن عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے اُن سے کہا کہ میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے، کہ ان کے ساتھ وہی سلوک ہونا چاہیے جو اہلِ کتاب کے ساتھ ہوتا ہے،

ساسانی بادشاہ اپنے کو خدا کی طرف نامزد سمجھتے تھے، اور زرتشتیوں کے عقیدہ کے مطابق ان کو خداداد حقوق حاصل تھے، یہی عقیدہ اور اس قسم کے دوسرے زرتشتی اور ایرانی عقیدے مسلمانوں کے بعض فرقوں پر اثر انداز ہوئے ہیں، اسکے علاوہ چونکہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ساسانی سلطنت کا خاتمہ ہوا، اس لئے ان کے خلاف ایرانی جذبات کارفرما تھے، اس کے خلاف ایرانیوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت امام حسینؓ کی شادی یزدگرد سوم کی صاحبزادی شہر بانو سے ہوئی جن سے نو امام عالم وجود میں آئے، اس طرح بقیہ امام حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور ساسانی بادشاہوں کی اولاد سے ہوئے، اور وہ بھی خدا کی طرف سے امامت کے لئے نامزد ہوئے تھے، ایران میں حضرت شہر بانو بڑے احترام سے دیکھی جاتی ہیں، ان کے نام سے ایک پہاڑ بھی ہے، جس کو کوہ بی بی شہر بانو کہا جاتا ہے، اور جو تہران سے ۳/۴ میل جنوب میں ہے،

آگے چل کر براؤن نے زندیق کی بحث اٹھائی ہے، جو دراصل مانی مذہب کے ماننے والے تھے، آٹھویں صدی

عیسوی کے اواخر میں وہ اتنے فعال ہو گئے تھے، کہ عباسی خلیفہ المہدی (۷۷۵ء، ۷۸۵ء) نے ایک مخصوص مفتش مقرر کیا جو زندیقیوں کا پتہ لگائے جو بظاہر اسلام کے مبلغ ہونے کا دعویٰ کرتے مگر درحقیقت مانی مذہب کا پروپیگنڈا کرتے تھے ان میں سے بعض کو اموی اور عباسی خلفار نے قتل بھی کروادیا تھا،

براؤن کے نزدیک ایران کی فتح کے بعد عربوں کے لئے زیادہ مشکل کام اسلام کے زرتشتی مذہب پر بتدریج غلبہ اور فتح حاصل کرنا تھا، عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے، کہ اسلامی فاتحین نے لوگوں کے لئے قرآن اور تلوار کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں چھوڑا تھا، لیکن براؤن کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ مجوسیوں، عیسائیوں اور یہودیوں کو اجازت دی گئی تھی، کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہ سکتے ہیں، البتہ انھیں جزیہ دینا ہوگا، ان کے نزدیک یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ زرتشتیوں پر کوئی خاص سختی کی گئی ہو یا ایران کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہو، بلکہ بیشتر مذہب کی تبدیلی اختیار کی،

عام طور سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلامی فتح کے بعد تین سو سال تک ایران ذہنی طور سے کورا تھا، لیکن براؤن کے خیال میں یہ زمانہ نئے اور پرانے امتزاج اور خیالات کے حلول اور تناسخ کا زمانہ ہے، سیاسی اعتبار سے ایران مستقل اور آزاد نہ رہا ہو، لیکن ذہنی اور عقلی میدان میں اس کی بلندی قائم رہی، اس لئے کہ علم کے ہر شعبہ میں ایرانیوں نے نمایاں حصہ لیا۔

براؤن نے اپنی کتاب میں سر ولیم میور ڈاکٹر گسٹو ویل گولڈزیہر وان والٹن اور دوسرے بہت سے مستشرقوں کا ذکر کیا ہے، جن سے انھوں نے استفادہ کیا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ بہت سے اسلامی علمار کا بھی ذکر کیا ہے، جن کے تبحر علمی اور دقتِ نظر کا انھوں نے اعتراف کیا ہے، ان میں سے ایک علامہ شبلی نعمانی بھی ہیں، جن کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ "جہاں تک میں فیصلہ کرسکتا ہوں، شروع سے لے کر ستر ہویں صدی کے آخر تک ممتاز فارسی شعرار کا سیر حاصل اور بہترین تبصرہ (انتہائی بدقسمتی سے) اردو یا ہندوستانی زبان میں لکھی ہوئی علامہ شبلی نعمانی جیسے ممتاز عالم کی شعر العجم ہے"

اُن کی اس سخت رائے سے ہم میں یہ احساس ہونا چاہئے کہ ہمارے بزرگوں کے کارنامے بہتر سے بہتر شکل میں دنیا کے مستشرقین کے سامنے پیش کئے جائیں،

ضرورت ہے کہ علامہ شبلی نعمانی کی منتخب تصنیفات کو دنیا کی زبانوں خصوصاً انگریزی میں ترجمہ کیا جائے تاکہ دوسری زبانوں کے لوگ بھی ان سے پورا پورا استفادہ کرسکیں،

قرآن مجید میں قصۂ ابراہیمؑ

اور

مستشرقین کے اعتراضات

از

ضیاء الدین اصلاحی

حضرت ابراہیم علیہ السلام بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل دونوں کے مورث اعلیٰ اور روحانی پیشوا تھے، اس لئے یہود، نصاری اور مسلمان سب ہی انھیں اپنا ہادی، رہنما اور امام تسلیم کرتے ہیں، تورات میں ان کی عظمت و تقدس اور ان کی نسل کی کثرت و برکت کی داستان کئی جگہ دہرائی گئی ہے، ذیل میں کتاب تکوین سے اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔

"خداوند نے ابرام کو کہا تھا کہ تو اپنے ملک اور قرابتوں کے درمیان سے اور اپنے باپ کے گھر سے اس ملک میں جو میں تجھے دکھاؤں گا، نکل چل، اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا اور تو ایک برکت ہوگا اور ان کو جو تجھے برکت دیتے ہیں برکت دوں گا، اور اس کو جو تجھ پر لعنت کرتا ہے لعنتی کروں گا، اور دنیا کے سارے گھرانے تجھ سے برکت پاویں گے"

(پیدائش ۱۲: ۲ و ۳)

دوسری جگہ ہے:

"خداوند نے ابرام سے کہا کہ اپنی آنکھ اٹھا اور اس جگہ سے جہاں تو ہے، اتر اور دکھن اور پورب اور پچھم دیکھ کہ یہ تمام ملک جو تو اب دیکھتا ہے تجھکو اور تیری نسل کو ہمیشہ کے لئے دوں گا، اور تیری نسل کو میں زمین کی خاک کے مانند بناؤں گا کہ اگر کوئی آدمی زمین کی خاک کو گن سکے تو تیری نسل بھی گنی جائے گی"

(پیدائش ۱۳: ۱۴-۱۶)

اسی کتاب میں آگے ایک اور باب میں ہے:

"اور خداوند کے فرشتہ نے آسمان سے دوبارہ ابراہام کو پکارا اور کہا کہ خداوند فرماتا ہے کہ چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ رکھا، اس لئے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا، اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کی ریت کے مانند کردوں گا اور تیری اولاد اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی اور تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی، کیونکہ تو نے میری بات مانی۔" (پیدائش ۲۲ : ۱۵-۱۸)

ایک اور جگہ ہے:

"ابراہام تو یقیناً ایک بڑی اور بزرگ قوم ہوگا، اور زمین کی سب قومیں اس سے برکت پائیں گی، کیونکہ میں اس کو جانتا ہوں، وہ اپنے بیٹوں اور اپنے بعد اپنے گھرانے کو حکم کرے گا اور وہ خداوند کی راہ کی نگہبانی کرکے عدل و انصاف کریں گے، تاکہ خداوند ابراہام کے واسطہ سے جو کچھ اس نے اس کے حق میں کہا ہے، پورا کرے۔" (تکوین باب ۱۸)

قرآن مجید میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مسلمہ امامت و پیشوائی کا ذکر ان بلیغ لفظوں میں ہوا ہے، فرمایا:

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (بقرہ: ۱۲۴)	(خدا نے) کہا بیشک میں تمہیں (ابراہیمؑ کو) لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔

نیز فرمایا:

وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ (بقرہ: ۱۳۰)	اور ہم نے اس (ابراہیمؑ کو) برگزیدہ ٹھہرایا دنیا میں، اور وہ آخرت میں نیکوکاروں میں ہوگا۔

ابراہیم کے لفظی معنیٰ قوموں کے باپ کے ہیں، توراۃ میں ان کو ابوالانبیاء (پیغمبروں کے باپ) کہا گیا ہے، اور قرآن مجید سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ خدا نے ان کے خاندان کو بڑی برکت و وسعت عطا کی اور نسل ابراہیمی کی ساری شاخیں خوب پھلی پھولیں۔

قرآن مجید نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اسی عظمت و فضیلت کی بنا پر ملت ابراہیمی کے اتباع و اقتدا کی پُرزور تاکید کی ہے اور اس سے سرمو انحراف و تجاوز کی سخت مذمت کی ہے، چنانچہ اسی حیثیت سے اس نے کفارِ قریش، یہود اور نصاریٰ سب کو دعوت دی کہ تم جن غلط راہوں پر پڑ گئے ہو، ان کو چھوڑ کر حضرت ابراہیمؑ کی بتائی ہوئی شاہراہ پر گامزن ہو جاؤ، ارشاد ربانی ہے:

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (بقرہ: ۱۳۵)

اور انھوں نے کہا کہ یہودی یا نصرانی ہو جاؤ تو ہدایت پاؤ گے کہہ دو (نہیں!) بلکہ ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو جو اللہ کی طرف یکسو تھا اور مشرکین میں سو نہ تھا

قرآن مجید صراحت کے ساتھ بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ دونوں نے اپنے آخری وقت میں اپنی اولاد کو اسی ملت ابراہیمی کو اختیار کرنے کی وصیت و تلقین کی تھی:

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۗ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۔ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِىْ ۗ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (بقرہ: ۱۳۲، ۱۳۳)

اور ابراہیمؑ نے اسی ملت ابراہیمی (اسلام) کی وصیت اپنے بیٹوں کو کی اور اسی کی وصیت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو کی کہ اے میرے بیٹو! اللہ نے تمھارے لیے دین اسلام کو منتخب فرمایا تو تم نہ مرنا مگر اسلام کی حالت پر، کیا تم اسوقت موجود تھے جب یعقوبؑ کی موت کا وقت آیا؟ جب کہ اس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا تم میرے بعد کس کی پرستش کرو گے؟ وہ بولے کہ ہم تیرے معبود اور تیرے آباء و اجداد ابراہیم و اسماعیل و اسحاق کے معبود کی پرستش کریں گے جو ایک ہی معبود ہے، اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔

قرآن مجید نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ حضرت یعقوب علیہ السلام کی وصیت کا ذکر خصوصیت سے اسی بنا پر کیا ہے کہ بنی اسرائیل براہ راست ان ہی کی اولاد تھے، اور جب انھوں سے اپنی اولاد کو یہودیت و نصرانیت کے

بجائے ملت ابراہیمی اور توحید و اسلام کی تلقین و وصیت اپنی زندگی کے بالکل آخری لمحہ میں کی تھی تو سمجھ لو کہ تم لوگوں کا حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسرائیلؑ (یعقوبؑ) کو یہودی و نصرانی کہنا صریح زیادتی اور اللہ تعالیٰ پر کھلا ہوا بہتان ہے۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ، وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ۔ (بقرہ: ۱۴۰)	کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیمؑ، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی ذریت کے لوگ یہودی یا نصرانی تھے پوچھو! تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ ان سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی کسی شہادت کو جو ان کے پاس ہے، چھپائیں۔

قرآن مجید ملت ابراہیمی سے بیزاری اور برگشتگی کو سفاہت اور بے وقوفی قرار دیتا ہے، ارشاد ہے:

وَ مَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ (بقرہ: ۱۳۰)	اور بھلا کون ملت ابراہیمی سے بے رغبتی اختیار کرے گا، مگر وہی جو اپنے کو حماقت میں مبتلا کریگا

اس نے مشرکین عرب، یہود و نصاریٰ سب کو ملامت و تنبیہ کی کہ آخر تم اپنے غلط آراء و اقوال کی سند کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کیوں حوالہ دیتے ہو، وہ یہودی و نصرانی اور مشرک نہ تھے۔ بلکہ مسلم حنیف تھے، یہودیت و نصرانیت کے شاخسانے تو ان کے بعد کھڑے کئے گئے ہیں، پھر ان کی تائید و حمایت کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام کیوں لیتے ہو؟ ان کے ساتھ نسبت و قربت کے حقدار تو وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو ان کی ملت کی پیروی کرتے ہیں، توراۃ و انجیل تو حضرت ابراہیمؑ کے صدیوں بعد نازل ہوئی ہیں، پھر انھیں یہودیت یا نصرانیت کا کس طرح علمبردار قرار دیتے ہو؟

حضرت اسماعیل علیہ السلام ان ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند اکبر اور حضرت ہاجرہؑ کے بطن سے تولد ہوئے تھے جنھیں اور ان کی والدہ ماجدہ کو انھوں نے مکہ کی وادیٔ غیر ذی زرع میں لاکر بسایا، اور ان کی نسل کے لئے برکت کی دعا کی، حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی، قبولیت کا یہ اثر ہوا کہ حضرت اسماعیلؑ کی نسل کو خوب فروغ ہوا، مگر بنی اسرائیل کو اپنے عم زاد بھائیوں سے ہمیشہ رشک و حسد رہا، اس لئے ان کی عزت، عظمت، فضیلت، برتری، سیادت اور وسعت و کثرت برابر ان کی نگاہ میں کھٹکتی رہی، پیغمبر آخر الزماں کی بعثت گو صحف یہود کی عین پیشین گوئیوں کے

مطابق ہوئی تھی اور یہود کو آپؐ کی بعثت کا انتظار بھی تھا، مگر جب آپؐ تشریف لائے تو انھوں نے آپؐ کی تکذیب کردی

دراصل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ بنی اسرائیل کی دینی و دنیاوی سیادت و وجاہت اور سیاسی قوت و اقتدار کے خاتمہ کی تمہید و اعلان تھی، چنانچہ آپؐ کے بعد ان سے ہر قسم کا اعزاز چھین لیا گیا اور بنی اسمٰعیل کو امامت کا منصب جلیل سپرد کیا گیا، اسی لئے اسرائیل کو ان سے اور مسلمانوں سے شدید نفرت و بیزاری ہو گئی اور انھوں نے ان کی عزت و عظمت کو خاک میں ملانے کا منصوبہ بنایا، حضرت اسماعیلؑ کے حسب و نسب پر رکیک اعتراضات ان کے بجائے حضرت اسحاقؑ کو ذبیح ثابت کرنے کی کوشش، خانۂ کعبہ کے بجائے بیت المقدس کو ملت ابراہیمی کا قبلہ قرار دینا، حج و قربانی کی مختلف یادگاروں کو مٹانا، یہاں تک کہ خود حضرت ابراہیمؑ کو یہودیت و نصرانیت کا علمبردار سمجھنا اسی سلسلہ کی کڑی ہیں، قرآن مجید میں ان کی طرح کی تحریف و تلبیس کا متعدد جگہ ذکر ہوا ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

اس تمہید سے یہ بتانا مقصود تھا کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اسماعیلی نسل عربوں اور مسلمانوں کے معاملہ میں اہل کتاب کا رویہ شروع ہی سے معاندانہ رہا ہے، اب بعض مستشرقین بھی ان ہی کے نقش قدم پر گامزن ہو کر حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اسماعیلی نسل اور مسلمانوں کے معاملہ میں اسی طرح کی بے سروپا باتیں کر رہے ہیں جو ان کے پیش روؤں نے کی تھیں ان کی اس کاوش کا مقصد حضرت اسماعیلؑ، ان کی نسل عربوں اور مسلمانوں نیز خانۂ کعبہ کا حضرت ابراہیمؑ سے رشتہ و تعلق منقطع کر دینا ہے، چنانچہ اسپرنگر لکھتے ہیں:

"حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کا تذکرہ قرآن مجید میں جس طور پر کیا گیا ہے، اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف مراحل سے گذرتی ہوئی آخر میں اس نے موسسِ کعبہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے[1]"

سنوک نے اسپرنگر کے اس دعویٰ کو مزید شرح و بسط کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے:

"قدیم اور ابتدائی وحی یعنی کی سورتوں مثلاً ذاریات، حجر، صافات، انعام، ہود، مریم، انبیاء اور عنکبوت وغیرہ میں حضرت ابراہیمؑ کے تذکرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عام پیغمبروں کی طرح ایک رسول تھے، جو اپنی قوم کو ڈرانے کے لئے بھیجے گئے تھے، ان سورتوں میں حضرت اسماعیلؑ و حضرت ابراہیمؑ کے درمیان کسی رشتہ کی کوئی صراحت نہیں کی گئی ہے، بلکہ ان سے تو پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اللہ نے کسی پیغمبر کو عربوں کے اندر مبعوث ہی نہیں کیا تھا، چنانچہ

[1] حیات محمدؐ جلد ۲ ص ۲۵۶ بحوالہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ جلد ۱ ص ۲۷ ترجمہ عربی انسائیکلو پیڈیا

ایک جگہ فرمایا:

وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ (سبا: ۴۴)

اور ہم نے نہیں دیں ان کو کچھ کتابیں جن کو وہ پڑھتے ہوں، اور نہیں بھیجا ان کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ (یٰس: ۶)

تاکہ تو ڈرائے ایک ایسی قوم کو جن کے آباء کو نہیں ڈرایا گیا تھا، سو وہ غافل ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان سورتوں کے اندر اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ خانۂ کعبہ کے بانی اور اول المسلمین تھے لیکن مدنی سورتوں میں معاملہ اس کے برعکس ہو گیا ہے، چنانچہ ان میں حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کے بعض ایسے گوشے اور پہلو نظر آتے ہیں جن کا مکی سورتوں میں کوئی وجود نہ تھا، مثلاً ان میں ان کو مسلم حنیف کہا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ ملت ابراہیمی کے داعی و بانی تھے، اور انھوں نے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ مل کر خانۂ کعبہ کی تعمیر کی تھی، اس مفہوم کی آیتیں مدنی سورتوں میں بکثرت ہیں، مثلاً سورۂ بقرہ میں فرمایا:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ (بقرہ: ۱۲۷)

اور جب ابراہیم و اسماعیل بیت اللہ کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے۔

اس اختلاف و تضاد کا سبب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکی دور میں یہودیوں پر مکمل اعتماد تھا، لیکن جب آپؐ نے مدینہ منورہ میں انھیں اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے ضد وعناد کی راہ اختیار کی اور وہ آپؐ کی عداوت و مخالفت پر کمربستہ ہو گئے، اس صورت حال کے نتیجہ میں رسول اللہؐ کو اب ان کی جگہ دوسرے مددگاروں کی تلاش ہوئی، اس موقع پر آپؐ نے اپنی ذہانت اور اصابت فکر ورائے سے کام لیکر عربوں کے سامنے ان کے ابوالآباء حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کا ایک نیا رُخ پیش کیا، تاکہ اس طرح آپؐ اپنے زمانہ کی یہودیت سے دامن کش ہو کر ایک ایسے دین کو پیش کر سکیں جس کا تعلق یہودیت ابراہیمؑ سے جوڑ دینا ممکن ہو، چنانچہ جب تمام مکہ آپؐ کی دعوت کے سامنے سرنگوں ہو گیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کے معمار کی حیثیت اختیار کر لی"۔[1]

---

[1] بحوالہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۱، ص ۲۸ مطبوعہ مصر ۱۹۳۳ء۔

اس اعتراض میں، قرآن مجید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہدف طعن بنایا گیا ہے، اور اس کے اندر متعدد بے سروپا باتیں بھی آگئی ہیں، لیکن ہماری گفتگو ان ہی امور تک محدود رہے گی، جن کا تعلق حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ اور بنی اسماعیل سے ہے، ہم نے دوسری کتابوں کے علاوہ عبدالوہاب نجار کی قصص الانبیاء سے زیادہ مدد لی ہے،

اس اعتراض کا خاص منشاء یہ ثابت کرنا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے نہ عربوں اور مسلمانوں کا کوئی نسلی و نسبی تعلق تھا اور نہ ان سے ان کا کوئی دینی و مذہبی رشتہ تھا، اس لئے مسلمانوں کا انھیں اپنا روحانی و مذہبی پیشوا ماننا اور عربوں کا انھیں اپنا خاندانی مورث اعلیٰ تسلیم کرنا غلط ہے، کیونکہ آنحضرتؐ کی مکی زندگی میں حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ملت سے آپؐ اور آپؐ کے دین کے تعلق کی کوئی صراحت قرآن مجید میں موجود نہیں ہے، اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کے خانۂ کعبہ کے بانی اور معمار ہونے اور خود کعبہ کی مرکزیت و اہمیت کا بھی مکی آیتوں میں کوئی ثبوت موجود نہیں ہے، البتہ رسول اکرم صلعم کو حضرت ابراہیمؑ سے نسبی و مذہبی تعلق قائم کرنے کا [illegible] مدنی زندگی میں اس لئے ہوا کہ یہود نے آپ کی شدید مخالفت شروع کردی تھی

دونوں فاضل مستشرقین نے [illegible] بنیادی غلط فہمی یہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکی دور میں یہود پر کلی اعتماد کرتے تھے، حالانکہ یہ سرے سے غلط ہے، اگر اس میں کچھ حقیقت ہے تو وہ صرف اس قدر ہے کہ آپؐ مکی اور مدنی دور میں بھی ان امور کے بارہ میں جن کے متعلق آپؐ کو کوئی وحی نہیں کی گئی تھی، یہود کی شریعت کے مطابق اس بنا پر عمل کرتے تھے کہ وہ اہل کتاب تھے اور اللہ تعالیٰ نے ایسے امور کے بارہ میں ان ہی کی شریعت پر عمل کرنے کی آپ کو ہدایت کی تھی، چنانچہ جب تک آپؐ کو خانۂ کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، اس وقت تک آپ بیت المقدس کی جانب ہی رخ کرکے نماز پڑھتے تھے، کیونکہ اولاً تو یہی یہود کا قبلہ تھا، ثانیاً خود مسلمانوں کے نزدیک بھی اس کی اہمیت اور تقدس پوری طرح مسلم تھا، لیکن اس قسم کی چند مثالوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دور میں یہود پر مکمل اعتماد کرتے تھے، مسلمانوں کے بدترین مخالف بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت و تبلیغ میں یہود کا سہارا لیا ہو، یا ان پر کسی قسم کا اعتماد کیا ہو، بلکہ واقعات تو اس کے برعکس یہ ثابت کرتے ہیں کہ مکی دور میں مسلمانوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہود سے کوئی خاص واسطہ ہی نہ تھا، ان سے جو کچھ سابقہ پیش آیا وہ مدنی دور میں آیا، اسی زمانہ میں آپ نے ان سے اخوت اور دوستی کا معاہدہ بھی کیا، تاکہ ان کی جانب سے مطمئن ہوکر مشرکین مکہ کے حملے کا مقابلہ کرسکیں، لیکن جب یہود نے معاہدہ کا پاس ولحاظ نہیں رکھا اور وہ در پردہ اور کھلم کھلا آپ کی مخالفت کرنے لگے بلکہ مشرکین سے ساز باز کرکے ان کی مدد بھی کرنے لگے

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کی جانب سے چوکنا ہو گئے۔

رہی مکی زندگی تو اس میں یہود سے موالات اور ان پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی طرح کے اعتماد کرنے کی کوئی مثال نہیں ملتی، اور مدنی دور کے موالات کا جو انجام ہوا وہ ظاہر ہے، اور اسی کے نتیجہ میں قرآن نے یہود کی اس مستقل جبلی صفت اور طبعی خصوصیت کی اس طرح نشاندہی کی ہے:

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا.	تم اہل ایمان کی دشمنی میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے

(مائدہ: ۸۲)

یہی نہیں، بلکہ عربوں کو بھی یہود پر کبھی کوئی اعتماد و اعتبار نہیں رہا، بلکہ ان کی تاریخ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آپؐ کی بعثت سے قبل بھی یہود کی قربت، تعلق، ہم نشینی، مجالست اور مجاورت کو ناپسند کرتے تھے اور انھیں عرب کی سرزمین سے نکالنے اور جلا وطن کرنے کے لیے ان سے برابر لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، قرآن مجید سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان معرکۂ جنگ و جدال برپا رہتا تھا، اس کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل یہود آپؐ کی آمد کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے، تاکہ آپؐ کے ذریعہ مشرکین پر فتح و غلبہ حاصل کر سکیں

وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُم مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ	اور جب آئی ان کے پاس ایک کتاب اللہ کے یہاں سے ٹھیک ان پیشین گوئیوں کے مطابق جو ان کے یہاں موجود ہیں، اور وہ پہلے سے کافروں کے مقابلہ میں فتح کی دعائیں مانگ رہے تھے، تو جب آئی ان کے پاس وہ چیز جس کو وہ جانے پہچانے ہوئے تھے تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا، پس ان منکروں پر اللہ کی پھٹکار ہے۔

(البقرہ: ۸۹)

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن جریر نے ابوالعالیہ سے یہ روایت کی ہے:

كَانَتِ الْيَهُوْدُ تَسْتَفْتِحُ بِمُحَمَّدٍ صلى الله عليه وسلم على كفار العرب من قبل وقالوا اللهم ابعث هذا النبي الذي نجده في التوراة يعذبهم ويقتلهم فلما بعث الله محمداً صلى الله عليه وسلم فرأوا انه يبعث من غيرهم كفروا به حسداً للعرب و هم يعلمون انه رسول الله صلى الله عليه وسلم يجدونه مكتوباً عندهم في التوراة فلما جاءهم ما عرفوا كفروا به۔

(تفسیر ابن جریر طبری ج ۱، ص ۳۱۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے یہود اپ کے ذریعہ کفار عرب فتح پانے کے آرزومند تھے، اور کہتے تھے اے اللہ اس نبی کو مبعوث کر جس کا ذکر ہم کو توراۃ میں ملتا ہے، تاکہ وہ انھیں عذاب دے اور قتل کرے مگر جب اللہ نے محمدؐ کو مبعوث کیا تو انھوں نے یہ سمجھ کر کہ اس نبی کی بعثت ان کے اندر سے نہیں ہوئی، نیز عربوں پر رشک وحسد کی وجہ سے اس کا انکار کردیا، حالانکہ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ خدا کے رسول ہیں اور توراۃ میں ان کا ذکر بھی موجود ہے، چنانچہ جب آپؐ تشریف لائے تو انھوں نے آپؐ کا انکار کردیا

مصر کے مشہور عالم محمد فرید وجدی لکھتے ہیں:

"حضرت ابراہیمؑ سے تعلق قائم کرنے کا خیال تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کے بجائے مکہ معظمہ ہی میں ہونا چاہئے تھا، کیونکہ وہاں کا ہر ہر قبیلہ حضرت ابراہیمؑ سے اپنا انتساب کرتا تھا، اس کے برخلاف مدینہ کے اکثر قبائل یمنی تھے، جو حضرت ابراہیمؑ سے اپنا رشتہ ناطہ نہیں جوڑتے تھے،،

(حاشیہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ ص ۲۹)

سنوک نے اسی ضمن میں ایک نہایت لغو اور بے بنیاد بات یہ بھی کہی ہے کہ آپؐ نے اپنے زمانہ کی یہودیت کو رد کر کر ایک نئی یہودیت کی داغ بیل ڈالی اور اسے حضرت ابراہیمؑ کی جانب منسوب کردیا، حالانکہ جب یہودیت کا تمامتر تعلق حضرت یعقوبؑ سے ہے اور یہود اپنے دین کو حضرت ابراہیمؑ کے بجائے ان ہی کی جانب منسوب کرتے تھے، اسی لئے وہ اپنے کو بنی اسرائیل کہلانا پسند کرتے تھے تو رائج یہودیت کا تعلق حضرت ابراہیمؑ سے کس طرح ہوسکتا ہے اور حضرت ابراہیمؑ کو یہودی کہنا کس قدر مضحکہ خیز بات ہے، حضرت یعقوبؑ تو ان کے پوتے تھے، ایسی صورت میں حضرت ابراہیمؑ

کا دین اپنے پوتے کے دین کے تابع کس طرح ہو سکتا ہے، اسی لئے قرآن مجید نے نہایت صراحت کے ساتھ کہا ہے:

مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (آل عمران: ۶۷)	ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے، نہ نصرانی، بلکہ حنیف مسلم تھے، اور وہ مشرکین میں سے بھی نہ تھے۔

یہودیت و نصرانیت دونوں حضرت ابراہیمؑ کے بعد کی پیداوار ہیں:

لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنزِلَتِ التَّوْرَاةُ وَالْإِنجِيلُ إِلَّا مِن بَعْدِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ. (آل عمران: ۶۵)	(اے اہل کتاب!) تم ابراہیمؑ کے بارہ میں کیوں حجت کرتے ہو، دراں حالیکہ توراۃ اور انجیل انکے بعد نازل کی گئی ہیں، کیا تم لوگ (اس بات کو) نہیں سمجھتے۔

درحقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی اور کسی دور میں بھی یہودیت سے تعلق قائم کرنے کا خیال سرے سے نہیں ہوا، کیونکہ قرآن مجید کا نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ اسلام قدیم دین ہے، اس کی دعوت حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ وغیرہ تمام نبیوں نے دی تھی، اور اسی کی دعوت دینے کے لئے آنحضورؐ بھی تشریف لائے تھے۔ فرمایا:

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ. (الشوریٰ: ۱۳)	(اللہ نے) تمھارے لئے اسی دین (اسلام) کو مقرر کیا جس کی وصیت نوحؑ کو کی تھی اور جس کی ہم نے تیری طرف وحی کی ہے، اور جس کی ہم نے ابراہیمؑ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو وصیت کی تھی، وہ یہ کہ دین کو قائم رکھنا اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا۔

بھلا ایسی صورت میں آپؐ اسلام کو چھوڑ کر یہودیت سے کیوں وابستہ ہوتے۔

حضرت ابراہیمؑ چونکہ بنی اسرائیل و بنی اسماعیل کے سلسلۂ خاندانی و روحانی پیشوا تھے، اس لئے یہود، نصاریٰ اور مشرکین تینوں ہی اپنی اپنی تائید کے لئے ان کے نام کو استعمال کرتے تھے، اور ان میں سے ہر ایک ان کو اپنے طریقہ پر بتاتا تھا کہ اور کہتا تھا کہ اصل دین ابراہیمی کا حامل وہی ہے، اور محمدؐ اسے اس کے اصلی دین سے ہٹا کر گمراہ کرنا چاہتے ہیں، قرآن مجید کا مقصد

ان کے اسی غلط اور گمراہ پروپیگنڈے کی تردید ہے کہ توراۃ وانجیل تو حضرت ابراہیمؑ کے صدیوں بعد نازل ہوئی ہیں پھر وہ یہودی یا نصرانی کس طرح ہوئے، یہ تو سراسر حماقت اور بے وقوفی کی بات ہے کہ یہودیت ونصرانیت کو ان کی جانب منسوب کیا جائے، حالانکہ وہ ان کے بہت بعد کی وضع وایجاد ہیں، دراصل ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی ونصرانی تھے اور نہ مشرک تھے، بلکہ مسلم حنیف تھے۔

رہا یہ اعتراض کہ قرآن مجید کی مکی ومدنی سورتوں میں حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت اور تصویر یکساں نہیں ہے، کیونکہ مکی دور میں ان کی حیثیت عام رسولوں جیسی بیان کی گئی ہے اور مدنی دور میں ان کو دین حنیفی کا داعی اور خانہ کعبہ کا بانی وموسس بتایا گیا ہے، تو مندرجۂ ذیل تجزیہ کے بعد اس کا لغو وبے بنیاد ہونا اچھی طرح ظاہر ہوجائے گا۔

قرآن مجید کی مکی ومدنی سورتوں کے اسلوب وطرز بیان میں اس اعتبار سے ضرور فرق ہے کہ مکی سورتوں میں عموماً اجمال واختصار ہوتا ہے اور مدنی سورتوں میں بسط وتفصیل سے کام لیا گیا ہے، مکی سورتوں میں بنیادی عقائد اور مسلمات بیان کئے گئے ہیں اور اسی حیثیت سے استدلال کا پیرایہ بھی اختیار کیا گیا ہے، اس کے برعکس مدنی سورتوں میں احکام، فروع اور جزئیات کا بھی ذکر ہے، جن کے دلائل کا طریقہ وانداز بھی جداگانہ ہے، مکی دور میں اصل مخاطب کفار قریش تھے، اور مدنی دور میں یہود ونصاریٰ سے بھی خطاب ہے، قرآن مجید کے اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیت موقع ومحل، اقتضائے حال اور مخاطب کے ذوق ومزاج کی رعایت بھی ہے، اس لئے اس کی ہر سورہ میں اس کے موضوع اور موقع کے لحاظ سے بھی فرق ہوتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگذشت کے مختلف حصے مختلف سورتوں میں بیان کئے گئے ہیں اور ہر جگہ موقع ومحل، اقتضائے حال اور موضوع سورہ کے لحاظ سے اس میں کچھ حذف واضافہ اور فرق ہے، یہ قرآن کا عام اور معروف اسلوب ہے کہ وہ ایک ہی واقعہ کو مختلف جگہ بیان کرتا ہے، مگر ہر جگہ اس کی نوعیت بدلی ہوئی ہوتی ہے اور اسی اعتبار سے جس جگہ اس کا جس قدر حصہ بیان کرنا ضروری اور موزوں ہوتا ہے اسی کو وہاں بیان کرتا ہے اور باقی اجزاء کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے، تاکہ خواہ مخواہ کا اطناب وطول بیان نہ ہو اور مخاطب فضول اور بے موقع باتوں میں الجھ جانے کی وجہ سے اصل مقصد ہی سے غافل ہوجائے، حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاءؑ کے واقعات وقصص میں اسی اصول کو مدنظر رکھا گیا ہے، جس کو نظر انداز کردینے کی وجہ سے ظاہر بیں لوگوں کو ان میں فرق واختلاف دکھائی دیتا ہے۔

قرآن مجید کے اس اسلوب کو مدنظر نہ رکھنے کی وجہ سے ان مستشرقین کو یہ خیال ہوگیا، یا انھوں نے خواہ مخواہ کے لئے

یہ غلط فہمی پیدا کی کہ مدنی سورتوں میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کے جو جلوے نظر آتے ہیں ان کا مکی سورتوں میں وجود نہیں۔

یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ مکی سورتوں میں نہ حضرت ابراہیمؑ کے خانہ کعبہ اور حضرت اسماعیلؑ سے تعلق کی کوئی صراحت کی گئی ہے اور نہ انھیں ملت ابراہیمی کا داعی اور مسلم حنیف وغیرہ کہا گیا ہے، قرآن مجید کی ایک سورہ تو خاص ان ہی کے نام سے موسوم ہے اور یہ مکی ہے، مگر ان فاضل مستشرقین نے سورۂ ابراہیم کا نام ہی اپنی فہرست میں درج نہیں کیا ہے، اس میں حضرت ابراہیمؑ کی ایک دعا کا ذکر ہے، اس سے ان کی شخصیت کے مندرجہ ذیل پہلو سامنے آتے ہیں:

(۱) حضرت ابراہیمؑ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ مکہ کی سرزمین کو گہوارۂ امن بنا:

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا — خداوندا تو اس شہر کو پرامن بنا۔

(ابراہیم: ۳۵)

(۲) وہ اللہ تعالیٰ سے اس کی درخواست کرتے ہیں کہ انھیں اور ان کی اولاد کو شرک و بت پرستی سے محفوظ رکھ:

وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ — (خداوندا!) تو مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچا۔

(ابراہیم: ۳۵)

(۳) حضرت ابراہیم خدا کے مقدس گھر کے پاس بے آب و گیاہ سرزمین میں اللہ واحد کی عبادت نماز، نذر و قربانی اور طواف و حج کی ادائیگی کے لئے اپنی اولاد حضرت اسماعیلؑ کو بسانے کا اعتراف کرتے ہیں، اور ان کی رزق رسانی کے لئے اللہ سے دعا و التجا کرتے ہیں:

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ

(ابراہیم: ۳۷)

خداوندا! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض (اسمٰعیلؑ اور ان کی ذریت) کو اس بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسایا ہے، اے ہمارے خداوند اس لئے کہ یہ نماز قائم کریں، پس لوگوں کے دل ان کی جانب مائل کر دے (یعنی لوگ ان کے پاس تیرے گھر کی زیارت کے لئے آئیں) اور انھیں پھلوں

(ابراہیم : ۳۷)　میں سے رزق دے تاکہ وہ شکر گذار رہوں۔

(۴) حضرت ابراہیمؑ اس امر پر خداوند قدوس کی شکر گذاری کرتے ہیں کہ اس نے ان کے دینی مشن اور ملت ابراہیمی کی تکمیل کے لیے ان کو بڑھاپے میں دو بیٹے اسماعیل و اسحاق عطا کیے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ	سارا شکر اس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھ بڑھاپے
اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ	میں اسماعیل و اسحاق کو بخشا، بیشک میرا خداوند
الدُّعَآءِ ۔ (ابراہیم : ۳۹)	پکار سننے والا ہے۔

(۵) وہ خدا سے اپنے اور اپنی اولاد کے لیے ملت حنیفی کے خاص شعار نماز کو قائم کرنے کی توفیق طلب کرتے ہیں جس کو یہود نے سرے سے ضائع کر دیا تھا، اور نصاریٰ نے اس کی حقیقت در روح مسخ کر ڈالی تھی:

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ	خداوندا! مجھے اور میری اولاد کو نماز قائم کرنیوالا
ذُرِّیَّتِیْ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلْ دُعَآءِ	بنا، خداوندا! اور تو میری دعا قبول کر لے۔

(ابراہیم : ۴۰)

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مکی سورتوں میں بھی حضرت ابراہیمؑ کے خانہ کعبہ اور حضرت اسماعیلؑ سے تعلق کی صراحت موجود ہے اور مکی سورتوں کے ضمن میں سورۂ ابراہیم کا ذکر نہ کرنا ایک بڑی اور بدترین علمی خیانت ہے۔

اسی طرح یہ خیال بھی درست نہیں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے حنیف ہونے کا ذکر صرف مدنی سورتوں میں ہے کیونکہ سورۂ نحل مکی ہے، اس میں ان کے متعلق فرمایا:

اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ	بے شک ابراہیم پیشوا، خدا کا فرماں بردار اور
حَنِیْفًا وَّ لَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۔	موحد تھا، اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔

(نحل : ۱۲۱)

اسی مکی سورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو حضرت ابراہیمؑ کی ملت کے اتباع کی اس طرح تلقین کی گئی ہے:

ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ	پھر ہم نے تمہاری طرف وحی کی کہ ابراہیمؑ کی ملت

حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ. (نحل: ۱۲۳)	پر چلو، جو ایک طرف کا تھا اور مشرکوں میں سے نہ تھا۔

ان مستشرقین کی فہرست میں سورۂ انعام کا ذکر بھی ہے، جو مکی ہے، حالانکہ اس میں بھی ان کے حنیف اور شرک سے بیزار ہونے کی تصریح موجود ہے، فرمایا:

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (انعام: ۷۹)	بے شک میں نے اپنا رخ بالکل یکسو ہو کر اس کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

اسی سورہ کی ایک اور آیت ملاحظہ ہو:

قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا. (انعام: ۱۶۱)	کہہ دو! میرے رب نے میری رہنمائی کی ایک سیدھے راستہ کی طرف، دین قیم، ابراہیمؑ کی ملت کی طرف جو یکسو تھے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ قرآن مجید کی مکی و مدنی سورتوں کے اسلوب اور انداز بیان کا فرق اقتضائے حال اور مخاطب کی رعایت کا نتیجہ ہے، اور مکی سورتوں میں بھی حضرت ابراہیمؑ کی زندگی اور شخصیت کے ایسے گوشے نظر آتے ہیں، جن کو مستشرقین نے مدنی سورتوں کا خاصہ بتایا ہے۔

ان مستشرقین نے مسلمانوں اور عربوں، نیز حضرت اسماعیلؑ کے حضرت ابراہیمؑ سے رشتہ و تعلق کی نفی بھی کی ہے، حالانکہ یہ مسئلہ اس قدر واضح ہے کہ اس کے لئے کوئی دلیل پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، اور اس کا ثبوت خالی قرآن مجید اور عربوں کے بیان ہی سے نہیں ملتا، بلکہ تورات میں بھی اس کی صراحت موجود ہے کہ حضرت اسماعیلؑ جو عربوں کے باپ ہیں حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے ہیں، انھوں نے اپنے لخت جگر حضرت اسماعیلؑ اور ان کی ماں حضرت ہاجرہؑ کو بکہ (مکہ) میں آباد کیا، اس طرح اسماعیلی عربوں کی نشوونما ہوئی اور وہ حجاز کی سرزمین میں آباد ہوئے، توراۃ کے باب پیدائش میں جابجا اس سلسلہ کی تفصیلات موجود ہیں مثلاً اٹھارہویں باب میں ہے کہ حضرت ہاجرہؑ کو جب حمل ہوا تو حضرت سارہؑ کو جو اس وقت تک بے اولاد تھیں رشک و حسد ہوا اور وہ ہاجرہؑ کو ستانے لگیں، ہاجرہؑ نے آزردہ ہو کر گھر چھوڑ دینے کا ارادہ

کیا، اور ایک چشمہ پر جو شور کی راہ میں واقع ہے، آکر ٹھہر گئیں، اس وقت خدا کے فرشتہ نے ان سے کہا:

"ہاجرہ اپنی بی بی کے گھر واپس جا میں تیری نسل کو اتنا بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے گی"

(تکوین، باب ۱۸)

حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسماعیلؑ سے جو تعلق اور غیر معمولی محبت تھی اس کا بھی توراۃ سے پتہ چلتا ہے، اس کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جب حضرت اسحاقؑ کی ولادت کی بشارت دی گئی تو اس سے ان کو کوئی خاص مسرت نہیں ہوئی بلکہ انھوں نے یہ فرمایا کہ:

"اے کاش اسماعیل تیرے حضور زندہ رہے" (تکوین ۱۸-۱۸)

اس پر خداوند نے فرمایا:

"اسماعیل کے حق میں میں نے تیری سنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے، اور میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا"

آگے اس کا ذکر ہے کہ حضرت سارہؑ نے اس ڈر سے کہ حضرت اسماعیلؑ باپ کی وراثت میں شریک ہو جائیں گے، حضرت ابراہیمؑ کو انھیں اور ان کی ماں حضرت ہاجرہؑ کو علٰحدہ کر دینے کے لئے مجبور کیا، اس پر حضرت ابراہیمؑ رنجیدہ ہوئے تو خداوند نے کہا:

"ابراہیم غم نہ کر، سارہ کی بات مان لے، تیری نسل اسحاق سے کہی جائے گی، تیرے بیٹے رخادمہ زاد) حضرت اسماعیلؑ کو بھی میں ایک قوم بناؤں گا، کہ یہ بھی تیری ہی نسل ہے" (تکوین: ۲۱-۱۳)

اس کے بعد ان کی روانگی اور ماں بیٹے کو عرب میں بسانے کا ذکر اس طرح ہے:

"ابراہیم صبح کو اٹھا اور روٹی لی اور پانی کا مشکیزہ ہاجرہ کو دیا ..... وہ روانہ ہوئی، اور بئر سبع کے میدان میں بھٹکتی رہی، مشکیزہ کا پانی چک گیا، بچہ کو ایک جھاڑی میں ڈال دیا، اور بچہ سے تھوڑی دور ایک تیر کے برابر ہٹ کر غمزدہ بیٹھ گئی اور اس نے کہا کہ بچے کو اپنی آنکھ سے مرتے نہیں دیکھوں گا اور الگ

---

[۱] یہ ترجمہ توراۃ کے مترجین کا ہے، کیونکہ بنی اسرائیل حضرت ہاجرہؑ کو حضرت سارہؑ کی لونڈی کہتے ہیں، اسی لئے وہ اپنے کو بنی اسماعیل سے افضل سمجھتے ہیں، یہاں اس کی تردید کا موقع نہیں، مولانا عنایت رسول چریاکوٹی نے اس موضوع پر ایک رسالہ [النصوص الباہرۃ فی حریۃ ہاجرۃ لکھا تھا

ہٹ کر گریہ وزاری کرنے لگی، خدا نے بچہ کی آواز سنی اور خدا کے فرشتہ نے آسمان سے ہاجرہ کو پکار کر کہا:

ہاجرہ! ڈر نہیں، خدا نے بچہ کی آواز جہاں وہ پڑا ہے سن لی، اٹھ اور بچے کو اٹھا، اور اپنے ہاتھ سے اس کو سنبھال کہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا، خدا نے ہاجرہ کی آنکھ کھول دی، اس کو پانی کا ایک کنواں نظر آیا، وہ گئی اور مشکیزہ کو پانی سے بھر لیا اور بچہ کو پانی پلایا، خدا اس بچہ کے ساتھ تھا، وہ بڑا ہوا، بیابان میں رہا اور ایک تیر انداز ہوا، وہ فاران کے بیابان میں رہا، اس کی ماں نے ملک مصر کی ایک بیوی اس کے لئے لی۔" (تکوین: ۲۱)

توراۃ کی ان واضح تصریحات کے بعد کون حضرت اسماعیلؑ کے حضرت ابراہیمؑ سے نسبی تعلق اور نسلی رشتہ کی نفی کی جرأت کر سکتا ہے، البتہ قرآن اور توراۃ کے مندرجہ بالا آخری بیان میں ایک نمایاں تضاد یہ ہے کہ حضرت اسماعیلؑ سے حضرت ابراہیمؑ کی غیر معمولی شفقت ومحبت کا ثبوت خود توراۃ ہی کے حوالہ سے اوپر نقل کیا گیا ہے، مگر اس بیان میں وہ ایک ایسے قسی القلب باپ نظر آتے ہیں جو شفقت پدری سے بالکل ہی خالی ہے، چنانچہ وہ اپنے بیٹے اور بیوی کو چند روٹیاں اور مشکیزہ دے کر گھر سے باہر نکال دیتے ہیں، اور فاران کے بے آب وگیاہ میدان میں چھوڑ دیتے ہیں اور پھر کبھی خود اس کا خیال ہی دل میں نہیں لاتے اور نہ اس کے پاس جاتے ہیں، جبکہ قرآن کی یہ واضح تصریح ہے کہ وہ خود بھی مکہ تشریف لے گئے تھے اور انھوں نے ہی وہاں ماں اور بیٹے کو خانہ کعبہ کی خدمت کے لئے بسایا تھا، لیکن یہاں اس اختلاف پر بحث وگفتگو کی گنجائش نہیں ہے، ہمارا مقصد تو صرف یہ دکھانا تھا کہ قرآن اور توراۃ دونوں سے قطعی طور پر حضرت اسماعیلؑ کا حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہونا اور مکہ کی وادیٔ غیر ذی زرع میں سکونت پذیر ہونا اور حضرت اسمٰعیلؑ کا خانہ کعبہ کی خدمت کے لئے وقف ہو جانا ثابت ہے۔

شروع ہی میں یہ تحریر کیا جا چکا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی نسل کی کثرت وبرکت کا ثبوت قرآن مجید اور توراۃ دونوں ہی سے پوری طرح عیاں ہے، یہاں یہ واضح کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ اس کثرت وبرکت کا ظہور بنی اسحاق کے مقابلہ میں بنی اسماعیل میں زیادہ ہوا، اس کی تفصیل یہ ہے:

"خدا نے حضرت ابراہیمؑ کی ذات کو خیر وبرکت کا سرچشمہ بنایا تھا، وہ حضرت نوحؑ کے بعد تمام آسمانی برکتوں کے وارث ہوئے، ارشاد ہے:

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ　　　بے شک اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل

اِبۡرٰهِيۡمَ وَاٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ۔ عمران کو اہل عالم کی رہنمائی کے لئے منتخب فرمایا۔

(آل عمران : ۳۳)

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ لکھتے ہیں :

" آل عمران بھی ذریت ابراہیمؑ میں شامل ہے، اس لئے خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے لئے گویا تمام عالم میں صرف آل ابراہیمؑ کا انتخاب ہوا، پھر حضرت ابراہیمؑ کے واسطہ سے تمام اہل زمین کو برکت دینے کا وعدہ کیا گیا " (تفسیر سورۂ کوثر)

توراۃ کی کتاب تکوین کے جو حوالے نقل کئے گئے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ خدا نے حضرت ابراہیمؑ سے برکت کا جو وعدہ کیا تھا، وہ ان کی ذریت کے واسطہ سے پورا ہوگا، گو یہ برکت حضرت اسحاقؑ کی ذریت سے بھی پھیلی، لیکن اس کا اصلی سبب حضرت اسماعیل اور ان کی ذریت ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور اسی کا نتیجہ ہے، کیونکہ آپؐ اُس سرزمین میں مبعوث کئے گئے تھے جو تمام برکتوں کا سرچشمہ تھی اور اللہ نے آپؐ کو اس سرزمین اور دین ابراہیمی کا وارث بنایا تھا، آپؐ کی بعثت سے تمام روئے زمین کے لئے عام برکت کا وعدہ پورا ہوا، کیونکہ آپؐ کی رسالت تمام عالم کے لئے ہے :

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا۔ (سبا : ۲۸)

ہم نے تم کو نہیں بھیجا، مگر تمام لوگوں کیلئے بشیر ونذیر بنا کر

نیز آپؐ ساری دنیا کے لئے رحمت تھے :

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ (انبیاء : ۱۰۷)

اور ہم نے تم کو نہیں بھیجا، مگر تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر۔

اوپر اسفار یہود کے حوالے سے یہ بھی گذر چکا ہے کہ بنی اسماعیلؑ و بنی اسحاقؑ کی علٰحدگی اس وجہ سے ہوئی تھی کہ جب اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت ہاجرہؓ کے بطن سے اولاد بخشی تو حضرت سارہؓ کو رشک ہوا، اور انھوں نے حضرت ہاجرہؓ کے ساتھ بدسلوکی کی، جسے حضرت ہاجرہ نے نہایت صبر کے ساتھ انگیز کیا، اس کے صلہ میں اللہ نے ان کو بڑی برکت دی، حضرت سارہؓ تحقیر کی وجہ سے انھیں لونڈی کہتی تھیں اور بنی اسحاق بنی اسمٰعیل کو کنیز زادے کہتے تھے، حالانکہ یہ بالکل خلاف حقیقت ہے، اور عملاً یہ ہوا کہ حضرت سارہؓ کی اولاد اسماعیلیوں کے ہاتھ مصر میں فروخت ہوئی، پھر ایرانیوں، مصریوں اور رومیوں نے ان کو گرفتار کیا اور غلام بنایا، اس کے برخلاف حضرت ہاجرہؓ کی اولاد اپنی پوری تاریخ میں کبھی غلامی کی

ذلت سے آشنا نہیں ہوئی۔

بنی اسماعیل کی ان خصوصیات وامتیازات سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں بنی اسحاق پر ہر حیثیت سے فوقیت وبرتری حاصل ہے، اور قرآن مجید اور توراۃ دونوں سے حضرت ابراہیمؑ سے ان کا رشتہ وتعلق نہایت قطعیت کے ساتھ ثابت ہے۔ اگر بفرض محال یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ اس کی مکی سورتوں کے اندر نہ حضرت ابراہیمؑ وحضرت اسماعیلؑ کے رشتہ کی صراحت کی گئی ہے، اور نہ ان کے خانہ کعبہ کے معمار ہونے کا ذکر ہے تو توراۃ کی ان صراحتوں اور شہادتوں کے بارے میں کیا کہا جائیگا۔

فاضل مستشرقین کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ عرب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی نبی نہیں گذرا، اس سلسلہ میں انھوں نے جو آیتیں نقل کی ہیں، ان کے مفہوم اور اسلوب کو سمجھنے میں یا تو انھیں دھوکہ ہوا ہے، یا انھوں نے دیدہ ودانستہ یہ شوشہ چھوڑا ہے، ورنہ حضرت اسماعیلؑ وحضرت محمدؐ کے علاوہ حضرت ہود، حضرت صالحؑ اور حضرت شعیبؑ کا تعلق بھی تو اسی سرزمین سے تھا جن کا خود قرآن نے بھی مفصل تذکرہ کیا ہے۔

جوزف شاخت اور اصولِ فقہ

از

جناب [illegible] صاحب، ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد پاکستان

اسلام اور اس کی تعلیمات پر غور کرنے، انھیں سمجھنے اور اس پر عمل کرنے یا اس کا انکار کرنے سے پہلے مسلمانوں اور غیر مسلموں پر لازم ہے کہ وہ بنیادی مآخذ سے اسلام کا گہرا مطالعہ کریں تاکہ وہ کسی نتیجہ پر پہونچ سکیں، اس قاعدہ کو پیش نظر رکھ کر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں نے بھی اسلام اور اس کی تعلیمات کو اپنے مطالعہ فکر اور تحریر کا موضوع بنایا ہے۔

مسلمانوں اور اسلام کے بارہ میں غیر مسلموں کی تحریروں کو نہ صرف پڑھا بلکہ ان پر کڑی تنقید بھی کی، جن غیر مسلموں نے اسلام کے بارہ میں لکھا، انھیں عام طور پر مستشرقین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اگرچہ بعض اوقات یہ اصطلاح صرف اُن غیر مسلموں کے لئے استعمال کی جاتی ہے جن کا تعلق یورپین ممالک سے ہے، اور انھوں نے اسلام کے بارہ میں کچھ لکھا ہے، لیکن عام طور پر یہ اصطلاح ان سب اصحابِ علم کے بارہ میں استعمال ہوتی ہے جو غیر مسلم ہوں اور انھوں نے اسلام کے بارہ میں کچھ نہ کچھ کام کیا ہو، اگرچہ اسلام کے بارہ میں غیر مسلموں نے ابتدا ہی سے غور وفکر شروع کر دیا تھا، یہودیوں اور عیسائیوں نے اس دین کو آغاز رسالت ہی سے اپنے اعتراضات کا ہدف بنایا، لیکن وہ گروہ جسے ہم مستشرقین کے نام سے یاد کرتے ہیں، ان کا آغاز صلیبی جنگوں میں غیر مسلموں کی ناکامی کے بعد ہوا تھا، صلیبی جنگوں کی ناکامی نے غیر مسلموں میں یہ شعور پیدا کر دیا تھا کہ اب وہ سیاسی طور پر مسلمانوں سے نبرد آزما نہیں ہو سکتے، اس لئے اب ایسے ذرائع اپنانے چاہئیں جن سے مسلمانوں کو مرعوب کر کے ان پر غلبہ حاصل کیا جا سکے، ظاہر ہے کہ ایسا کرنے کے لئے ان کے پاس اسلام کو مسخ کر کے پیش کرنے کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں تھا، چنانچہ انھوں نے اس میدان میں یلغار کی اور اس کے لئے مستشرقین نے نہ صرف اسلام کو مسخ کیا بلکہ اس آڑ میں اپنے ادیان کی تبلیغ کا بھی فریضہ ادا کیا، اس سلسلہ میں لارڈ ایلنبی نے کہا تھا،

"اگرچہ عسکری نقطۂ نظر سے جنگ ختم ہو چکی ہے، مگر جہاں تک دینی تعصب کا تعلق ہے، وہ مستشرقین کی تحریروں

میں نہ صرف باقی ہے بلکہ اس میں روز افزوں اضافہ ہوگا۔ غیر مسلم۔ اسلام اور اس کی ثقافت کے بارہ میں جب بھی لکھیں گے مسلمانوں کو پس ماندہ، کمزور اور ثقافت سے عاری ثابت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے "

یہی وجہ ہے کہ ہم جب بھی مستشرقین کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو انھیں اسلام کے خلاف بھرے ہوئے پاتے ہیں، یہ حقیقت تاریخی طور پر ثابت ہے کہ استشراق کی تحریک کا مقصد علم کی خدمت یا اسلام کی وراثت کو ضائع کرنے سے بچانا ہرگز نہیں ہے، بلکہ یہ تحریک کلیسا کے زیر اثر پیدا ہوئی، بڑے بڑے پادری اس تحریک کی حوصلہ افزائی کرتے رہے اسی طرح عیسائی اور یہودی حکومتوں نے بھی اس تحریک کی شائع کرنے کو بہانہ سے اسلام کی صحیح فکر کو نشو ونما پانے سے روکا، مسلمانوں کے طرز فکر کی اشاعت کرنے کے بجائے اپنے خیالات پیش کیے اور بعض مقامات پر حقائق سے چشم پوشی کر کے اسمیں تحریف بھی کی بنیادی مآخذ سے اپنی لاعلمی کی وجہ سے وہ حقائق کو آسانی سے مسخ کر سکے اور نتائج اخذ کرنے کی عجلت میں اپنے کو حقائق سے ہمیشہ دور رکھا، اس طرح انھوں نے بے شمار غلطیاں کیں، جن کا اعتراف مستشرقین نے خود بھی کیا ہے، چنانچہ اربری کا کہنا ہے:

"ہم مستشرقین نے جب اسلام کے بارہ میں تحقیق کی تو بے شمار غلطیاں کیں، ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس موضوع میں نہ الجھیں، کیونکہ مسلمان عرب مسلمان ہم سے زیادہ باصلاحیت ہیں کہ اسلام کے موضوعات پر تحقیق کریں۔ مسلمانوں کو مستشرقین کی ہر تحریر کو دقت نظر سے دیکھنا چاہیے، جرح و تعدیل کے اصولوں پر، ان کے نتائج تحقیق کو قبول کرنے سے پہلے ان کی چھان پھٹک اشد ضروری ہے۔"

اس مختصر تمہید کے بعد ہم اپنے اصل موضوع شاخت اور اصول فقہ کی طرف آتے ہیں، اس موضوع کو ہم نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلے حصہ میں ہم شاخت کے مختصر حالات زندگی اور اس کی تالیفات کا ذکر کریں گے اور دوسرے حصہ میں اصول فقہ کے بارہ میں شاخت کے افکار کا جائزہ لیں گے

جوزف شاخت کے مختصر حالات اور علمی کارنامے

جوزف شاخت ۱۹۰۲ء میں جرمنی میں پیدا ہوئے، ان کا تعلق یہودی مذہب سے تھا، انھوں نے جامعہ برسلاؤ اور جامعہ ہیڈلبرگ میں تعلیم پائی، کچھ دنوں ایک یونیورسٹی میں درس دینے کے بعد ۱۹۳۲ء میں کونگس برگ یونیورسٹی میں چلے گئے، ۱۹۳۴ء میں جامعہ مصریہ میں منتقل ہوئے، آکسفورڈ یونیورسٹی میں ۱۹۴۶ء میں علوم اسلامیہ کے ریڈر مقرر ہوئے، ۱۹۵۲ء میں الجزائر یونیورسٹی میں علمی تحریکوں کی استاذ ہو گئے، کولمبیا یونیورسٹی میں بھی پروفیسر رہے، وہ بہت سی علمی اور ادبی تنظیموں کے رکن ہوئے، ان کو مجمع العلمی

العربی الدمشق کی بھی رکنیت ملی کچھ عرصہ تک وہ مجلہ علوم اسلامیہ کے مدیر بھی رہے، اسلامی قانون کی ابتداء، ترقی، اس کی
اثر پذیری اور اثر اندازی، ان کا خاص موضوع ہے، اور یہی ان کی شہرت کا باعث ہوا۔

شاخت کی تصانیف | جوزف شاخت نے بے شمار کتب اور لاتعداد علمی مقالات یادگار چھوڑے ہیں، جن کا احاطہ ممکن نہیں
ہے، ہم ان میں سے بعض کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) تحقیق کتاب الحیل والمخارج للخصاف (۲) تحقیق کتاب الحیل فی الفقہ للقزوینی، اس کتاب کا جرمن زبان میں
ترجمہ کیا (۳) تحقیق کتاب المخارج فی الحیل للشیبانی، اس کتاب پر حواشی بھی لکھے (۴) طحاوی کی کتاب الشروط سے اذکار
الحقوق اور کتاب الشفع شائع کیں (۵) استانبول اور قاہرہ کے کتب خانوں کی فہرستیں تین جلدوں میں تیار کیں (۶)
دین اسلام کے نام سے منتخب مقالات شائع کئے اور ان کا جرمن میں ترجمہ کیا (۷) رسالہ جالینوس فی الاسمار الطبیہ
جرمن ترجمہ کے ساتھ شائع کیا (۸) الرسالۃ الکاملیۃ لابن نفیس کو تحقیق کے بعد جرمن ترجمہ کے ساتھ طبع کرایا (۹) ابن بطلان
کے خمس رسائل تحقیق اور انگریزی ترجمہ کے ساتھ پیش کئے (۱۰) اسلامی احکام کی حنفی طریقہ پر تبویب کی (۱۱) فقہ کا ارتقاء
کے نام سے انگریزی زبان میں کتاب لکھی (۱۲) ماتریدی کی کتاب التوحید تحقیق کے ساتھ طبع کی (۱۳) اسلامی قانون کا
تعارف۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھی، مذکورۂ بالا کتابوں کے ساتھ جوزف شاخت نے دائرۂ معارف اسلامیہ،
دائرۂ معارف علوم اجتماعیہ اور تاریخ فقہ اسلامی میں اسلام کے بارہ میں بہت سے مقالے تحریر فرمائے، مزید براں شاخت
نے دنیا کے قریباً تمام معروف علمی رسائل میں مضامین لکھے، ان کے مضامین اسلامی اور مغربی ممالک کے رسائل میں طبع
ہوئے اور بڑی دلچسپی سے پڑھے گئے۔

اگر جوزف شاخت کے تحقیقی مضامین اور کتابوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں علوم اسلامیہ کے درج ذیل
شعبوں سے دلچسپی تھی۔ (ا) اصول الفقہ (ب) فقہ حنفی (ج) علم الکلام (د) عربی مخطوطات۔

شاخت کی تحریریں بہت پختہ اور مقصدیت سے پُر ہوتی ہیں، اس لئے بہت دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں، لیکن ان کو
اصلی شہرت، اس حیثیت سے حاصل ہوئی کہ انھوں نے اصول فقہ میں گرانقدر خدمات انجام دیں، اسلامی قانون اور خاص طور
سے اسلامی قانون کے اصولوں کے بارے میں انھیں مستشرقین کا باوا آدم تصور کیا جاتا ہے، کیونکہ اسلامی قانون پر فلسفیانہ اور
ناقدانہ بحثیں جس انداز میں شاخت نے کی ہیں، اس طرح کسی اور مستشرق نے نہیں کی ہیں، ہم اس مقالہ میں شاخت کے افکار

کا مختصر جائزہ صرف اس حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے مفروضات قائم کرکے کس طرح غلط فہمی پیدا کی اور اس بنا پر اسلامی قوانین کی ساری بنیادیں متزلزل کر دیں۔

جوزف شاخت نے اسلامی قانون پر بہت سے مقالات کے ساتھ دو مستقل کتابیں بھی تحریر کیں جن کے نام یہ ہیں:

1. The Origin of Muhammadan Jurisprudence
2. An Introduction to Islamic Law

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے پہلی کتاب کا تعلق مسلمانوں کے اصول قانون (فقہ) سے ہے، یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۵۰ء میں برطانیہ میں طبع ہوئی تھی، بعد میں اس کے کئی اڈیشن چھپے، شاخت کی اس کتاب کو بہت قبولیت حاصل ہوئی، غیر مسلموں کے علاوہ مسلمانوں نے بھی اس کتاب کو بہت دلچسپی سے پڑھا اور اس کی غلطیوں کی نشان دہی کی، شاخت نے اپنی کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلا حصہ قانونی نظریہ کا ارتقاء دس ابواب پر مشتمل ہے، دوسرا حصہ قانونی روایات کا ارتقاء کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلا حصہ قانونی نظریہ کا ارتقاء دس ابواب پر مشتمل ہے، دوسرا حصہ قانونی روایات کا ارتقاء چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، تیسرے حصے میں قانونی مذاہب کی پیدائش پر نو ابواب ہیں، چوتھا حصہ قانون کے تکنیکی افکار کا ارتقاء کے چھ ابواب ہیں، مزید براں کتابیات اور اختصارات کی وضاحت کے ساتھ کتاب کے آخر میں ایک مفید انڈکس بھی شامل ہے، جوزف شاخت نے یہ کتاب لکھ کر اسلامی قانون کو مغربی دنیا میں متعارف کرانے کا اہم کام انجام دیا، مگر اس کی وجہ سے اسلامی قانون سے متعلق مستشرقین کے نظریات شکوک وشبہات اور اعتراضات واضح طور پر سامنے آگئے، شاخت نے اسلامی قانون کے بکھرے ہوئے مواد کو ایک جگہ ضرور جمع کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے اسلام کے مسلمات کو پامال کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ انھوں نے اسلامی قانون اور اس کے اصولوں کے بارے میں جو غلط نظریات اختیار کئے ہیں اگر ان سب کا محاسبہ کیا جائے تو مقالہ طویل ہو جائے گا، اس لئے ہم ذیل میں ان کے صرف تین نظریات کا نہایت اختصار کے ساتھ جائزہ لیتے ہیں، مستشرقین کی ایک عادت رہی ہے کہ وہ جب بھی کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو وہ اس کے مسلمات کو جھٹلانے یا ان میں تشکیک پیدا کرکے خود اپنا نظریہ گھڑتے ہیں، چنانچہ یہی قاعدہ انھوں نے بھی اصول قانون کے بارہ میں اپنایا ہے، اس حقیقت سے ہر اہل علم واقف ہے کہ اسلامی قانون کے چار بنیادی ماخذ قرآن، سنت، اجماع اور قیاس ہیں، جوزف شاخت نے ان سب کو جھٹلانے کی کوشش کی ہے۔

قرآن حکیم مسلمانوں کے لئے ضابطۂ حیات ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے، یہ حقیقت ہے کہ پہلی وحی کے نزول ہی سے مسلمان اس سے ہر طرح استفادہ کرنے لگے تھے، انھوں نے زندگی کے ہر موڑ پر قرآن حکیم سے رہنمائی حاصل کی، جب کہ شاخت کا خیال ہے کہ (ا) اسلامی قانون براہ راست قرآن حکیم سے اخذ نہیں کیا گیا (ب) اسلامی قانون کا خمیر بنی امیہ کے انتظامی عمل سے اٹھایا گیا (ج) بعض اوقات بنی امیہ کا عمل قرآن حکیم کے الفاظ پر بھاری ہوتا تھا، یہ خیال کہ ابتدائی دور میں قوانین بنانے میں قرآن حکیم سے استفادہ نہیں کیا گیا، ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، کیونکہ تاریخی شواہد موجود ہیں کہ مسلمانوں نے قرآن حکیم کو قانون کا اولین ماخذ بنایا، نبی کریمؐ اور صحابۂ کرامؓ کے عہد میں قرآن حکیم سے مکمل طور پر استفادہ کیا جاتا رہا، چوروں کے ہاتھ کاٹے گئے، زانیوں کو کوڑے لگائے گئے، شراب پینے والوں پر تعزیر نافذ ہوئی، بدکرداروں کو ملک بدر کیا گیا، نکاح وطلاق نیز وراثت کی تقسیم کے فیصلے قرآن حکیم کے احکام کے مطابق کئے گئے، اس سے ذرا آگے بڑھئے اور معاذ بن جبلؓ والی مشہور روایت پر توجہ دیجئے کہ نبی کریمؐ نے جب انھیں قاضی بنا کر بھیجا تو ان سے دریافت کیا کہ تم فیصلے کس چیز سے کیا کروگے، اُس کے جواب میں انھوں نے سب سے پہلے جس ماخذ کا ذکر کیا، وہ قرآن حکیم تھا، چنانچہ انھوں نے بے ساختہ کہا کہ قرآن حکیم سے، نبی کریمؐ نے یا کسی بھی صحابی نے ان کے اس خیال کی تردید نہیں کی، جس سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں ابتدا ہی سے، قرآن حکیم قانون کا اصلی اور بنیادی ماخذ تھا، البتہ اتنی بات قابل تسلیم ہے کہ قرآن حکیم اصولوں کی کتاب ہے اور اس میں جملہ جزئیات کا احاطہ نہیں کیا گیا، اور قرآن حکیم کو قانونی ماخذ بنانے کے لئے جن کلیات کی ضرورت تھی، وہ بعد میں مرتب ہوئے، اور آج تک مرتب ہو رہے ہیں، آج بھی اگر کوئی جدید مسئلہ درپیش ہو اور قرآن حکیم کی کسی آیت سے کوئی کلیہ بنایا جا سکے تو وہ ہمارے لئے ویسے ہی قابل عمل ہوگا، جیسے امام شافعیؒ یا امام ابوحنیفہؒ کا قائم کردہ کوئی کلیہ قابل عمل ہوتا ہے؟ شارع علیہ السلام نے اپنی حیات طیبہ کے آخری دور میں ارشاد فرمایا کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، ایک کتاب اللہ اور دوسری اپنی سنت، جب تک ان پر عمل پیرا ہوگے، کبھی گمراہ نہ ہوگے، اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ قرآن حکیم عہد رسالت سے ہی قانون کا ماخذ بن گیا تھا، اور مسلمان ہر قانون اسی سے اخذ کرتے تھے، چنانچہ مسلمانوں کے ہاں ایک عام اصول رہا کہ ایسی کوئی بات تسلیم نہیں کی جائے گی جو قرآن حکیم کے احکام یا اس کی روح کے خلاف پائی جائے،

شاخت نے یہ لکھا ہے کہ بنی امیہ کی انتظامی روایت سے مسلمانوں کے قانون کا خمیر اٹھا اور دوسرے مقام پر انہی فاضل مستشرق نے یہ بھی تحریر فرمایا کہ بنی امیہ سے پہلے مسلمانوں کے قانون کو فکشن (افسانہ) کا درجہ حاصل تھا، نیز انھوں نے یہ بھی

لکھا کہ بنی امیہ کے انتظامی عمل کو قرآن حکیم پر ترجیح دی جاتی رہی ہے، یہ ساری باتیں کوئی اہل علم نہیں کہہ سکتا، کیونکہ مسلمان قرآن حکیم کے خلاف کسی حدیث کو بھی قبول نہیں کرتے تھے، چہ جائیکہ وہ بنی امیہ کے عمل کو زیر غور لائیں۔

عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ مسلمانوں کے نزدیک اسلامی قانون کی تدوین کا زریں دور ہے۔ آج بھی اگر مسلمانوں کو کسی قانون یا اس کی تعبیر کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ اپنے اس عہد زریں کا مطالعہ کرتے ہیں اور اسی کو مثال بناتے ہیں، جب کہ فاضل مستشرق نے اس دور کو اسلامی قانون کا افسانوی عہد قرار دیا ہے۔ اس کو علمی خیانت بلکہ اسلام کے خلاف تعصب کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

قرآن کے بعد سنت، مسلمانوں کے ہاں قانون کا دوسرا بڑا ماخذ ہے، مسلمان فقہاء کو جن امور کے بارے میں قرآن کریم سے رہنمائی نہیں ملی وہاں انھوں نے سنت کی طرف رجوع کیا، اور اسے نہ صرف ماخذ قانون کے طور پر اپنایا بلکہ سنت کو اسلامی قانون کی عملی تعبیر بھی سمجھا، لیکن فاضل مستشرق نے سنت کو بھی اپنی بحث کا موضوع بنایا اور اس میں شک و شبہ پیدا کر دیا ہے، ان کا خیال ہے کہ (ا) حدیث نبویؐ دوسری صدی کے وسط تک موجود نہیں تھی، (ب) جب حدیث کو جمع کیا گیا، اس وقت وہ اصلی حالت میں موجود نہیں تھی، بلکہ اس میں معاشرہ کی عادات شامل ہو چکی تھیں، یہ دونوں مفروضے حقائق پر مبنی نہیں ہیں، کیونکہ حفاظت اور کتابت حدیث کا اہتمام جس طرح مسلمانوں نے کیا ہے وہ کسی دوسرے مذہب والوں کو نصیب نہیں ہوا۔ اس امر کی تاریخی شہادت موجود ہے کہ صحابہ کرامؓ، احادیث رسول لکھا کرتے تھے، ان کے پاس عہد صحابہ میں بھی اپنے اپنے صحیفے موجود تھے، جن میں صحیفہ ابو ہریرہؓ، صحیفہ حضرت علیؓ اور صحیفہ وہب بن منبہ کے وجود کی تاریخی شہادت ملتی ہے، مزید نبی کریمؐ نے جو خطوط مختلف اوقات میں تحریر کرائے اور جو بعد میں اسلامی قانون کا جز بنے، وہ سارے کے سارے تحریری شکل میں موجود تھے، مزید براں عربوں کا حافظہ مثالی تھا، وہ ساری باتیں اس عمدگی سے حفظ کر لیا کرتے تھے کہ عام انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

یہ اعتراض کہ جب حدیث نبویؐ کو حیطۂ تحریر میں لایا گیا تو اس وقت اس میں معاشرتی آمیزش ہو چکی تھی، محض ظنی ہے، اس کا تعلق حقیقت سے کچھ بھی نہیں کیونکہ نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے "من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار" جس نے جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ کی نسبت کی، اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا، اس حدیث کی روشنی میں کس کو جرأت اور ہمت ہو سکتی ہے کہ وہ جھوٹی حدیث گھڑے، پھر مسلمانوں نے حدیث کی جرح و تعدیل کے ایسے اصول مرتب کیے جن کی موجودگی

میں حدیث کے صحیح یا غلط ہونے کے بارہ میں فیصلہ کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی، یہی وجہ ہے کہ ہم آج بھی حدیث کو ان اصولوں پہ پرکھ کر کھرا کھوٹا الگ کر سکتے ہیں، چنانچہ ہمیں اس وقت بھی موضوع اور صحیح حدیثیں معلوم ہیں، موضوعات پر الگ الگ کتابیں موجود ہیں، ان حقائق کی روشنی میں فاضل مستشرق کے مغالطے اور شکوک وشبہات بالکل بے بنیاد ہوتے ہیں جن کا مقصد شکوک وشبہات کو ابھارنے کے علاوہ کچھ نہیں۔

مصادر اس مقالہ کی تیاری میں درج ذیل کتب سے مدد لی گئی:

۱۔ نجیب العقیقی، المستشرقون، دار المعارف مصر ۱۹۶۵ء

۲۔ دکتور مصطفیٰ سباعی، السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی، دار القومیہ۔ مصر ۱۹۳۹ء

۳۔ زکریا ہاشم زکریا۔ المستشرقون والاسلام۔ المجلس الاعلیٰ لشئون اسلامیہ قاہرہ۔

(۴) Schacht. J. The Origin of Muhammadan Jurisprudence Oxford Press 1950

(۵) Schacht.J.Introduction to Islamic law Oxford Press 1964

Dr.Fazlur Rahman.Islam.London 1965

(۶)

(۷) Dr.Ahmad Hasan. The Early Development of Islamic Jurisprudence, Islamabad 1970

(۸) S.R.H.Gilani.The Reconstruction of Legal Thought in Islam. Lahore 1977

9 Dr. Zafar Ishaq Ansari.Development of Fiqh in Kufah M.S.

(۲)

جوزف شاخت اور اسلامی قانون[۱]

جوزف شاخت ہمارے دور کے نہایت ممتاز اہل قلم میں سے ہے، اسے اسلامی قانون کے ابتدائی ادوار کے نشوو ارتقا پر سند تسلیم کیا جاتا ہے، اور اس کی تحریروں کے اثرات بڑے نمایاں طور سے اس کے ہم عصر مصنفین کے خیالات پر نظر آتے ہیں، اسلامی قانون کے سرچشمے Origin of Muhammadan Jurisprudence

ORIGINS OF MUHAMMADAN JURISPRUDENCE

نامی کتاب میں اس نے اپنے خیالات بڑے مدلل اور مفصل طریقے سے پیش کئے ہیں، یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ مذکور کے بارے میں وہ اسلامی قانون کے ارتقا کی پوری تصویر پیش نہیں کر سکا اور کتنے ہی اہم سوالات کا جواب اس نے تشنہ چھوڑ دیا تاہم اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں کہ مستشرقین اور قانون اسلامی کے مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کے دماغوں کو اس نے بہت متاثر کیا ہے، یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی قانون کی ابتدا اور ارتقا کے بارے میں شاخت کے بنیادی خیالات مستعار ہیں، لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ اسلامی قانون کے بارے میں جس نقطہ منظر سے سوچنے کی ابتدا گولڈزیہر نے کی اور اسکے نتیجہ میں مغرب میں جو طرز فکر وجود میں آیا شاخت اس کا سب سے بڑا اور بہترین نمایندہ اور شارح ہے، شاخت نے گولڈزیہر کے خیالات کو بنیاد بنا کر اس پر ایک پوری عمارت تعمیر کر دی، اور گولڈزیہر کے پیش کردہ نتائج فکر کی تائید و توثیق کی۔

گولڈزیہر نے حدیث کی داخلی تنقید کی بنیاد ڈالی۔ یہ داخلی تنقید محدثین وناقدین حدیث کی تنقید متن وسند سے قطعاً مختلف ایک بالکل نئی چیز ہے، گولڈزیہر کا دعویٰ ہے کہ معدودے چند احادیث ہی ایسی ہوں گی، اگرچہ ان کا وجود بھی مشکوک ہے جن کا تعلق اس ابتدائی دور سے ثابت کیا جا سکتا ہو، جس کی پیداوار انھیں سمجھا جاتا ہے۔ وہ اس سے آگے قدم بڑھا کر یہ کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب احادیث کی بھاری اکثریت سرے سے دور نبوی سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتی بلکہ وہ بعد کے اسلامی ادوار کی پیداوار ہیں۔ زیادہ واضح الفاظ میں گولڈزیہر کا دعویٰ یہ تھا کہ احادیث چاہے وہ صحیح ترین کتب حدیث میں پائی جاتی ہوں، اور چاہے ان کی صحت علمائے اسلام کے نزدیک کتنی ہی ثابت شدہ اور متفق علیہ کیوں نہ ہو، علاوہ ایک قلیل ترین تعداد کے سب موضوع اور جعلی ہیں، حدیث کے بارے میں گولڈزیہر کے ان خیالات کو اسلامی قانون کے مغربی مولفین میں بڑا حسن قبول حاصل ہوا اور ان کی شرح، تائید، توثیق میں خوب لکھا گیا، اسنا ڈک ہار گرونیے نے اسلامی قانون پر لکھتے ہوئے بڑی حد تک گولڈزیہر ہی کے خیالات پر اپنی بنیاد رکھی، شاخت نے بھی اسلامی قانون کی ابتدا اور اس کی نشوو ارتقا کے بارے میں گولڈزیہر ہی کی فراہم کردہ بنیادوں پر عمارت اٹھائی اور اس بات کا اقرار بھی کیا کہ اس کی تحقیقی کاوشیں بہت بڑی حد تک گولڈزیہر کے افکار و آرار کی توثیق کرتی ہیں، لیکن شاخت کا خود اپنا کام اسی حد تک محدود نہیں رہا۔ اس نے کتاب الام کا تفصیلی مطالعہ کیا اور گولڈزیہر سے بہت آگے بڑھ کر بعض دعاوی پیش کئے جن میں سے خصوصیت کے حامل حسب ذیل ہیں

۱۔ کتبِ احادیث میں درج شدہ اکثر و بیشتر احادیث وہ ہیں جو امام شافعیؒ کے بعد رواج پذیر ہوئیں۔

۲۔ قانونی مواد پر مشتمل احادیث جن کا انتساب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا جاتا ہے، ان کا پہلا بڑا حصہ دوسری صدی ہجری کے وسط میں ظہور پذیر ہوا، صحابہ اور تابعین کے آثار ان احادیث سے زماناً متقدم ہیں اور ان احادیث سے پہلے ہی مروج ہو چکے تھے، فقہی مذاہب کی زندہ روایات کو بھی ان احادیث سے تقدم زمانی حاصل ہے۔

۳۔ صحابہ و تابعین کے آثار بھی نشو و نما کے اسی عمل اور دور سے گزرے ہیں جن سے احادیث گزری ہیں اور انھیں بھی اسی نظر سے دیکھنا چاہیے جس سے احادیث کو۔

۴۔ اسناد کے مطالعے سے بسا اوقات احادیث اور روایات کے زمانہ کو دریافت کیا جا سکتا ہے،

۵۔ اسناد کا مزاج یہ ہے کہ ان کی سمت سفر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہوتی ہے، اور وہ زیادہ سے زیادہ اور عالی سے عالی تر مرتبۂ استناد حاصل کرنا چاہتی ہے، یہاں تک کہ بالآخر وہ ذات نبویؐ پر منتہی ہو جائیں۔

۶۔ قانونی مواد پر مشتمل احادیث کی شہادت صرف سنہ ۱۰۰ ہجری پیچھے تک لے جاتی ہے۔

۷۔ سنہ ۱۰۰ ہجری کا زمانہ وہ ہے جب اسلامی قانونی فکر کی ابتدا اموی انتظامی امور اور عوامی عرف و رواج کے مواد سے ہوتی ہے، جس کی چھاپ آج بھی بہت سی احادیث پر نمایاں طور سے پائی جاتی ہے۔

شاخت نے احادیث میں پائی جانے والی سنت کے بارے میں امام شافعیؒ کے رویے سے بعض نہایت اہم نتائج نکالے ہیں، اور ان نتائج کو نیز قانونی مواد پر مشتمل احادیث کو اسلامی قانون کے ارتقا اور اس کے اصولوں کو سمجھنے کے لئے استعمال کیا ہے اس کا کہنا ہے کہ امام شافعیؒ سے دو صدی پہلے یہ عام اصول تھا کہ صحابہ اور تابعین کے آثار کا حوالہ بطور سند کے دیا جاتا تھا، اور ان کی تعبیر زندہ روایت کی روشنی میں کی جاتی تھی، شاخت نے زندہ روایت کے لفظ کو کئی ان تصورات کے لئے استعمال کیا ہے جنھیں فقہ اسلامی کے قدیم مسالک میں وہی مرتبہ حاصل تھا۔ جو شاخت کے خیال میں بعد میں سنت نبویؐ کو دے دیا گیا۔ ان تصورات میں سب سے اہم شاخت کے نزدیک رواج یا عمل یا الامر المجتمع علیہ ہے، زندہ روایت کی روشنی میں تعبیر کا سب سے اہم مظہر کسی فقہی مسلک کے فقہاء کا کسی امر پر اجماع ہو جاتا تھا، شاخت کا کہنا ہے کہ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا تھا کہ حدیث نبویؐ کا کسی مسئلے میں حوالہ دیا جاتا ہو اور اسی طرح کا کوئی حوالہ محض ایک استثناء کی حیثیت رکھتا تھا۔ شاخت کے خیال میں یہ امام شافعیؒ کا کام ہے کہ اسی استثناء کو اصول کی حیثیت حاصل ہو گئی، مذکورہ حالات کے پیش نظر شاخت

کا کہنا ہے کہ صحابہ و تابعین کے آثار کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منسوب احادیث پر تقدم زمانی حاصل ہے۔

فقہ کا اولین ماخذ قرآن کریم ہے۔ شاخت اس سے منکر ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہے کہ قرآن کریم اسلام کے ابتدائی قانونی مواد و نظریات کا اولین اور بنیادی سرچشمہ ہے، اس کے خیال میں اسلامی قانون کا ماخذ براہِ راست قرآنِ کریم نہیں بلکہ اسلامی قانون درحقیقت دورِ اموی کے عام رواج اور انتظامی اعمال و افعال کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے جس کو اسلامی قانون کی تشکیل کے لئے خام مواد کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ اگرچہ یہ رواج و اعمال کتنی ہی جگہ قرآن کریم کے مضمرات اور بعض اوقات اس کے صریح احکام کی خلاف ورزی پر مشتمل تھے، اس طرح شاخت کے نزدیک اسلامی قانون کی ابتداء دوسری صدی ہجری سے ہوتی ہے، جب کہ فقہ اسلامی کے قدیم مسالک باقاعدگی کے ساتھ نمودار ہونا شروع ہوتے ہیں، شاخت کا کہنا ہے کہ قواعد فقہیہ بھی اس دور کی پیداوار ہیں اور ان ہی کو بعد میں حدیث کی شکل میں پیش کر دیا گیا، اسکے خیال میں قواعد فقہیہ سب سے پہلے عراق میں نمودار ہوئے اور یہ فقہ اسلامی کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ انھیں ابھی حدیث کا لباس نہیں پہنایا گیا تھا، فقہاء و محدثین دونوں اسپر متفق ہیں کہ قانونی مواد پر مشتمل احادیث یعنی احادیث احکام انتہائی مضبوط بنیادوں پر استوار ہیں، اور صحت و اعتماد انتہائی امکانی دولت سے مالا مال ہیں، اس صحت و اعتماد کے حصول کے لئے ہر وہ کوشش عمل میں لائی گئی ہے جو انسان کے بس میں ہو، شاخت انہی حدیث کو پایۂ اعتبار سے ساقط قرار دیتا ہوا انہیں موضوع اور جعلی قرار دیتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ احادیث احکام وضع کرنیکا زمانہ دوسری صدی ہجری کا نصف اول ہے، مزید براں اسناد اور نقید اسناد محدثین کے نزدیک جعلی اور مشکوک احادیث کی پہچان کا بہترین ذریعہ ہیں، لیکن شاخت کا کہنا ہے کہ علمائے اسلام کے یہ دعاوی بے بنیاد ہیں اور احادیث احکام کے سلسلہ میں ان کو پیش کرنا درست نہیں، اس کا دعویٰ ہے کہ اسناد کی ابتدا نہایت سادہ شکل میں ہوئی، ان کی تکمیل کہیں تیسری صدی ہجری میں جا کر ہوئی، علمائے اسلام جن اسناد کو اول درجے کی اور معتمد ترین قرار دیتے ہیں، ان کے بارے میں علماء کے خیالات سے اتفاق کرنا مشکل ہی ہے، اس کا کہنا ہے کہ سلسلۃ الذہب جسے اعلیٰ ترین معیاری سندوں میں شمار کیا جاتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ وہ امام مالکؒ سے پیشتر کے دور میں پھیلے ہوئے جعل و وضع کے عمل کا براہ راست نتیجہ ہیں، شاخت کے خیال میں اسناد انتہائی لاپرواہی سے مرتب کر دی جاتی تھیں، اور کسی بھی قدیم مستند شخصیت کے منہ میں اپنے پسندیدہ نظریات و خیالات ڈال کر اسے کسی بھی سند میں شامل کر دیا جاتا تھا۔ شاخت امور انتظامی عمل کو فقہ اسلامی کا سرچشمہ قرار دیتا ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت رسول شارع اور قانون ساز ماننے سے قطعاً منکر ہے اسکے نزدیک حضورؐ کی حیثیت فقط ایک معلم اخلاق کی ہے، تشریع نہ حضورؐ کا منصب

ہے نہ آپ کے فرائض میں شامل، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی قانون کی ابتدا تشکیل اور ارتقا کے نقطۂ نظر سے شاخت کی نظر میں اصل اہمیت دورِ نبوی کو نہیں دورِ اموی کو حاصل ہے، اس طرح قرآن وسنت اور ان کے نصوص شاخت کے نزدیک اسلامی قانون کی نہ اساس ہیں، نہ ماخذ، نہ سرچشمہ، اس طرح شاخت کی نظر میں سارا حدیثی سرمایہ جعلی و وضعی قرار دے کر رد کر دیا جاتا ہے، اور نصوص قرآنیہ کو اگرچہ محرف یا جعلی قرار نہیں دیا جا سکا تاہم فقہ اسلامی کے ماخذ کی حیثیت سے عملاً ان کی اہمیت کا انکار کر دیا جاتا ہے۔

شاخت کے ان نظریات کی بنیاد اسی مفروضے پر قائم ہے کہ پہلی صدی ہجری میں قانون دینِ اسلام کے دائرے سے باہر ایک قطعاً اجنبی چیز تھی، دوسری صدی ہجری میں اسے دینِ اسلام کے دائرے میں شامل کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطمحِ نظر ہرگز کسی تشریعی نظام کا قیام نہ تھا، آپ کا مقصد فقط اخلاقی اصلاح تھا، مگر قرآن کریم خود شاخت کے ان مفروضات کی بلند آہنگی کے ساتھ تردید کرتا ہے، قرآن قانون واخلاق کے اس جوہری اور بنیادی فرق اور علیحدگی کا سرے سے قائل نہیں جو خالصتہً مغرب کی پیداوار ہے، اور جسے شاخت نے فقہ اسلامی کی تعبیر کے سلسلے میں رہنما اصول کے طور پر برتا ہے، قرآن کریم ہر قانونی حکم کو کسی نہ کسی اخلاقی قدر سے مربوط کرتا ہے اور دونوں کو کسی نہ کسی صفت خداوندی سے وابستہ کر دیتا ہے اور اس طرح ایمان واخلاق اور قانون کو ایک مسلسل غیر منقطع رشتے میں پرو دیتا ہے، اسی طرح قرآن نے خالص مذہبی، اخلاقی، قانونی، عدالتی، فوجداری، دیوانی، غرض کہ سارے معاملات کے بارے میں خدا اور رسول کے حکم کے آگے غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ کیا ہے۔ خود قرآن رسول کریم ؐ کے ہر فیصلے کو چاہے اس کا دائرہ کار کچھ بھی ہو، آخری اور ناقابل مرافعہ حیثیت دیتا ہے۔ قرآن کریم کا سرسری مطالعہ بھی یہ واضح کر دیتا ہے، کہ قرآن انسان کے دل ودماغ میں یہ جذبہ اور فکر پیدا کرنا چاہتا ہے کہ ہر معاملے میں خدا اور رسول کی طرف رجوع کیا جائے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ قانون جو انسان کے خارجی اعمال وافعال کی ضابطہ بندی ہی کا دوسرا نام ہے، وہ قرآن کے دائرہ عمل سے باہر رہے، علاوہ بریں شاخت نے اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیا کہ اسلامی قانون کی ابتدا اموی دور سے یعنی ۱۰۰ھ ہجری سے کرنے کے نتیجہ میں اس نے ایک ایسا معاشرتی قانونی خلا پیدا کیا جسے وہ کسی طرح سے پُر نہیں کر سکتا، یہ تصور کہ پوری ایک صدی تک اسلامی معاشرہ بغیر کسی قانون کے رہا، ایک ایسا عجیب وغریب نظریہ ہے کہ اسے کسی درجے میں تسلیم کرنا ممکن نہیں، پورے سو سال تک قانون یعنی اسلام کے پیروؤں کے خارجی اعمال وافعال کی ضابطہ بندی کے لئے کوئی چیز موجود نہیں تھی، سوائے عرف وعادۃ

اور رسم ورواج کے ایک ایسی بات ہے جسے کہنے اور ماننے کے لئے بڑی دیدہ دلیری اور واقعات و حالات سے نگاہیں چرانے کی جرأت کی ضرورت ہے، شاخت کا دعویٰ دراصل یہ ہے کہ ان سو سال کے دوران اسلامی معاشرے نے قانونی ماخذ کے طور پر نہ تو قرآن کو در خور اعتنا سمجھا نہ حدیث کو بلکہ قانونی ماخذ کے طور پر وہ ان رسم ورواج عرف و عادۃ کو جو قبل اسلام کے جاہلی معاشرے کی باقیات تھیں، نیز خلافت اسلامیہ سے ملحقہ ملکوں اور قوموں کے رسم ورواج کو قانونی ماخذ کے طور پر استعمال کرتے رہے، یہ دعویٰ کس حد تک واقعات کے مطابق ہے اور کہاں تک اہل بصیرت کے نزدیک قابل قبول، خود ارباب فکر اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں، یہ سمجھنا اور سمجھانے کی کوشش کرنا کہ سو سال کا یہ زمانہ جو انسانی تاریخ کا سب سے زیادہ انقلابی، نتائج خیز، فکر انگیز اور تغیر و تبدل سے لبریز دور ہے، ہمارے پیش آنے والے چیلنجوں کا جواب قانونی سطح پر دور جاہلیت اور ملحقہ ملکوں کے رسم ورواج کے ذریعے دیتا رہا، دیوانے کا خواب نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے، استعیذ اللہ مما یفترون

یہودیت اس بے جگری کے ساتھ شاید ہی کبھی اس سے پہلے اسلام کے قلب و جگر پر حملہ آور ہوئی ہو، ہماری بے بسی اور بے حسی یہ ہے کہ ہم اسلامی قانون کی تاریخ پڑھنے اور سمجھنے کے لئے آج بھی اعدائے اسلام کی کج فکریوں کے محتاج ہیں ہمارے پاس آج بھی فقہ اسلامی کے اولیں دور کو سمجھنے کے لئے مسلمان اہل قلم کی معیاری علمی تحریریں موجود نہیں، کیا اس فکری تہی دستی کو دور کرنے کے لئے دار المصنفین جیسا وقیع ادارہ کچھ کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے،

مستشرقین اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

از

ڈاکٹر عماد الدین خلیل ، موصل یونیورسٹی ، عراق

مترجمہ :۔ حافظ محمد عمیر الصدیق دریا بادی ندوی ، رفیق دار المصنفین

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق مستشرقین کے موقف کی تشکیل ایک ایسے دینی دائرہ کے اندر ہوتی ہے جہیں قومی تعصب، ذہنی تشنج، بغض و کینہ اور نفرت و کدورت کی کار فرمائی ہوتی ہے۔ اور ان کی ارادی و غیر ارادی دونوں طرح کی جہالت اس کا احاطہ کئے ہوتی ہے، اسی لئے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شخصیت اور عام لوگوں کے درمیان ناقابل عبور گھاٹیاں اور تہ بہ تہ تاریکیاں حائل ہوگئیں۔ خود رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق مستشرقین کی بحث و تحقیق اور ان کا مطالعہ و تجزیہ نہ معروضی و موضوعی ہے اور نہ تاریخی و علمی، بلکہ وہ سب و شتم کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جس میں کلیسا کی دینی اور تقدس مآب شخصیتوں کے ساتھ غیر دینی اور لا مذہبی افراد بھی برابر حصہ لیتے رہے ہیں، اور یہ سیلاب بلا خیز آج تک رواں ہے۔

مستشرقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو کچھ ہرزہ سرائی کی ہے، اسے بطور استشہاد پیش کرنے کے لئے بھی طبیعت آمادہ نہیں ہوتی ہے، اور قلم میں لرزش پیدا ہوجاتی ہے، مگر نقلِ کفر کفر نہ باشد کے بموجب ان کے بعض ہفوات نقل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا، یہ خیالات دورِ جدید کے مستشرقین کے ہیں، جن میں سے بعض ابھی بقید حیات بھی ہیں، ایک مستشرق مونسیور کولی اپنی کتاب "البحثُ عنِ الدّینِ الحقّ" میں لکھتے ہیں :

"مشرق میں ایک نئے دشمنِ اسلام کا ظہور ہوا جس کی بنیاد ادنیٰ طاقت اور شدید تعصب پر قائم ہے" محمدؐ نے اپنے پیرووں کے ہاتھوں میں تلوار دے کر اخلاق کے مقدس ترین ضابطے پامال کر ڈالے، اور اپنے ساتھیوں کو فسق و فجور اور لوٹ کھسوٹ کی اجازت دیدی، لڑائیوں میں قتل ہوجانے والوں سے وعدہ کیا کہ وہ جنت کی دائمی لذتوں سے لطف اندوز ہوں گے، چنانچہ تھوڑی ہی عرصہ میں ان کے متبعین نے ایشیائے کوچک، افریقہ اور اسپین کو اپنا شکار بنالیا، ان کی وجہ سے اٹلی کو خطرہ درپیش ہوا، آدھا فرانس بھی ان

ان لوگوں ہاتھوں برباد ہوگیا، اور تہذیب و تمدن پر سخت افتاد آئی، یہ عیسائیت تھی جس نے اسلام کی فاتحانہ پیش قدمی پر روک لگائی، اور تقریباً دو سو برس تک صلیبی جنگیں ہوتی رہیں، جن کے نتیجہ میں یورپ میں اسلحے عام ہوئے، تب عیسائیت کو نجات ملی، اور صلیبی جھنڈے کے سامنے ہلالی پرچم سرنگوں ہوا، اور انجیل نے قرآن اور اس کے معمولی اور گھٹیا قوانین اخلاق پر فتح حاصل کی،

ایک اور مستشرق سیوکیوں اپنی کتاب میتھالوجی آف اسلام میں لکھتے ہیں :-

"دین محمدیؐ، جذام کی بیماری کی طرح لوگوں میں پھیلا، اور اس نے ان کی دھجیاں بکھیر دیں سی نہیں، بلکہ وہ ایک خوفناک مرض اور ایسا پاگل پن ہے، جو انسان کو انتہائی کمزوری اور سستی پر آمادہ کرتا ہے، اور اگر بیدار بھی کرتا ہے، تو صرف خوں ریزی، شراب خوری اور دوسری ساری برائیوں کے لئے، مکہ میں (؟) محمدؐ کی قبر بجلی کا ایسا ستون ہے، جو مسلمانوں کے سروں میں جنونی کیفیت پیدا کردیتا ہے، اور انھیں ہذیان، ہسٹریا، عقل فراموشی اور اللہ اللہ کے الفاظ کی رٹ لگانے پر مجبور کردیتا ہے، اور جو چیزیں اصل فطرت کو مرغوب ہیں، ان سے نفرت کا خوگر بناتا ہے، مثلاً لحم خنزیر، شراب اور موسیقی وغیرہ اور ان میں سنگدلی اور فسق و فجور کے جذبات و خیالات کی پرورش کرتا ہے؟

مستشرق جو بلیان اپنی کتاب تاریخ فرانس میں لکھتے ہیں

"محمدؐ مسلمانوں کے مذہب کے بانی ہیں، انھوں نے اپنے متبعین کو حکم دیا کہ وہ دنیا کو زیر کریں، اور سارے مذاہب کو تبدیل کرکے اپنے مذہب کا بول بالا کریں، ان بت پرستوں (مسلمانوں) اور عیسائیوں میں کتنا بڑا فرق ہے، عربوں نے اپنے مذہب کو طاقت سے لوگوں پر مسلط کیا، اور لوگوں سے کہا کہ اسلام لاؤ ورنہ موت کے لئے تیار ہوجاؤ، جبکہ مسیح کے ماننے والوں نے اپنی نیکی اور حسن سلوک سے لوگوں کو راحت بخشی، اگر یہ عرب ہم پر فتح یاب ہوجاتے، تو خدا جانے دنیا کی کیا حالت ہوتی، آج ہم بھی الجزائری اور مراکشی مسلمانوں جیسے ہوتے"

ڈاکٹر گلوور نے اپنی کتاب "تقدم التبشیر العالمی" (عالمی مشنریوں کی ترقی) میں، جو ۱۹۶۰ء میں نیویارک سے شائع ہوئی ہے، ان خیالات کا اظہار کیا ہے :-

"محمدؐ کی تلوار اور قرآن، یہ دونوں تہذیب، حریت اور حق کے سب سے بڑے دشمن ہیں، اور دنیا پر آج تک جو تباہی و بربادی منڈلا رہی ہے، اس کے سب سے بڑے باعث یہی ہیں، جس طرح قرآن، حقائق و خرافات اور قوانین اور دیومالائی تصورات کا عجیب و غریب مجموعہ ہے، اسی طرح تاریخی غلطیوں اور باطل خیالات کی بھی آمیزش ہے، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ نہایت پیچیدہ ہے، اس کی کسی خاص تفسیر کے بغیر اسے کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا، مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ ان کا معبود وہ اللہ ہے جو تنہا ہے، بے نیاز ہے، اس کا نہ کوئی باپ ہے، اور نہ بیٹا، گویا اللہ ایسا ظالم و جابر ہے، جس کو اپنی مخلوق و رعایا سے کوئی تعلق نہیں، حالانکہ اسلام ان دونوں کے ربط و تعلق کا ذکر کرتا ہے، محمدؐ ایک آمر مطلق تھے، ان کا خیال تھا کہ قوم پر بادشاہ کا تو یہ حق ہے کہ وہ اس کی مرضی پر چلے، مگر بادشاہ جو چاہے من مانی کرے، خود محمدؐ کی فطرت میں بھی یہ بات داخل تھی، چنانچہ جو ان کی مرضی پر چلے وہ اسے قابل گردن زدنی سمجھتے تھے، ان کا عربی لشکر تباہی و بربادی اور غلبہ و تسلط کا پیاسا تھا، جس کو اس کے پیغمبر نے ہدایت بھی یہی دی تھی کہ جو ان کی اتباع کو نامنظور کرے، اور ان کے راستہ سے دور ہو جائے اسے قتل کر دیں"

مستشرق سفاری نے ۱۷۵۲ء میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا تھا، ان کا خیال ہے کہ:

"محمدؐ نے اقتدار الٰہی کا اسی لئے سہارا لیا، تاکہ لوگ اس عقیدہ کو (آسانی سے) قبول کریں، پھر انھوں نے خود بحیثیت رسول اللہ کے ایمان لانے کا مطالبہ کیا، حالانکہ یہ اعتقاد محض ایک فریب تھا، جس کو عقلی ضرورت نے جنم دیا تھا....."

اس کج بحثی اور یاوہ گوئی نے دراصل اسلام اور صلیبیت کے درمیان خلیج حائل کر دی اور دونوں میں ایسی شدید کشمکش پیدا کر دی، جس کے نتیجہ میں صلیبی جنگوں کے تلخ و تند گھونٹ آج تک یورپ کے حلق سے نیچے نہیں اترے، اور نہ ہی وہ اس تلخی کو فراموش کر سکا ہے، نو مسلم محمد اسد (سابق لیوپولڈ ویس) ایک تلخ تجربہ کی طرح یہ حقیقت بیان کر چکے ہیں، کہ اسلام سے متعلق، یورپ کو ورثہ میں جو حقارت کے جذبات ملے وہ غیر عقلی تعصب کی صورت میں ان کی علمی بحثوں میں ظاہر ہو رہے ہیں، اور تاریخ نے یورپ اور عالم اسلام کے درمیان صلیبی جنگوں کے زمانہ

سے جو خلیج پیدا کی، اس پر کوئی پُل نہیں بن سکا، اور نہ صرف یہ کہ باقی ہے، بلکہ اسلام کی تحقیر و تذلیل یورپ کے طرز فکر کا بنیادی حصہ بن چکی ہے، درحقیقت یورپ کے اولین مستشرقین نے موجودہ دور میں عیسائی مشنریوں کا رنگ روپ اختیار کر لیا ہے جن کی ریشہ دوانیاں عالم اسلام میں جاری ہیں، ان لوگوں نے اسلامی تعلیمات اور اسلامی تاریخ کی ایسی مسخ اور بگڑی ہوئی تصویر پیش کی ہے، کہ وہ یورپ کے عیسائیوں کو ایک بُت پرست مذہب نظر آتا ہے، گو بعد میں علوم استشراق، مشنریوں کے اثر سے آزاد ہو گئے، اس لئے ان پر جانبداری اور غیر عقلی رویہ اختیار کرنے اور مذہبی حمیت اور تعصب سے کام لینے کا الزام بھی نہیں عائد کیا جا سکتا، تاہم مستشرقین کو اسلام دشمنی ورثہ میں ملی ہے، اور وہ ان کی گھٹی میں داخل ہے، اس کا سبب صرف صلیبی جنگیں ہی نہیں، خود اسلام ہے، جو ان کی نظر میں سب سے بڑا خطرہ ہے، جیسا کہ لارنس براؤن نے اپنی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ اسلام کے اندر جو وسعت اور اپنی بات کو منوانے کی جو طاقت نیز حرکت و حرارت اور توانائی پوشیدہ ہے، اس کی وجہ سے وہ یورپ کے سامراج کی راہ میں تنہا دیوار اور رکاوٹ ہے، اسی قسم کے خیالات کا اظہار دی مسلم ورلڈ مطبوعہ سنہ ۱۹۳۰ء کے ایک مضمون میں کیا گیا ہے:

"مغرب کی دنیا پر جو خوف، دہشت کا طاری ہونا ضروری ہے جس کے چند اسباب ہیں، اسلام کا جب سے مکہ میں ظہور ہوا، وہ عددی لحاظ سے کبھی کمزور نہیں رہا، بلکہ ہمیشہ بڑھتا اور پھیلتا رہا، اور اسلام صرف ایک مذہب ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے بنیادی ارکان میں جہاد بھی شامل ہے، ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا کہ کچھ لوگ اسلام میں داخل ہونے کے بعد دوبارہ عیسائی ہو گئے ہوں"

جرمن مستشرق بیکر نے صراحت کے ساتھ کہا کہ:-

"عیسائیت کی اسلام دشمنی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسلام جب قرونِ وسطیٰ میں پھیلا تو وہ عیسائیت کے فروغ کی راہ میں ایک طاقتور پشتہ بن گیا، اور ان ملکوں پر بھی حاوی ہو گیا، جو عیسائیت کے زیر نگیں تھے"

ایسے پُر از تعصب ماحول اور کلیسائی طرز فکر کے ہوتے ہوئے کس کو اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل روح و حقیقت کو سمجھنے سے دلچسپی اور رغبت ہو سکتی تھی، یورپ میں مذہبی اصلاح اور روشنی و بیداری کے زمانہ میں دین کو سیاست سے جدا کر دیا گیا، یہاں تک کہ بیسویں صدی آگئی، لیکن اسلام اور خصوصاً سیرت نبویؐ کے بارہ میں عیسائیت کے طرز فکر میں شمہ برابر تبدیلی نہیں ہوئی، بلکہ اس تعصب پر مبنی طرز فکر کی تقویت کے لئے اسٹیج تیار ہوتے رہے، اور

اسلامیات کے تجزیہ اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مطالعہ کے لئے نسلوں کی نسلیں ان اسٹیجوں پر اپنی اداکاری کا مظاہرہ کرتی رہیں، اسی قسم کے لوگ مستشرقین کے نام سے مشہور ہیں، ان میں سے بعض تو خالص کلیسا کے آدمی تھے جو پادریوں کے لباس میں ملبوس تھے، لیکن ان کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے، جن کو کلیسا سے کوئی سروکاری تعلق اور واسطہ نہیں تھا، ان سے یہ توقع ضرور تھی کہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ان کے حملوں میں نرمی ہوگی، اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شخصیت اور کارناموں سے متعلق ان کا گذشتہ موقف اور نظریہ بدلا ہوا ہوگا، اور ایک حد تک ایسا ہوا بھی چنانچہ لب ولہجہ اور سبّ وشتم میں کچھ شائستگی آگئی، لیکن طرزِ فکر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، سیرت نبویؐ سے ناواقفیت اور اس کے مباحث میں تعصب کی کارفرمائیاں بدستور جاری رہیں، بے سروپا تعلیل وتجزیہ کی مشقیں ہوتی رہیں، دانستہ غلط فہمیوں کی تکرار ہوتی رہی، یہاں تک کہ جو محض وہم وخیال، تعصب اور تنگ نظری کی پیداوار تھا، اور جس کی بنیاد مستند واقعات کے بجائے شاذ اور غیر مستند روایات پر تھی، وہ لوگوں کی نگاہ میں یقین، اعتماد اور اعتبار کے درجہ تک پہنچ گیا۔ طرزِ فکر، اندازِ بحث اور طریقۂ تحقیق میں مستشرقین نے جو بنیادی غلطیاں کی ہیں، ان میں سے کچھ کی ذیل نشاندہی کی جاتی ہے، اور اسی ضمن میں اس قبیل کی بعض اور غلطیوں کی جانب ہم اشارہ کریں گے،

پہلی بات تو یہ ہے کہ بعض اوقات مستشرقین ضعیف روایات کو لے کر انہی کی بنیاد پر اپنا فیصلہ صادر کردیتے رہیں، اور ان کی تقویت کے لئے شاذ وغریب حدیث کو پیش کرتے ہیں، اور اسے مشہور ومستند روایت پر ترجیح دیدیتے ہیں، خواہ وہ نقد وجرح کی کسوٹی پر کتنی ہی کھوٹی کیوں نہ ثابت ہو، یہ لوگ ایسا قصداً اس لئے کرتے ہیں کہ یہی وہ واحد حربہ ہے جس سے وہ شکوک وشبہات کو ہوا دیتے رہیں،

دوسرے یہ کہ سیرت نبویؐ کے واقعات اور کارناموں کو وہ عیسائی یا یہودی اصولوں کی دین سمجھتے ہیں، مستشرقین کی بڑی تعداد نصرانی اور مسیحی ہے، اس لئے وہ اسلام کے محاسن کا اصل سہرا عیسائیت کے سر باندھتے ہیں، اور جو مستشرقین یہودی ہیں وہ اسرائیل کے قیام اور صیہونیت کے تسلط کے بعد خاص طور پر اس بات کی کوشش کرتے ہیں، کہ ہر عربی اور اسلامی چیز کا سرا یہودیت سے ملا دیں، درحقیقت اس باب میں دونوں گروہ اپنے میلانات وخواہشات کے تابع ہیں، مثلاً برطانوی مستشرق مانٹگمری واٹ کہتے ہیں کہ "اپنے گھر والوں کے ساتھ یا ان کے بغیر محمدؐ کی غار حرا میں آمد ورفت کوئی ناممکن بات نہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ موسم گرما میں شہر مکہ کی سخت گرمی کی وجہ سے جو لوگ طائف نہیں جاسکتے تھے، وہ غار حرا میں

پہلے جاتے رہے ہوں گے ہوسکتا ہے کہ وہ یہودی اور عیسائی خصوصاً راہبوں کے اثر کی وجہ سے وہاں گئے ہوں، یا ہوسکتا ہے کہ خود محمدؐ کے ذاتی تجربہ نے ان میں بقائے دوام اور حیاتِ جاودانی کی آرزو، اُمنگ اور رغبت پیدا کی ہو، یہی مستشرق دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ناموس کا لفظ یونانی لفظ (Momos) سے مشتق ہے، جس کے معنیٰ شریعت یا کتب مقدسہ کے ہیں، موسیٰؑ کے ذکر میں بھی یہ لفظ ملتا ہے، اور ورقہ بن نوفل نے جب محمدؐ پر وحی کی کیفیت دیکھی تو اسی ناموس کے لفظ سے اس کو تعبیر کیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ محمدؐ پر جو کچھ نازل ہوا وہ یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس کتابوں کے مشابہ و مماثل ہے، مگر محمدؐ کو یہ وہم تھا کہ وہ ایک قوم کے بانی اور اس کے شارع ہیں، اور جیسا کہ ابتداء میں ہوتا ہے، محمدؐ شروع میں طبعی طور سے متردد تھے، اس وقت ورقہ بن نوفل کی حوصلہ افزائی، محمدؐ کی داخلی کیفیات کے لئے اہم چیز ثابت ہوئی، اسی کے بعد کی اسلامی تعلیمات، ورقہ بن نوفل کے افکار سے بہت زیادہ متاثر نظر آتی ہیں"۔

اسلام پر پہلی نظر ڈالنے ہی سے یہ شبہہ رفع ہو جاتا ہے، اور معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں اور عیسائیت میں کوئی بہت مشابہت نہیں ہے، لیکن اور گہری نظر سے دیکھا جائے تو دونوں کے بنیادی اختلافات بھی سامنے آجاتے ہیں، یہی حقیقت تھی جس نے ماضی میں مشنریوں کے مبلغوں کو بھڑکا دیا تھا، حال ہی میں پن گوئن سیریز کی ایک کتاب میں ایک پادری مستشرق نے ایسے کئی موازنے کئے ہیں، جن میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام اصلاً مسیحیت کی مسخ شدہ یا ناپختہ صورت ہے، مشہور مستشرق کانٹ ویل اسمتھ نے بھی اسلام اور مسیحیت میں یکسانی اور مشابہت کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کی ایک دوسرے سے نفرت اور دوری کی ایک وجہ یہ بھی ہے، کہ دونوں فریقوں نے ایک دوسرے کے عقائد کو سمجھنے میں غلطی سے کام لیا ہے، ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کے عقیدہ کو بھی اسی صورت میں پیش کرنے اور ڈھالنے کی کوشش کی جس صورت میں وہ خود اس عقیدہ پر ایمان رکھتا ہے، لیکن بہت سے دوسرے خیالات کی طرح یہ رائے بھی منصفانہ نہیں ہے، کیونکہ تنہا عیسائی ہی صدیوں سے اسلام کو سمجھنے بلکہ غلط سمجھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، ان کی یہ کوشش، عیسائی اصطلاحات کے ذریعہ سے ہوتی رہی ہے، اس کا انجام ظاہر ہے کہ سوءِ فہمی اور بدعقیدگی کے علاوہ کیا ہوسکتا تھا، دوسری جانب مسلمانوں کا بنیادی زاویہ نگاہ ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہا کیونکہ یہ نقطۂ نظر قرآن کا عطا کردہ تھا۔ اسی لئے کسی مسلمان نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ وہ عیسائیت کو کسی اور فریم میں اُتارے، لیکن ایک عیسائی اپنی مقدس کتابوں میں ایسی صراحت نہیں پاتا ہے جو اس کو اسلام کے بارہ میں ایک مسلمان کے اعتقاد و نقطۂ نظر

کو قبول کرنے سے روک دے، اس کے باوجود وہ نہ صرف عیسائیت کے بارہ میں مسلمانوں کے اعتقاد کو رد کرتا ہے،
بلکہ اسلام سے متعلق اس کی رائے کو بھی رد کرتا ہے۔ اور دونوں رایوں کو تبدیل کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھتا،
یہ پرانے عیسائی مبلغ (کانٹ ویل اسمتھ) اپنے قارئین کی ذہانت کا شاید احترام بھی نہیں کرتے، چنانچہ اپنے ایک
مقالہ کے مقدمہ میں علی الاعلان و[illegible] کرتے ہیں کہ اپنے معروضی اور خالص موضوعی مطالعہ کے بعد وہ صحیح
معلومات پیش کر رہے ہیں، تاکہ انھیں [illegible] اور محقق تسلیم کیا جائے، لیکن ان سب کے باوجود دوران بحث میں بڑے
یقین کے ساتھ لکھتے ہیں کہ اب کسی طور پر بھی اس حقیقت میں شک کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ محمدؐ نے یہودیوں کی کتاب
تلمود اور دوسرے بعض تحریف شدہ صحیفوں کے افکار کو پیش کیا ہے، اور مسیحیت کی نسبت و تعلق سے تو اس کا قوی احتمال
ہے کہ محمدؐ کی وحی میں اس سے مدد لی گئی ہے، معروضی و موضوعی مطالعہ کا دعویٰ کرنے والے ان مستشرق کی یہ شاعرانہ خیال
آرائی بھی لائق توجہ ہے، جو مقالہ کے آخر میں درج ہے کہ دنیا والوں کو غور کرنا چاہئے کہ اس وقت کیا صورت پیش آئے گی،
جب لاکھوں مسلمانوں کے سامنے زندہ مسیح کی انجیل کو مناسب طور پر پیش کیا جائے گا۔

تیسری غلطی یہ ہے کہ یہ مستشرقین، اپنے مطالعہ میں معکوس طریقہ و نہج اختیار کرتے ہیں، اور نتائج کے استنباط میں بجائے
عقل کے ذوق پر اعتماد کرتے ہیں، ڈاکٹر جواد علی نے لکھا ہے کہ اولین اکابر مستشرقین میں کیتانی اس طرز کے نمایاں نمائندہ
تھے، اور آج تاریخ اسلام کے نئے ماہرین، انہی کے نقش قدم پر گامزن ہیں، یہ لوگ بنیادی طور پر ایک غلط فکر کو مدنظر
رکھ کر اپنا مطالعہ شروع کرتے ہیں، پہلے سے رائے قائم کرتے ہیں، اور پھر واقعات میں ایسی چیزوں کو تلاش کرتے ہیں،
جو ان کی رایوں کی کسی بھی درجہ میں تائید کرتی ہوں، باقی باتوں کو وہ خارج از بحث قرار دیتے ہیں، کیتانی ذی رائے اور
صاحب فکر تھے، انھوں نے سیرت نبویؐ کی تدوین سے پہلے ہی اس کے متعلق کچھ مخصوص خیالات قائم کرلئے تھے، چنانچہ جب
انھوں نے سیرت سازی شروع کی، تو رطب و یابس ہر قسم کی روایتوں پر اعتماد کر لیا، اور ان روایتوں کو خاص طور پر قبول کیا
جن سے ان کے موقف کی تائید ہوتی تھی، اور ان کے ضعف یا قبح کی کوئی پرواہ نہ کی، بلکہ انھیں دلیل بنالیا، اور پھر انہی کے مطابق
اپنا فیصلہ بھی صادر کر دیا، حالانکہ یقین ہے کہ وہ علمائے فن کے نزدیک وضعی اور جھوٹی روایات کے مشہور طرق و سلاسل سے
واقف رہے ہوں گے، لیکن وہ علماء کے اقوال و آراء سے چشم پوشی کر گئے، وجہ ظاہر ہے کہ وہ صاحب فکر تھے، انھیں اپنے
خیال کو ثابت کرنا تھا، خواہ جس طریقہ سے بھی یہ ممکن ہو، اگر وہ جدید طرز و اسلوب کے مطابق نقد و جرح سے کام لیتے اور

غلط روایات کو رد کرتے، تو پھر "سیرت سازی" کا کارنامہ کیسے انجام دیتے، نو مسلم مستشرق ایتن ڈینیہ اپنی کتاب "الشرق کما یراہ الغرب" (مستشرق مغرب کی نظر میں) میں اس طرز و نہج کے متعلق بعض باتیں خوب لکھ گئے ہیں، فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر اسنوک میر گورنج کی یہ رائے درست ہے، کہ "محمدؐ کی جدید سیرت سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اگر آپ کسی نظریہ یا کسی رائے کے متعلق تمسخر کا رویہ اختیار کرتے ہیں، تو گویا تاریخی مباحث کے بانجھ اور بے جان ہونے کا اعلان کر رہے ہیں" اس حقیقت کو موجودہ مستشرقین کو بھی اپنے پیش نظر رکھنا بہتر ہو گا، کیونکہ اس سے انھیں اُن پرانے امراض سے چھٹکارا ملے گا، جنکی وجہ سے ان کو مقدور سے زیادہ محنت و زحمت کرنی پڑتی ہے، اور بلاشک و شبہہ غلط نتائج تک جا پہنچتے ہیں، اور لامحالہ انھیں اس کی ضرورت پیش آتی ہے، کہ وہ اپنے کسی خیال کی تائید کے لئے بعض روایتوں کو باطل قرار دے کر ان کی جگہ دوسری روایتوں کو گھڑ کر پیش کریں، اور یہ ظاہر ہے کہ بڑا مشکل کام ہے، بیسویں صدی میں ایک عالم کے لئے صرف اسی صلاحیت کا ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کو زمانہ، ماحول، مقام، رسوم اور ضروریات، رجحان اور میلانات جیسے بنیادی عوامل کی معرفت بھی ضروری ہے، اور اس سے بھی بڑھ کر ان باطنی عوامل کا شعور بھی لازمی ہے، جو عقل و قیاس کے پیمانوں سے پرے ہیں اور جو افراد و جماعت میں بہرحال اپنی تاثیر رکھتے ہیں، ماشگری واٹ نے فرانسیسی مستشرق لامانس پر اسی قسم کے الزامات عائد کئے ہیں، جن کے مرتکب اکثر مستشرقین ہوئے ہیں، کہ وہ کج اسلوب ہیں، اور معکوس طریقہ اختیار کرتے ہیں، ان کا مطالعہ ہی غلط ہے، خاص طور پر تاریخی واقعات سے اپنی ذاتی رایوں کو یہ لوگ جس طرح مدلل کرتے ہیں، وہ مطالعہ و تجزیہ کے نام پر ایک بدنما داغ ہے، افسوس ہوتا ہے کہ لامانس جیسے مستشرق، دلائل کو اکثر و بیشتر غلط رُخ دیدیتے ہیں، ان کا یہ قطعاً علمی نہیں ہے، معروضیت و موضوعیت کی پرواہ کئے بغیر وہ اپنے خاص معتقدات و افکار کی تائید میں ایک خیال کو چھوڑ کر دوسرا خیال اپنا لیتے ہیں، مثلاً ایک عبارت میں "الاحابیش وعبید اھل مکۃ" کا جملہ ہے، اس میں واؤ تفسیری ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ احابیش عبید مکہ کے ضمن میں شامل ہیں، ایک اور عبارت میں ہے "الاحابیش ومن اطاعھم من القریشیین من قبائل کنانۃ وتھامۃ" یہاں پر واؤ تمیز تام پر دلالت کر رہا ہے، لیکن لامانس نے اس عام نحوی قاعدہ کے برخلاف، اس عبارت کی تشریح اپنے خیال کے مطابق کی، اپنی پسند اور مرضی کے مطابق تاریخی واقعات کی تفسیر اور ان سے استنباط کی سینکڑوں مثالیں ان مستشرقین کی کتابوں میں موجود ہیں، مثلاً برو کلمان نے غزوۂ احزاب کے سلسلہ میں کہیں اس کی جانب اشارہ بھی نہیں کیا کہ مدینہ پر عرب کے قبائل کو حملہ کرنے کے لئے اکسانے میں یہود کا حصہ تھا، اور

نہ یہ ذکر کیا کہ آزمائش اور امتحان کی سخت ترین گھڑی میں بنو قریظہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے معاہدہ کو توڑ دیا تھا، بلکہ وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ پھر مسلمانوں نے بنو قریظہ پر حملہ کر دیا جن کا رویہ بہر حال خاموش و پوشیدہ تھا مستشرق اسرائیل ولفن سون نے غزوۂ خندق میں نعیم بن مسعود کے واقعہ سے چشم پوشی کرکے صرف یہ لکھا ہے کہ یہ واقعہ مشرکین اور یہود کے درمیان عدم اعتماد کی وجہ سے پیش آیا، اس طرح وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہودیوں کے لئے دھوکہ دینا ممکن ہی نہیں تھا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ مستشرقین، اسلام دشمن عناصر پر بڑے مہربان ہوتے ہیں، خصوصاً یہودیوں کے لئے وہ اپنے دل میں بڑا نرم گوشہ رکھتے ہیں، اسرائیل ولفن سون بنو نضیر کے یہود پر مسلمانوں کے حملے کے سلسلہ میں اس کی جانب تو اشارہ کرتے ہیں کہ مؤرخین عرب کے نزدیک مسلمانوں کے حملہ کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قاتلانہ حملہ کی سازش کی تھی، لیکن وہ کہتے ہیں، کہ مستشرقین اس روایت کی صحت کو قبول نہیں کرتے، ان کی دلیل یہ ہے کہ سورۂ حشر میں جو بنو نضیر کی جلاوطنی کے بعد نازل ہوئی تھی انہیں اس سازش کا ذکر نہیں ہے، وہ جوش میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہر چشم بینا رکھنے والا یہ سمجھ سکتا ہے، کہ بھلا ایسے حالات میں یہود کب یہ سازش کر سکتے تھے، اور اگر ان کو یہ سازش کرنی بھی ہوتی، تو وہ بجائے اس کے کہ آپؐ پر دیوار سے بھاری پتھر پھینکتے، آپؐ کو اچانک گھات میں پاکر قتل کر دیتے، اسرائیل ولفنسون شاید یہودیوں کی نفسیات سے واقف نہیں، کہ یہ وہ قوم ہے جو آخر وقت تک کسی بھی وقت براہ راست تصادم سے بچتی رہتی ہے، بر دکلمان لکھتے ہیں، کہ مشرکین پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باقاعدہ حملہ اور لشکر کشی کی راہ میں بعض دقتیں اور رکاوٹیں تھیں، قدیم عربی شرافت فکر مہاجرین کو اپنے قریشی بھائیوں سے جنگ کرنے سے روکتی تھی، مدینہ والے، اپنے طاقتور پڑوسیوں سے صلح دامن کی فضا کو غبار آلودہ کرنا نہیں چاہتے تھے، آخر کار رجب کا مہینہ آیا تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خفیہ احکام کے ساتھ ایک فوجی دستہ کو روانہ کیا، جس نے ایک تجارتی قافلہ پر اچانک حملہ کیا، اور کافی مال غنیمت کے ساتھ مدینہ واپس ہوا اس قدیم ضابطۂ اخلاق کی قانون شکنی نے خود مدینہ میں نفرت کے جذبات بھڑکا دیئے تھے، مگر محمدؐ نے اپنے پیروؤں کے عمل پر محض ہلکی سی نکیر کی اور کہا کہ ان لوگوں سے ان کا حکم سمجھنے میں سہو ہو گیا ہے، گو کہ ان لوگوں نے محمدؐ ہی کی خواہش کے مطابق عمل کیا تھا، بر دکلمان ایک جگہ لکھتے ہیں کہ محمدؐ کا عہد ابھی زیادہ نہیں گذرا تھا کہ ان کے اور احبار یہود کے درمیان نزاع شروع ہو گئی، واقعہ یہ ہے کہ محمدؐ دور دراز علاقہ میں، اپنے محدود علم کے باوجود یہودی علماء، علم وادراک میں نبی امیؐ سے

بڑھ کر تھے"، ایک جگہ لکھتے ہیں کہ محمدؐ کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اپنی فوج کی گرتی ہوئی ساکھ کو کسی دوسری صورت سے بحال کریں، چنانچہ غزوۂ احد کی شکست کے بعد ایک معمولی سی بات پر انھوں نے بنو نضیر پر حملہ کر دیا، مستشرق ول ہاوزن لکھتے ہیں کہ غزوۂ بدر کے بعد اسلام اپنی رواداری کی پالیسی پر قائم نہیں رہ سکا، بلکہ اس نے مدینہ کے اندر رعب اور دہشت کی سیاست شروع کر دی، منافقین کے مسئلہ کو ابھارنا اسی تبدیلی کی علامت ہے، اور یہودیوں کو ظاہر کیا گیا کہ وہ عہد شکن ہیں، چنانچہ چند ہی برسوں میں سارے یہودیوں کو یا تو جلا وطن کر دیا گیا، یا پھر ان کا خاتمہ کر دیا گیا، اور اس کے لئے چند لایعنی اسباب تلاش کئے گئے، مار گولیوتھ نے یہودیوں سے اپنی محبت کا اظہار یہ کہہ کر کیا کہ خیبر کا سقوط، یہودیوں کے ساتھ سراسر ظلم تھا، جس کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں، محمدؐ نے ہجرت کے بعد، غارت گری اور لوٹ مار کا طریقہ اختیار کیا، مکہ والوں سے تو اس طرزِ عمل کی گنجائش یوں ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں نے محمدؐ کو اپنے شہر سے نکالا تھا، ان کے مال وجائداد پر قبضہ کر لیا تھا، مدینہ کے یہودیوں کے سلسلہ میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے، کہ ان سے محمدؐ کو انتقام لینا تھا، لیکن خیبر والے تو مدینہ سے بہت دور تھے، وہ محمدؐ یا ان کے متعلق کے حق میں کسی جرم دخطا اور ظلم و تعدی کے مرتکب نہیں ہوئے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمدؐ کی سیاست میں کیسی عظیم تبدیلی آگئی تھی، مدینہ میں آنے کے بعد ہی انھوں نے یہ اعلان کیا کہ یہودیوں کے ساتھ ان کا معاملہ مسلمانوں کی طرح ہوگا، لیکن ہجرت کے چھٹے سال میں ان کا یہ موقف سراسر بدل چکا تھا، اور اب محض اتنی ہی بات کسی پر حملہ کرنے کے لئے کافی تھی، کہ وہ غیر مسلم ہے، اس سے محمدؐ کی اس ہوس مال وجاہ کا اندازہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے انھوں نے پے درپے حملے کئے، اسی ہوس میں پہلے سکندر اور بعد میں نپولین بھی سرشار تھا، خیبر پر محمدؐ کا قبضہ اس اندیشہ کا اعلان تھا کہ اسلام امن عالم کے لئے خطرہ بن گیا ہے، مستشرق نولدیکی کو یہ حیرت ہی رہی کہ کاش عرب قبائل نے محمدؐ کے خلاف اپنے معابد اور دینی شعائر کے تحفظ کے لئے ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا ہوتا، تو ان کا جہاد کامیاب نہ ہوتا۔ افسوس! عرب متحد نہیں ہوئے، اور ان کے اختلاف و انتشار نے محمدؐ کو یہ مہلت دی کہ وہ یکے بعد دیگرے ہر قبیلہ کو مطیع کرتے جائیں۔ اور ان پر کبھی طاقت و قوت کے ذریعہ اور کبھی دوستانہ معاہدوں اور پُرامن ذرائع سے غلبہ حاصل کرتے رہیں۔

پانچویں بات یہ کہ ان مستشرقین نے سیرت اور تاریخ ۔ ۔ ۔ ۔ میں شکوک و شبہات پیدا کئے، اور اپنے ذوق وطبیعت اور مرضی سے ان کی نفی کی، یہاں تک کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اسم مبارک میں بھی شکوک پیدا

گئے۔ اور عجب کیا اگر ان کے امکان میں ہوتا تو وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ) کے وجود مبارک میں ہی شک پیدا کردیتے بہرحال سیرت رسولؐ سے متعلق صحیح تاریخ کی نسبت وہ جو چاہیں کہیں، اس حقیقت سے وہ انکار نہیں کرسکتے کہ تمام انبیاء ورسل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سب سے زیادہ واضح اور مفصل ہے۔ ور منگم اس نقطہ پر اظہار خیال کرتے ہیں، کہ واقعی یہ افسوس کی بات ہے کہ بعض بڑے مستشرقین مثلاً میور، مارگولیوتھ، نولدکی، اسپرنگر، ڈوزی، کیتانی، مارسین، گوئیم، گولڈزیہر اور گارڈ فرد وغیرہ نے نقد میں بعض اوقات نہایت غلو سے کام لیا ہے، اور ان کی کتابوں میں خاص طور سے سیرت وکردار کشی کی گئی ہے، رنج کا مقام ہے کہ مستشرقین کا حاصل مطالعہ اور نتیجۂ فکر برابر صلبی رہا ہے، فادر لامانس ممتاز مستشرق ہیں، مگر تعصب میں بھی ممتاز ہیں، اپنی شاندار کتابوں کو انھوں نے اسلام اور نبی اسلامؐ کی دشمنی سے داغدار کردیا، ان عیسائی عالم کے نزدیک حدیث اگر قرآن کے موافق ہے تو گویا وہ قرآن سے منقول ہے، اس لئے وہ کہتے ہیں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب دو دلیلوں کی مطابقت کا اقتضا یہ ہو کہ انھیں رد کردیا جائے، اور ان سے ایک دوسرے کی تائید وتقویت نہ ہو تو تاریخ کی تالیف کیونکر ممکن ہوگی؟ مستشرقین بڑی خوبصورتی سے سیرت کا اصل مصدر قرآن کو بتاتے ہیں، اور پھر سیرت کے ان واقعات کی تردید کرتے ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں، اس طرح صاحب قرآن کی سیرت کو مشکوک کرکے خود بخود قرآن کو بھی مشکوک بنا دیتے ہیں، گویا قرآن صرف ایک تاریخ کی کتاب ہے جس کا خاص مقصد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مفصل سیرت کا استقصا ہے اور قرآن کے علاوہ سیرت کی دوسری روایتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جو فضائل یا حالات بیان ہوئے ہیں، وہ ناقابل قبول ہیں، اسپرنگر کہتے ہیں کہ "محمدؐ کا نام قرآن کی چار سورتوں یعنی آل عمران، احزاب، محمد اور فتح میں آیا ہے، اور یہ ساری سورتیں مدنی ہیں" اس سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں، کہ ہجرت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے محمدؐ کے نام کا استعمال نہیں ہوتا تھا، مدینہ میں انجیل کے اثر اور نصاریٰ سے ربط وضبط کے بعد آپؐ نے اپنے لئے یہ نام بطور اسم علم اپنا لیا" کاش اسپرنگر سے کوئی یہ پوچھے کہ اگر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس نام کو انجیل کے مطالعہ کے بعد اپنایا، تو پھر وہ محمد کہاں ہیں جن کے بارے میں عہدنامہ قدیم وجدید میں بشارتیں موجود ہیں، سیرت سے متعلق شکوک وشبہات پیدا کرنے اور صحیح واقعات کی غیر منصفانہ نفی کے اس طرز ادا کے بارہ میں مانٹگمری واٹ نے ایک اچھی بات کہی، حالانکہ وہ خود اپنے اس اصول پر ہمیشہ عمل پیرا نہیں رہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر واقعی ہماری خواہش یہ ہے کہ محمدؐ سے متعلق ماضی میں جو غلطیاں ہوئی ہیں ان کی

اصلاح اور تصحیح کریں تو ہمارے لئے یہ ضروری ہے، کہ ہم سیرت کے واقعات کو سچ جانیں، سوائے کسی ایسی روایت کے جس کے خلاف کوئی قطعی دلیل موجود ہو، یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ قطعی دلیل کی قبولیت کی شرط یہ ہے، کہ وہ زیادہ سے زیادہ درجہ امکان میں ہو، اور اس قسم کے موضوع میں اس کا حصول دشوار ہے۔

چھٹی بات یہ ہے کہ مستشرقین کی تحریروں میں لامذہبی غیر معیاری اور غیر منطقی طرز استدلال نمایاں ہے، وہ سیرت کے زمانہ کو موجود زمانہ کے معیار کے مطابق جانچتے اور پرکھتے ہیں، اتیین ڈینیہ اس قسم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہ ناممکن ہے کہ تو دشوار ضرور ہے کہ مستشرقین اپنی تحریروں کو اپنے جذبات و رجحانات اور اپنے ماحول اور اس کے اثرات سے بالاتر رکھیں، اسی وجہ سے سیرت نبویؐ اور سیرت صحابہؓ میں انھوں نے انتہائی درجہ تحریف و ترمیم سے کام لیکر اسکی اصل حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے، وہ یہ دعویٰ تو ضرور کرتے ہیں، کہ ان کی تنقید کا اسلوب معروضی تعصب سے پاک ہے' حقیقت پر مبنی اور سنجیدہ وعلمی ہے، لیکن عالم یہ ہے، کہ اگر مؤلف جرمن مستشرق ہے تو محمدؐ جرمن لہجہ میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں اور اگر وہ اطالوی ہے، تو محمدؐ کا طرز بھی اطالوی ہوجاتا ہے، اس طرح مصنف کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت بھی بدلتی رہتی ہے، اگر ان لوگوں کی تحریر کردہ کتب سیرت میں اس کی صحیح تصویر تلاش کی جائے، تو وہ بالکل ہی نظر نہ آئے گی، یہ مستشرقین صرف خیالی تصویریں پیش کرتے ہیں، جو حقیقت سے تمام تر دور رہتی ہیں، والٹر اسکاٹ اور الیکزنڈر ڈیما س نے تاریخی افسانوں میں جن لوگوں کا ذکر کیا ہے، ان کی تصویر اس کے مقابلہ میں حقیقت سے کہیں زیادہ قریب ہے' لیکن ان مستشرقین نے افسانہ نگاروں کو بھی مات کر دیا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کی سیرت نگاری وہ محض اپنی مغربی منطق اور موجودہ تصورات کے مطابق کرتے ہیں، ان کی کتابوں میں جرمن محمد، انگریز محمد اور فرانسیسی محمد ضرور ملتے ہیں، لیکن محمد عربیؐ کا پتہ کہیں نہیں چلتا، یہ اور بات ہے کہ حق کے جویا، محمدؐ کی روشن اور واضح سیرت کو پا ہی لیتے ہیں، اس لامذہبی اور محدود و مقامی طرز استدلال نے اکثر مستشرقین کو دوسری غلطیوں کا مرتکب بنا دیا ہے، اس کی نمایاں مثال وہ ہے، جسے فلہاوزن اور ان کے چند رفقاء نے بیان کیا ہے، تحریک اسلامی مکّہ میں محدود تھی، اور شروع میں مدینہ میں بھی اس کی یہی کیفیت رہی، مگر جب وہاں حالات ساز گار ہوئے تو وہ عالمی مرحلہ میں داخل ہوئی، جس کے بارہ میں اس سے پہلے محمدؐ نے سوچا بھی نہیں ہوگا، اسی طرح یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپؐ مکّی دور میں عدم تشدّد کے قائل تھے، لیکن میں جب انھیں قوت و اقتدار حاصل ہوا، اور

ان کے ارد گرد جنگجو اور لڑائی کرنے والے اکٹھا ہو گئے، تو وہ طاقت اور تشدد کے اصول پر عمل پیرا ہو گئے، فلہاوزن کا خیال ہے کہ محمدؐ کے حلقہ بگوشوں میں وہ لوگ بھی تھے، جن کا ان سے خونی رشتہ نہ تھا، اور ان کا عقیدہ چونکہ خونی رشتہ سے بڑھ کر تھا، اس لئے وہ چاہتے تو تعصب اور تنگ نظری کے اس دائرہ کو ختم کر دیتے، جو خونی رشتہ کا نتیجہ تھا لیکن وہ خونی رشتہ و دائرہ سے ہٹ کر ایک وسیع دینی رشتہ و دائرہ کا تصور نہیں کر سکے، مستشرقین کے اس واہیات نظریہ کی خود سرٹامس آرنلڈ نے تردید کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ تعجب ہے، قرآن کی آیات بینات کے ہوتے ہوئے ہمارے کچھ مورخین نے کیسے یہ دعویٰ کر دیا کہ ابتداءً بانیٔ اسلام نے اسلام کو عالمی دین کی حیثیت سے پیش نہیں کیا تھا، ان غلط کار مورخین میں سر ولیم میور بھی ہیں، جو رسالت محمدی کی آفاقیت کو بعد کی بات بتاتے ہیں، بہت سی آیات و احادیث کے باوجود محمدؐ کو اس کا خیال نہیں ہوا، اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے، کہ انھیں اس کا خیال ہوا تھا، تب بھی یہ بہت مخفی اور پوشیدہ رہا، اور جو ملک ان کے پیش نظر تھا، وہ صرف عرب تھا، کیونکہ یہ دین صرف اسی کے لئے ہی تھا، اور محمدؐ نے اپنی بعثت سے وفات کے وقت تک بجز عربوں کے کسی اور کو اسلام کی دعوت نہیں دی، گو اسلام کی عالمیت کا بیج بو دیا گیا تھا، لیکن اس کی نشو و نما اور اس کے برگ و بار لانے میں منصوبوں اور پروگراموں سے زیادہ حالات و واقعات کو دخل ہے" آرنلڈ نے اس خیال کو باطل قرار دیتے ہوئے لکھا ہے، کہ اسلام کا پیغام صرف عرب تک محدود نہیں رہا، بلکہ اس کا فیض ساری دنیا کے لئے عام تھا، جس طرح اس کے نزدیک صرف ایک ہی معبود ہے، اسی طرح دین بھی ایک ہی ہے، جس کی جانب ساری انسانیت کو دعوت دی گئی، اس بحث میں آرنلڈ کی ہمنوائی میں گولڈزیہر، فولدیکی اور سخاؤ بھی شامل ہیں، جن کا خیال ہے کہ اسلام کا پیغام محض سرزمین عرب تک محدود نہیں تھا، بلکہ خدا کا یہ دین تمام مخلوقات کے لئے ہے، اسکا مقصد یہ ہے کہ ساری انسانیت اس کے سامنے سرنگوں ہو جائے، اور محمدؐ چونکہ اللہ کے رسول تھے، اس لئے ان پر لازم تھا کہ وہ مطالبہ کرتے اور لوگوں کو خدا کی اطاعت قبول کرنے کی دعوت دیتے، اور یہ اعلان، اسلام کے آغاز سے ہی کر دیا گیا تھا، آرنلڈ نے فلہاوزن اور میور وغیرہ کے اس نظریہ کی بھی تردید کی ہے، کہ محمدؐ نے حالات کے تحت قوت و طاقت کا استعمال کیا ہے،، مگر وہ یہ لکھ کر خود بھی غلطی کر گئے ہیں، کہ محمدؐ کی خواہش اور ان کے ایک اندرونی جذبہ نے انھیں ایک نئے دین کی تشکیل کے لئے آمادہ کیا تھا، اور وہ اس راہ میں کامیاب ہوئے، لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے نئے طرز پر ایک جداگانہ سیاسی نظام کی بنیاد بھی رکھی، حالانکہ ابتداءً ان کی یہی خواہش اور

کوشش رہی کہ وہ اپنے ہم وطنوں کو خدا کی وحدانیت کی دعوت دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سیرت نبویؐ کے فہم و مطالعہ کے لئے ایسی گہری نظر درکار ہے، جو اسلام کی تحریک کا اس حیثیت سے جائزہ لے کہ وہ خدا کے علم میں ایک مکمل پروگرام کی شکل میں تھی، جس کا ارتقار تدریجاً ہوا، اور یہ قرآن میں بھی متعین صورت میں تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت اس پروگرام کو بہترین ڈھنگ سے اپنی بے نظیر صلاحیتوں، اعلیٰ اخلاق اور انتہائی ذہانت کے ساتھ نافذ کرنے والے کی تھی، قرآن کو حالات واقعات کی رعایت سے نجماً نجماً حاصل ہوا ہے، لیکن یہ اس کے متعین خدائی پروگرام ہونے کے منافی نہیں ہے، دراصل وہ ایک بہترین نظام حیات ہے، جس میں جزئیات وکلیات آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں، یہ حالات وواقعات ایسے وقتی اور قطعی نہیں تھے، جو اسلام کی رفتار ترقی کو محدود کردیتے، وہ ایک ہدف اور مقصد تھا جو کبھی کبھی حالات وعادات زمانہ کے لئے روک یا چیلنج اور ہمہ گیر انقلاب بن جاتا تھا، اس کا پوری طرح اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے، کہ اول قدم ہی پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلیت کے رخ پر لا الٰہ الا اللہ کا نقاب ڈال دیا تھا، اس وقت وہ کون سے وقتی حالات یا مقامی تقاضے تھے، جس نے اس انقلابی نشان کی جانب آپ کی رہنمائی کی تھی، جس نے جاہلیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا تھا، اور اس کی یادگاروں، رسم ورواج، نشانات وعلامات اور معانی ومفاہیم سب کو تہہ وبالا کر ڈالا تھا، آرنلڈ نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے، کہ اسلام کا اس شان سے ظہور بالکل نہیں کھٹکتا، کیونکہ وہ بت پرست عربوں میں ایک نئی تحریک تھی، دو مختلف معاشروں میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کا یہ کتنا زبردست تعارض تھا، اسلام، عرب معاشرہ میں محض اس لئے نہیں داخل ہوا کہ وہ چند ظالمانہ ووحشیانہ رواجوں کا خاتمہ کردے، بلکہ وہ ایک مکمل انقلاب تھا، جس نے اپنے سے قبل کی زندگی کو یکسر بدل دیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ محمدؐ کی دعوت میں چند ایسی بنیادی باتیں تھیں، جو عام عربوں کے اس نقطۂ نظر سے قطعاً مختلف تھیں جن کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے، ان کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی کہ وہ نومسلم جن کو یہ اسلام سے پہلے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، اب فضائل میں وہ ان سے آگے ہیں، قرآن ایک اعلیٰ کتاب تھی، جس کی آیتیں ہر نئے دور میں اور ہر زمان ومکان میں انسانیت کی رہنمائی کے لئے نازل ہوئی ہیں، وہ سلبی اور ایجابی کسی پہلو سے بھی کسی خاص زمانہ اور مخصوص فضا کے زیر اثر نہ تھا، جیسا کہ اکثر مستشرقین عیسائیوں اور کمیونسٹوں کا خیال ہے، اہل مغرب سے ہم یہ مطالبہ نہیں کرتے ہیں کہ وہ قرآن پر بحیثیت آسمانی کتاب کے ایمان

لائیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول تسلیم کریں، بلکہ ہمارا مطالبہ صرف یہ ہے کہ وہ غیر جانبدار ہو کر معروضیت
اختیار کریں، اور سیرتِ نبوی ؐ کا اسی حیثیت سے مطالعہ کریں، اور قرآن کریم کو ایک مثالی و نظریاتی کتاب سمجھیں
جس کی تعلیمات، زمان و مکان، اور وقتی حالات سے ماورا ہیں، اس میں اگر چند وقتی حالات کا ذکر بھی ہے تو
یہ گوناگوں پاکیزہ قدروں اور اصولوں کا سرچشمہ ہیں، جن سے مستشرقین کو غافل نہیں رہنا چاہیے،
یہ صحیح ہے کہ مستشرقین کا ایک طبقہ وہ بھی ہے، جس نے اپنی دقت نظر سے سیرت نبوی ؐ سے متعلق ہماری تاریخ اسلام
کے بعض نازک، دقیق اور پوشیدہ گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے، لیکن اس غلط نہج اور طرزِ فکر کی وجہ سے جس کی کچھ مثالیں
ہم پیش کر چکے ہیں، اس نے اصل موضوع کے اندر بہت سے غلط نتائج و ثمرات بھی شامل کر دیئے ہیں، اور یہ ایک فطری امر
بھی ہے، کہ خطا سے خطا ہی سرزد ہوتی ہے، اور موضوعیت سے بُعد و انحراف کے بعد ایسے ہی نتائج برآمد ہوں گے، جو علم کی
روح اور سنجیدگی سے خالی ہوں گے۔

اس مختصر مضمون میں کسی تفصیلی بحث و مطالعہ اور تجزیہ و محاکمہ کی گنجائش نہیں، غور و فکر سے کام لینے والوں کو خود
ہی پتہ چل جاتا ہے، کہ مستشرقین نے سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کی تہوں کے اندر ہر قسم کا تضاد
اور فکری اضطراب لپٹا ہوا ہے، اور جس کا علمی بحث اور سنجیدہ اسلوب سے کوئی تعلق نہیں، لیکن یہ کلیہ استثنار سے خالی
نہیں ہے، اور چند ایسے مستشرقین بھی ہیں جنھوں نے خود بھی سنجیدہ طرز فکر کو اپنایا، اور اپنے ہم قلم مستشرقین کی غلطیوں کو
بھی واضح کیا، ویلیم واٹ، درمنگھم اور آرنلڈ کے بعض خیالات ہم گذشتہ صفحات میں پیش کر چکے ہیں، گو ان مستشرقین کا نقطہ
نظر بھی زیادہ علمی اور پاکیزہ و شفاف نہیں ہے، مگر اس سے زیادہ کی توقع کرنا بھی محال اور دشوار ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز اور روس میں بالشویکی انقلاب کی کامیابی کے ساتھ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور
تاریخ اسلام کے متعلق ایک نیا موقف سامنے آیا، جو تاریخ کی مادی تعبیر کا نتیجہ تھا، اس کی یہ کوشش رہی کہ اپنے دستور و نہج کے
مطابق جارحانہ انداز سے سیرت نبوی ؐ میں قطع و برید کر کے اس کی دھجی بکھیر دی جائے، تاکہ لوگوں کا اس سے تعلق ہی ختم ہو جائے،
ان لوگوں کو جو کچھ اپنے موافق نظر آیا، اُسے تو لے لیا اور باقی کو نظر انداز کر دیا، اس طرح جو کچھ لیا اس کا تناسب بنائے گئے
کے مقابلہ میں ایک اور دس کا ہے۔ چونکہ سیرت کے واقعات ان کی تحلیل و تجزیہ اور مخفی اغراض و خواہشات کے سراسر خلاف
تھے۔ اس لئے انھوں نے تفسیر و تاویل اور قطع و برید میں بڑے عناد اور انتہائی زیادتی سے کام لیا، نیز فلسفہ اور واقعات

کے درمیان مطابقت کی تلاش وتحقیق اور تعلیل وتوجیہ میں بھی ان لوگوں نے بڑی جانب داری کا ثبوت دیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ہی واقعہ کے بارہ میں ان کی رائیں مختلف ومتضاد ہو گئیں، حالانکہ وہ ایک ہی مکتب فکر کے خوشہ چیں، اور ایک ہی دبستان سے تعلق رکھتے تھے، مثلاً بعض مارکسی مستشرقین کا خیال ہے، کہ مکہ ومدینہ میں عرب معاشرہ نے پہلی بار ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کا مشاہدہ کیا جس میں غلاموں کو بھی حق ملکیت دیا گیا تھا، بیجولفسکایا کا خیال ہے کہ قرآن نے غلام کے حق ملکیت کے مرحلہ کے مرکوز ہونے کو تسلیم کیا ہے۔ وہ بلانیف کے اس خیال سے متفق ہیں کہ کمزور طبقہ کا یہ دور اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ عرب دوسری قوموں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں تھے، دوسرے مارکسی مستشرقین کہتے ہیں کہ کمزور طبقہ کا معاشرہ فعلاً وجود میں آگیا تھا، کلیو فنج کا خیال ہے کہ اسلام، جائداد سے نئے نفع اندوز طبقات کے مفاد کی رعایت رکھتا ہے، اور کمزور طبقہ کی سرمایہ داری کا حامی ہے، بعض کا قول ہے کہ اسلام صرف غریب طبقہ کی سرمایہ داری کا محافظ ہے، بلانیف کی رائے ہے کہ اسلام جس کا نمایندہ قرآن ہے اور برسراقتدار طبقوں کے معاشرتی اور سیاسی مفاد کا لحاظ نہیں رکھتا، اسی لئے مسلمان جدید طبقوں کے استحصال کو جائز کرنے کے لئے حدیثیں گھڑنے پر مجبور ہوئے، بعض کہتے ہیں کہ یہ اسلامی سرمایہ داری تھی، جس نے مقصد برآری کے لئے عربی قبائل کو وحدت کی لڑی میں پرو دیا تھا، لیکن دوسرے مارکسی مستشرقین کی رائے یہ ہے کہ قبائل وحدت کی طرف اچھل کود کر رہے تھے کہ اسلام کا آغاز ہوا، جس کی وجہ سے وحدت عمل میں آئی، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں یہ آپس میں تضاد رائے کے شکار ہیں، کلو فنج کہتے ہیں کہ اور نبیوں کی طرح محمدؐ بھی ایک نبی تھے، آپ نے توحید کی بشارت دی اور قبائل کو متحد کرنا چاہا، لیکن تولستوف، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کے ہی منکر ہیں، اور آپ کی شخصیت کو محض ایک افسانوی شخصیت سمجھتے ہیں، بعض لوگ ظہور اسلام کے معترف ہیں، لیکن کلو فنج کا خیال ہے کہ

اسلام کا ایک بڑا حصہ بعد میں کمزوروں کے مفادات کے تحفظ کی شکل میں سامنے آیا، جس کا تعلق محمدؐ کی حیرتناک کارکردگی سے ہے، تولستوف اس حد تک بڑھ گئے کہ ان کے خیال میں اسلام ایک من گھڑت افسانہ ہے، جو خلافت کے دور میں برسر اقتدار طبقہ کے مفاد کی خاطر گھڑا گیا، اور اس کے وضع واختراع میں ان پرانے اعتقادات سے استفادہ کیا گیا ہے، جن کو حقیقت کہا جاتا تھا۔

ان چند مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مارکسیت ایک ایسا جدید مذہب ہے، جو اسلام اور پیغمبر اسلامؐ سے بغض و نفرت میں عیسائیت سے کسی طرح کم نہیں ہے، موضوعی و معروضی مطالعہ سے انھیں بھی کوئی واسطہ نہیں، دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تاریخ اسلام کی حد تک یہ مارکسی جدید دور کے پادری ہیں، جنھوں نے اپنے بھیس ضرور بدل لئے ہیں لیکن اپنے اندرون میں وہ وہی قدیم عیسائی پادری ہیں، جو اپنے کو جدید مادیت سے منسوب کرتے ہیں، ان لوگوں نے سیرت محمدیؐ کو اس سے کم دھندلا نہیں کیا ہے، جتنا قدیم نصاریٰ نے کیا تھا، ذیل میں مادی کلیسا کے ایک فرزند بندلی جوزی کے بعض خیالات پیش کئے جاتے ہیں: وہ لکھتے ہیں کہ مکیوں کے ساتھ نبی کریمؐ کی جو سیاست تھی وہ نئے عوامل کے زیر اثر اور بعض دوسرے اسباب کی بنیاد پر جو حالات اور تجربات کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے، مدینہ میں بڑی حد بدل گئی تھی، مکہ سے وطن اصلی ہونے کے تعلق اور وہاں کے لوگوں سے قرابت اور غزوۂ بدر واحد وخندق کے بعد پیش آنے والے جذبات اور سیاسی عوامل کی وجہ سے آپ نے اپنے مکی بھائیوں کے ساتھ نرمی و مہربانی کی سیاست اختیار کی، خود مکہ کے برسراقتدار طبقہ نے بھی بدر کی شکست اور اس میں لاحق ہونے والے مالی نقصان کے بعد یہی مناسب سمجھا کہ چند شرطوں کے ساتھ آپ سے صلح کرلی جائے، جو یہ تھیں، کہ کعبہ حج اور عکاظ کو اسی حال میں باقی رکھا جائے، جیسے وہ اسلام سے پہلے تھے، اور ان کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ کیا جائے، نیز آپؐ ان کو بھی اپنے اس نئے عمل میں شریک کریں جس میں انھیں اپنے لئے خیر اور بہتری کی توقع ہو، ان کی شرط تھی کہ آپؐ مدینہ ہی میں رہیں گے، اور مکہ والوں کے مالی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے، چنانچہ صلح حدیبیہ ہوئی اور تالیف قلوب کی سیاست اختیار کی گئی، جسے دوسرے لفظوں میں رواداری اور مسامحت کی سیاست بھی کہہ سکتے ہیں، اس کے نتیجہ میں لوگ خدا کے دین میں جوق در جوق شامل ہو گئے، مگر یہ لوگ اسلام کو صحیح دین سمجھ کر اس میں نہیں شامل ہوئے تھے، بلکہ وہ اس لئے اسلام میں داخل ہوئے تھے کہ نئے حکمراں طبقہ کا قرب حاصل کرسکیں، اور اپنے قدیم مذہبی مرکزوں اور دولت کا تحفظ کرسکیں، بندلی جوزی کے خیال میں حدیبیہ یا کسی اور موقع کی ایک شرط یہ بھی جس پر دونوں فریق متفق تھے کہ نبی کریمؐ مکہ کے سربرآوردہ لوگوں پر طعن و تشنیع کرنے سے باز رہیں گے، اور وہاں کے غریبوں اور کمزوروں کو ان کے خلاف جنگ پر آمادہ نہیں کریں گے، میرے خیال میں اسی بنا پر مدنی بالخصوص آخر دور کی سورتوں میں مکہ کے باشندوں کے بارے میں کوئی سخت آیت نازل نہیں ہوئی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی زندگی مدینہ میں آکر بدل گئی۔ اور اسی وجہ سے نبی کی بعض اجتماعی اور دینی اصلاحات ناقص رہیں، اور جیسا کہ اہل یورپ کہتے ہیں انہیں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قدر تساہل کو بھی دخل تھا، یہ بالکل بے سرو پا بات ہے، صلح حدیبیہ کی تمام شرطیں معروف و مشہور ہیں، نہ ان میں اس کا کہیں ذکر ہے، اور نہ کسی اور مقام اور زمانہ میں آپنے اس طرح کی شرط عائد کی تھی، بندلی جوزی یہ بھی لکھتے ہیں، کہ نبی کریمؐ کا مکی دور تمہید اور تیاری کا دور تھا، جس میں مختلف طبقوں میں ایک نئی دعوت کو پھیلانے کی کوشش جاری تھی، اس دور میں ایک شخص جو اپنے اصولوں پر ثابت قدم اور اپنے عمل میں مخلص تھا، اس کے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان الفاظ کی جنگ جاری تھی، جو اپنی قیادت اور دولت کے بارہ میں خطرات محسوس کر رہے تھے، چنانچہ اس شخص کے خلاف مقابلہ وصف آرائی ہوتی رہی، یہ دور کوششوں اور تمناؤں کا دور تھا، اگر یہ کوششیں بارآور ہو جاتیں تو پورا ملک یکسر بدل جاتا، یہ دور کتنا اچھا اور عمدہ تھا، نبیؐ کا دوسرا دور عمل تنظیم، جنگوں اور سیاست کا دور تھا، لیکن اس میں طرفین کی جانب سے تساہل برتا گیا، اس طرح کے موقع پر تساہل کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بعض اصول ترک کر دیئے جائیں اور بعض مطالبوں سے دست برداری اختیار کر لی جائے، یا بعض افکار و خیالات سے رجوع کر لیا جائے، یا انھیں اس انداز سے پیش کیا جائے، جس سے دونوں فریق خوش اور مطمئن رہیں، اسی نوعیت کا معاملہ نبیؐ اور صدر جمہوریہ مکہ ابو سفیانؓ کے درمیان پیش آیا تھا، ابو سفیان نے نبیؐ کی روحانی و عالمی قیادت، بتوں کی ہجو، نماز اور زکوٰۃ کی ادائی منظور کر لی تھی، اور نبیؐ نے یہ منظور کر لیا تھا کہ مکہ کی روحانی اور دینی مرکزیت برقرار رہے گی، مکہ کے اعیان و عمائد کو نئی روحانی جمہوریت میں انتظام و انصرام کا حق ملے گا، اور ان کو ان کے حسب مرضی زندگی گذارنے کی مکمل آزادی حاصل ہوگی، اس معاہدہ میں غریبوں اور کمزوروں کا تیسرا گروپ سب سے زیادہ خسارہ میں رہا، حالانکہ اسی طبقہ کی خاطر جنگیں ہوئیں، اور اسی کی حالت درست کرنے اور بہتر بنانے کے لئے دعوت نبویؐ کا ظہور ہوا تھا، لیکن ابتدا میں ان لوگوں کو صرف کچھ صدقات و زکوٰۃ دے کر خوش کر دیا گیا، چنانچہ نبیؐ اور ان کے خلفاء کے دور کے بعد اس طبقہ کو قصداً یا بلا قصد و ارادہ فراموش کر دیا گیا، چنانچہ یہ جیسا تھا ویسا ہی رہا، بلکہ پہلے سے بھی زبوں تر ہو گیا،

یہی مستشرق ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "بلاشبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقوال و افعال کے ذریعہ مکہ اور مدینہ میں معاشرہ کے شر کے اسباب اور اس کے جراثیم کو ختم کرنے کی اس طرح کوشش نہیں کی، جس طرح کی کوشش آجکل کمیونسٹ کر رہے ہیں، اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے، تو جزیرۃ العرب میں صاحب اقتدار و اختیار ہونے کے بعد اجتماعی امراض کے جراثیم ختم کر دیتے، اور وہ غریبوں اور کمزوروں اور غلاموں کے استحصال کو روک دیتے، معارف اگست ۱۹۸۳ء

مستشرقین اور اسلام

از

شیخ انور الجندی، مصر مترجمہ عمیر الصدیق دریابادی ندوی، رفیق دار المصنفین

مستشرقین کے ایک طبقہ کا دعویٰ ہے کہ قرآن کی تعلیمات اور واقعات کا ماخذ توریت وانجیل ہیں، یہ لوگ دراصل قرآن مجید کے متعدد ایسے اصولوں سے ناواقف ہیں، جن کے ذکر سے توریت وانجیل خالی ہیں، علاوہ ازیں قرآن مجید نے بعض واقعات کی جو تفصیل بیان کی ہے، ان سے یہود ونصاریٰ بے خبر تھے، باوجودے کہ وہ ان ہی کے دین وتاریخ سے متعلق تھے، مثلاً ان لوگوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے بعد ان کی والدہ حضرت مریمؑ کی کفالت حضرت زکریاؑ نے کی، اسی طرح قرآن مجید کی وہ پیشین گوئیاں جو بعد میں بالکل درست ثابت ہوئیں، جیسے ساتویں صدی عیسوی کے ابتدا میں رومیوں نے ایرانیوں سے ایسی زبردست شکست کھائی کہ بظاہر کسی کو رومیوں کے دوبارہ غلبہ کی کوئی امید نہیں تھی، لیکن قرآن مجید نے پورے وثوق اور یقین کے ساتھ خبر دی کہ چند برسوں میں وہ پھر غالب آجائیں گے اور بالآخر یہ پیش گوئی پوری ہو کر رہی، اسی طرح قرآن مجید نے بعض ایسے واقعات کی خبر دی جن کا مشاہدہ اب موجودہ دور میں ہو رہا ہے، حالاں کہ ان واقعات کا علم چودہ سو برس پہلے نہ تو کسی کو تھا اور نہ ہی مسلمانوں کے سوا ان کے ظہور ووقوع پر کسی کو یقین تھا اور توریت وانجیل میں بھی ان باتوں کا کوئی ادنیٰ ثبوت یا اشارہ موجود نہیں تھا، مثلاً فضا کی بلندیوں میں ہوا کا دباؤ کم ہوجانا آج ایک عام سائنسی اصول ہے، لیکن قرآن مجید نے بہت پہلے ایک آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا تھا:

وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ (انعام:۱۵)	اور اللہ جس کو گم راہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے سینہ کو بالکل تنگ کر دیتا ہے، گویا اسے آسمان میں چڑھنا پڑ رہا ہے۔

اسی طرح بارش کے وقت زمین کے اہتزاز کے بارے میں قرآن مجید نے بہت پہلے کہا تھا:

فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ (حج:۱)	پھر جہاں ہم نے اس پر مینھ برسایا کہ یکایک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی۔

ڈیڑھ ہزار برس پہلے اس قسم کی معلومات ناقابل یقین خیال کی جاتی تھیں، مگر سائنس کی جدید تحقیقات کے بعد

کس کو ان میں شک وشبہ ہو سکتا ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں متعدد ایسی باتیں بیان ہوئیں جنھیں کسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب نہیں جا سکتا، کیونکہ ان میں آپ کے کسی خاص طرز عمل کی وجہ سے آپؐ پر عتاب کیا گیا ہے، ایسی صورت میں قرآن کا آپ کی تصنیف ہونا کسی طرح ممکن نہیں، کیونکہ اگر آپ خود ہی قرآن لکھتے تو پھر اپنے آپ پر عتاب کس طرح کرتے؟ غزوۂ بدر کے اسیروں کی رہائی، نابینا صحابی کی آمد اور منافقین کی نماز جنازہ اور حضرت زینبؓ بنت جحش کے واقعات میں قادر مطلق کا لہجہ، ذات نبویؐ کے طرزِ کلام سے واضح طور پر ممتاز اور جدا ہے، اور اس حقیقت کا غماز ہے کہ بیشک قرآن مجید کلام الٰہی ہے۔

اب یہ دعویٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے توریت وانجیل کے معانی ومطالب اور ان کے آہنگ واسلوب کو اختیار کیا تو اس کا سادہ جواب یہ ہے کہ قرآن کے مضامین اور توریت وانجیل کے مضامین میں نمایاں فرق ہے، یہاں تک کہ چند مشترک باتوں میں بھی بنیادی فرق موجود ہے، مثلاً حضرت مریمؑ وعیسیٰؑ کے معاملات، عقیدۂ تثلیث، واقعۂ صلیب اور بنی آدم کے پیدائشی طور پر گنہگار ہونے کے عقائد ومسائل ایسے ہیں، جن میں قرآن اور انجیل کا تضاد ظاہر وواضح ہے، اس لئے مذکورہ دعویٰ کی کوئی حقیقت واہمیت نہیں ہے،

ایک اور اعتراض یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے منتظر اور متمنی تھے، اور اپنے ایک دوست سے اسکے متعلق گفتگو کیا کرتے تھے، لیکن مستند اور صحیح روایتوں سے قطعاً یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آپؐ خود کو "موعود نبی" سمجھتے تھے، ایسا ہوتا تو محدثین اور مؤرخین اس قسم کی روایتیں بیان کرنے میں ذرا بھی تساہل نہ برتتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے مشہور جاہلی شاعر امیہ بن ابی الصلت کے بارہ میں اس قسم کی روایتیں ملتی ہیں کہ اس کو یہ گمان تھا کہ وہ نبوت کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کے برعکس قرآن مجید نے تو یہ صراحت کی ہے:

وَمَا كُنتَ تَرْجُوٓا أَن يُلْقَىٰٓ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبُ	تم اس بات کو ہرگز امیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل
إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۔ (قصص: ۹)	کیجائیگی، یہ تو محض تمھارے رب کی رحمت سے تم پر نازل ہوئی ہے"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی اور راست گوئی کے معترف تو آپ کے دشمن، حتیٰ کہ ابوجہل جیسے بدترین مخالف بھی تھے، اگر اس قسم کی کسی بات کا کوئی شائبہ بھی ہوتا تو وہ لوگ اس کا پروپیگنڈا کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے، اور ان کے ہم نواؤں

سے بھی زیادہ آگے ہوتے جس سے یقیناً مستشرقین، منافقین اور یہودیوں کو بھی مخالفت کا ایک زبردست حربہ اور طاقتور دلیل مل جاتی۔

اسی طرح قرآن مجید نے صراحت کے ساتھ کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی معلم نہیں تھا جو آپ کو قرآن کی تعلیم دیتا۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ (نحل: ۱۰۳)

ہمیں معلوم ہے یہ لوگ تمہارے متعلق کہتے ہیں کہ اس شخص کو ایک آدمی سکھاتا پڑھاتا ہے، حالانکہ ان کا اشارہ جس آدمی کیطرف ہے اسکی زبان عجمی ہے، اور یہ صاف عربی زبان ہے

قرآن مجید کے بعض الفاظ و کلمات کے بارہ میں چند محققین نے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ عربی کے بجائے دوسری زبانوں کے ہیں مستشرقین نے اس تحقیق کو سند تسلیم کرتے ہوئے فیصلہ صادر کیا کہ قرآن کی عربیت زبان کامل و خالص نہیں ہے، حالانکہ بظاہر غیر عربی نظر آنے والے یہ الفاظ حقیقۃً غیر عربی نہیں ہیں، بلکہ وہ قدیم عربی میں تجارت، سفر اور دوسری قوموں کے اختلاط کی وجہ سے داخل ہو گئے تھے، اور زبانوں کے عام قاعدے اور مزاج کے مطابق وہ اصل عربی زبان کا جزو بن کر اس میں استعمال ہونے لگے تھے، اسی لیے قرآن مجید نے بھی ان کو استعمال کیا، اور خدا نے اپنے بندوں سے ان ہی کی زبان میں گفتگو کی، یہ بات نامناسب اور غیر معقول بھی ہے کہ قرآن مجید استعمال تو ایسے الفاظ کرے جو غیر عربی ہوں یا عربوں کے لئے نامانوس ہوں اور ان کو "عربی مبین" کا نام دے، گویا ان کو ایسے الفاظ میں خطاب کرے جن کو وہ سمجھ ہی نہ سکیں،

محققین نے ایسے الفاظ کی تحقیق کی تو یہ ثابت ہوا کہ یہ الفاظ اصلاً عربی ہی تھے، بعد میں حبشی، سریانی اور فارسی زبانوں میں بھی دخیل اور رائج ہوئے، یہ اعتراض پہلے بھی کیا گیا ہے، اسی لئے امام طبری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والے کسی بھی صاحب عقل سلیم سے اس اعتقاد کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ قرآن مجید کے چند الفاظ فارسی ہیں، بعض نبطی ہیں اور کئی حبشی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

وَلَوْجَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْ

اگر ہم اس کو عجمی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ کہتے

لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ، کیوں نہیں اس کی آیات کھول کر بیان کی گئیں

مستشرقین اور عربی زبان وادب

عربی زبان وادب پر مستشرقین کا حملہ بھی اصلاً قرآن مجید ہی سے جڑا ہوا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ "بیان قرآن" اور عربی انشا پردازی کی زبان کے درمیان ایک خلا کا وجود ثابت کر دیا جائے، اسی لئے مستشرقین کی پیہم کوشش یہ رہی ہے کہ عربوں کو عوامی زبان اور لاطینی حروف کی جانب زیادہ رغبت دلائی جائے، مراکش وشام میں فرانسیسی مستشرق ماسینون اور مارگولیوتھ نے دوسرے عرب ممالک میں یہی مہم چلا رکھی ہے، اور ان دونوں نامور مستشرقین کا مرکز دمشق تھا، ان کا مقصد یہ تھا کہ جب عربی زبان، مقامی رنگ اختیار کرے گی، اور زبانیں غیر عربی لب ولہجہ سے مانوس ہو جائیں گی تو اسلام کی فہم کے راستے خود بخود منقطع ہو جائیں گے، اور اس کی عائد کردہ پابندیاں بھی ختم ہو جائیں گی۔

ان مستشرقین نے عربی زبان پر کئی اعتراضات کئے، مثلاً عربی زبان ناقص اور علمی مفہوم ادا کرنے کے لئے ناکافی ہے، بولنے میں مشکل، اور لکھنے میں دشوار ہے، اس کی سطح عام لوگوں کی فہم وادراک سے بالاتر ہے، بولنے اور لکھنے کے طریقوں میں بڑا فرق ہے۔

لوئس ماسینون کا شمار ان انتہائی خطرناک مستشرقین میں ہوتا ہے، جو عربی کے لئے لاطینی حروف اور رسم الخط کو قبول کرنے کی دعوت دیتے تھے، ان کے خیال میں اس سے اعراب کی زحمت ختم ہو جائے گی اور غیر عربوں کے لئے بھی عربی زبان کی تحصیل زیادہ آسان ہو جائے گی، انھوں نے دمشق کی مجمع العلمی کے ارکان کے سامنے اپنی اسی دعوت کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگر لاطینی حروف کو قبول کر دیا گیا تو عربی زبان کی تجدید کے لئے یہ اہم وسیلہ ثابت ہوں گے، پھر انھوں نے پیرس میں بھی عرب نوجوانوں کی مختلف مجلسوں میں اسی تجویز کو دہرایا، لیکن یہ عربی زبان کی خوش نصیبی تھی کہ ان کو اپنی تحریک تحریک کے سلسلہ میں سخت مزاحمت اور وسیع ردعمل کا سامنا کرنا پڑا، مارگولیتھ کی اسی قسم کی کوششوں کا انجام بھی ماسینون سے مختلف نہیں رہا، چنانچہ جب انھوں نے ایرانیوں کے سامنے یہی تجویز رکھی، تو ایرانیوں نے سختی کے ساتھ رسم خط اور عربی حروف کو لاطینی میں تبدیل کرنے کی ان کوششوں کو رد کر دیا، مستشرقین سے پہلے عیسائی مشنریوں ولیم ویل کوکس اور ویل مورا اور اسپٹیا نے بھی عوامی زبان کو اپنا ہدف بنایا تھا، مستشرقین ان کے بعد فصحیٰ یعنی قرآن کی زبان کے خلاف سرگرم عمل ہوئے، ایک مستشرق دنلپ نے چند ایسے رسائل شائع کئے جن کی زبان قدیم مصری تھی، گر وہ یورپی حروف میں لکھے گئے تھے

انھوں نے اپنے ایک رسالہ کا نام الجر دمیۃ مصری رکھا تھا، اس کی ایک عبارت کی تحریر کا نمونہ یہ جملہ ہے، بل لسان المصری ومعھا امسلۃ جس کی صحیح صورت یہ ہے باللسان المصری ومعھا امثلۃ ۔

* مستشرقین کے مقصد بر آری کا ایک اہم ذریعہ عربی اکیڈمیاں بھی رہی ہیں، ان اکیڈمیوں کو ان کا علمی تعاون برابر حاصل ہوتا رہا، اور انہی کے ذریعہ یہ مطالبہ کیا گیا کہ قرآن کو موجودہ دور کی زبان کے مطابق لکھا جائے، اس طرح اس طریقۂ تحریر کو ہی ختم کردیا جائے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے رائج ہے، اور جس میں مختلف عربی لہجوں اور قرأتوں کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، مستشرقین کی یہ کوشش کوئی نئی بات نہیں، اسلام کے بدخواہوں کے انداز فکر و عمل میں روز اول سے ہی ایک قسم کی یکسانی پائی جاتی ہے، چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ بھی اپنے زمانہ میں اس کی تردید کرچکے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ قرآن کی قرأت کے لئے ضروری ہے کہ وہ صحابہ کرام کے لکھے ہوئے نسخوں کے مطابق ہو، قرآن مجید کا نزول سات عربی لہجوں پر ہوا ہے، اور اس کا موجودہ خط ان تمام لہجوں کے موافق ہے، اس لئے اگر رسم خط میں تبدیلی کی گئی تو یہ زبان ہی ضائع ہوجائے گی ۔

مستشرقین کی ایک سازش یہ بھی ہے کہ نحو و صرف کے علوم سے صرف نظر کیا جائے، کیونکہ اس سے زبان کی مشکلیں آسان ہوجائیں گی، اب اس ہمدردی کو کیا کہا جائے؟ اہل علم واقف ہیں کہ عربی زبان کی عظمت جن بنیادوں پر قائم ہے، وہ نحو و صرف کے مقررہ اصول و قواعد اور نیز بلاغت کے علوم یعنی معانی، بیان اور بدیع وغیرہ کے ضوابط کی مکمل محافظت کے متقاضی ہیں، اگر اس بنیادی علوم کے قواعد میں ذرا سی بے توجہی اور معمولی نرمی گوارا کی گئی تو زبان میں عیب نکلیں گے اور کجی آسکتی ہے، اور عربی زبان کا سرمایۂ امتیاز، اس کا زوردار اسلوب، نادر ترکیبیں اور بلیغ جملے سب مسخ اور تباہ ہوجا

مستشرقین نے ایک اور راگ چھیڑا جس میں ان کی ہمنوائی کئی مغرب زدہ عربوں نے بھی کی، اور وہ یہ کہ عربی زبان ہماری اپنی زبان ہے، اس کی اصلاح و ترقی اور اس میں رد و بدل وغیرہ کا حق و اختیار صرف ہم کو ہے، اس راگ کے بے سرے ہونے کا احساس ہر صاحب ذوق کو ہوا، حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان پر محض مصریوں، شامیوں یا عربوں کا ہی حق نہیں ہے بلکہ ان کے ساتھ اس پر کم از کم آٹھ سو ملین مسلمانوں کا حق بھی ہے، جن کی ثقافت، فکر اور عقیدہ کی زبان عربی ہے، یورپ کی مقامی قومی زبانوں کے بارے میں تو یہ دعویٰ درست ہے ہوسکتا ہے، لیکن عربی جیسی قدیم و وسیع زبان کو کسی محدود خطۂ ارض یا محض عربوں کی زبان قرار دینا کسی طرح بھی درست نہیں ہوسکتا، یہ خواہش یا دعویٰ اس قدر مہمل ہے کہ تاریخ و تحقیق کی نظر میں بھی در خود

اعتنا نہیں ہو سکتا۔

مستشرقین کا یہ دعویٰ بالکل ہی غلط اور خلاف واقعہ ہے کہ عربی زبان کا ایک عیب یہ بھی ہے کہ وہ دو زبانوں پر مشتمل ہے۔ ایک تحریر کی زبان اور دوسری گفتگو کی زبان، گویا یہ عیب صرف عربی زبان کے ساتھ خاص ہے، حالانکہ دنیا کی ساری زبانوں کا یہی حال ہے، یہاں تک کہ یورپ کی انتہائی ترقی یافتہ زبانیں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں، ممکن ہو کہ تعلیم کے فروغ کے ساتھ گفتگو اور تحریر کے درمیانی فاصلے سمٹ جائیں، لیکن فطری طور سے یہ فاصلے ہر زبان میں قائم رہتے ہیں، اس لئے تحریر کی زبان کو گفتگو کی زبان کی پست سطح پر لانے کی کوشش بڑی مضحکہ خیز ہے، جو زبان کی خصوصیت اور اس کے اصول ارتقاء کے عین خلاف ہے۔

مستشرقین جب عربی زبان کے ضعف یا جمود کے بارہ میں اظہار خیال کرتے ہیں، تو وہ اس جمود کی اصل وجہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں، درحقیقت اس جمود کا اصلی سبب ان کا اپنا مزاج ہے، جس نے عربی زبان کے فروغ کی راہوں میں رکاوٹیں پیدا کیں، مقامی زبانوں کو عربی زبان پر غالب کرنا چاہا، اور عوامی زبانوں اور روزمرہ کی بول چال کی محض اس لئے حوصلہ افزائی کی کہ اس سے عربی زبان کے فروغ و اشاعت میں رکاوٹیں حائل ہوں، استعمار کے نمایندوں مثلاً ڈنلوپ نے تعلیمی پالیسی اس طرح مرتب کی کہ جو نوجوان اعلیٰ علمی ترقی کے سرچشموں سے فیض حاصل کرنا چاہیں، ان کے لئے عربی زبان بحیثیت ذریعۂ تعلیم ناکافی ثابت ہو، اور یہ نوجوان ابتدائی تعلیم کے بعد ناموس ماحول اور اجنبی زبانوں کے دست نگر بن جائیں، چنانچہ یہی ہوا کہ کچھ تو آکسفورڈ اور کیمبرج کی روایتی ثقافت کے پابند ہو گئے، بعضوں کا دامنِ شغف عربی فکر سے عقیدہ ہی ختم ہو گیا، اور ایک طبقہ جرمن طرز اسلوب پر فریفتہ ہو گیا، مختصر یہ کہ سامراج نے قوم کو قومی زبان میں تعلیم پانے سے محروم کر دیا، جس کے نتیجہ میں قومی زبان کو سخت نقصان پہونچا، اور وہ دوسری زبانوں کے علوم بھی اپنے اندر منتقل کرنے کے قابل نہیں رہی، اور جن لوگوں نے ان علوم کو عربی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی، انھیں دقت اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

مستشرقین نے ایک سعی لاحاصل یہ بھی کی عربی اور لاطینی زبانوں کے درمیان موازنہ کیا جائے، عربی زبان کے ماہرین اور فضلاء نے اس کے مسموم اثرات کو بروقت محسوس کیا، اس تحریک کا مقصد صرف یہ تھا کہ عربی زبان کو لاطینی میوزیم میں سجا دیا جائے، اور مصری اور شامی عراقی بول چال اور روزمرہ کو الگ الگ زبانوں کی حیثیت دی جائے۔ دنیا کے کئی دوسرے خطوں کی طرح ممکن ہے یہ سازش عرب میں بھی کامیاب ہو جاتی، مگر قرآن مجید جو عربی زبان کے لئے "عروۃ الوثقیٰ" ہے، اس کا وجود اس

سازش کی ناکامی کے لئے کافی ثابت ہوا، واقعہ یہ ہے کہ عربی اور لاطینی زبانوں ..... تاریخ، حالات اور مسائل، کسی بھی اعتبار سے کوئی مشابہت نہیں ہے، لاطینی زبان مردہ ہوچکی، مختلف زبانوں میں اس کے کچھ اثرات اگر سرایت کر گئے تو اسکے اسباب سیاسی ہیں، مثلاً رومی حکومت کا خاتمہ اور اس کی سیاسی قوت کی بے اثری، وغیرہ جس کی وجہ سے لاطینی زبان اقتدار کے ایوانوں اور خواص کے ماحول سے نکل کر یوں منتشر ہوئی کہ عوام میں کہیں کہیں صرف اس کے وجود کا احساس ہوتا رہا۔ اصل بات یہ ہے کہ مسیحیت عام طور سے مقامی بولیوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے مشینریاں اپنا کام عوام سے شروع کرتی ہیں، اس لئے ان کا عوامی اور مقامی بولیوں پر توجہ دینا فطری ہے، قرآن کی بلاغت ہی اسلام کی دعوت کی اصلی روح ہے، اور اسی کا اعجاز تھا کہ اس نے تھوڑی سی مدت میں سریانی، قبطی، بربری، حبشی اور آرمی زبانوں کو بے اثر کردیا درحقیقت مقامی لہجے، عوامی اور معیاری زبان، نیز لاطینی حروف وغیرہ کی باتیں سب مستشرقین کی سازش کا نتیجہ ہیں جس کے مضر اثرات سے خود ہمارا مغرب زدہ طبقہ بھی محفوظ نہیں رہ سکا، چنانچہ ڈاکٹر محمد کامل حسین نے کہا کہ میں آسان اور سادہ زبان کا حامی ہوں، بلاغت کو اب بھول جانا چاہئے، کیونکہ ہم کو اس سے شدید نقصان اٹھانا پڑا ہے، یہ قول اس بات کا غماز ہے کہ لغت کا نہ عقیدہ سے کوئی تعلق ہے اور نہ عربی زبان کا تاریخ اسلام سے کوئی رشتہ ہے، اس کا منشا یہ ہے کہ سائنسی دور اور سائنسی علوم کو بہرطور غالب کیا جائے، اس قسم کی فکری سطحیت، خواہ کیسی ہی کرشمہ سازی کرے وہ بہرحال عقائد و افکار پر ضرب ..... نہیں لگا سکتی، اور نہ اس حقیقت پر پردہ ڈال سکتی ہے، کہ اسلامی انقلاب اور مسلم ثقافت نے عالمی اور انسانی ادب کو عام داستانوں، قصوں اور افسانوں کی پست سطح سے نکال کر فکری رشد، پاکیزگی عمل، مستحکم نظریات اور ایمان و اخلاق کے مرتبۂ کمال تک پہنچا دیا، اور جب یہ قدریں قرآنی بلاغت سے ہم آہنگ ہوئیں تو انسان کا قلب و نفس، ذوق و شوق کے کیف و وجد سے سرشار و ہمکنار رہا، اصل بات یہ ہے کہ مستشرقین کو عربی زبان سے یک گونہ عداوت و نفرت ہے، اور اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ وہ عربی زبان کی فہم و معرفت سے قاصر اور بلاغت و بیان کی اصطلاحات سے ناواقف ہیں مستشرقین کے اس مرض کے اثرات، ان کے عرب شاگردوں میں بھی سرایت کر گئے، ان کے علاوہ وہ لوگ بھی مستشرقین کے حلقہ بگوش ہوئے، جن کو قرآن اور اسلام سے بغض ہے، اور اسی بنا پر انھیں فصیح عربی سے بھی دشمنی ہے، ان لوگوں میں سے بعض نے عربی زبان اور بعض نے عربی شاعری کی بنیادوں پر تیشہ زنی کو اپنا مشغلہ بنا لیا ہے، دراصل مقامی اور عوامی بولیوں کی حوصلہ افزائی کرنے والے اسلام کے دشمن ہیں، ان کا اولین مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو قرآن مجید سے

دور کرکے فکرِ اسلامی کی ساری عمارت زمین بوس کر دیں، اور ایک زبان، ایک اسلام اور ایک کتاب کا وہ اصول بھی باقی نہ رہنے دیں، جو مسلمانوں کو وحدت کی لڑی میں پروئے رکھنے کا واحد طاقت ور ذریعہ ہے، انہی خطرات کے پیش نظر ۱۹۳۹ء میں مؤتمر عالم اسلامی نے ایک تاریخی قرارداد منظور کی تھی، جس کی رو سے سارے عالم اسلام میں عربی زبان کی تعلیم کو، قرآن کی زبان ہونے کا لحاظ کرتے ہوئے ضروری قرار دیا گیا تھا، یہ بھی فیصلہ ہوا تھا کہ ساری اسلامی زبانوں کا رسم خط عربی ہو۔

مستشرقین نے عربی زبان میں فساد وخرابی پیدا کرنے کے لئے جو مہم چلائی ہے، اس کا نمونہ ہمیں ان کی عربی لغت کی کتاب منجد میں بھی ملتا ہے، اس میں اصل عربی زبان میں غیر عربی اصطلاحات کو منظم طریقہ سے داخل اور رائج کرنے کی کوشش کی گئی ہے، الفاظ کی تشریح و توضیح میں دانستہ غلط بیانی سے کام لیا گیا، مثلاً لفظ طلقاء کی تشریح میں یہ لکھا گیا کہ وہ لوگ جن کو اسلام میں بہ جبر داخل کیا گیا، لفظ (ع، م، د) کی تشریح میں لکھا ہے کہ معمودیہ کے پانی سے بچہ کو دھونا، حالانکہ معمودیہ عربی زبان کا لفظ نہیں ہے، بلکہ تبطلی لفظ ہے، جو دال کے بجائے ذال سے لکھا جاتا ہے، ڈاکٹر مصطفےٰ جواد تحریر فرماتے ہیں کہ منجد کی غلطیاں حد شمار سے باہر ہیں، محض تین سو چوبیس غلطیوں کی ہم نے نشاندہی کی ہے، جب کہ ہم نے صرف ضرورت کے وقت ہی منجد دیکھی ہے۔

مستشرقین اور ادب عربی (۲) مستشرقین میں مارگولیوتھ، کلیمان ہوار، گب، نلینو، بروکلمان، بلاشیر، کراتشوفسکی وغیرہ نے عربی ادب کے مطالعہ میں فرقہ باطنیہ اور اخوان الصفا کے ادب کو زیادہ اہمیت دی، اور اس کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا کہ ادب عربی میں فارسی فکر اور یونانی ادب کی آمیزش ہے، مارگولیوتھ نے جاہلی شاعری کے بارے میں ایک خود ساختہ نظریہ قائم کیا، ۱۹۲۵ء میں انھوں نے اپنے خیالات کو استشراق کے علمبردار ایک رسالہ میں شائع کیا، ۲۶ء میں اسی مضمون کو طٰہٰ حسین نے اپنی کتاب الشعر الجاهلی میں شامل کر لیا، جس طرح دوسرے اسلامی علوم میں مستشرقین کا ایک مخصوص نظریہ ہے، اسی طرح ادب کو بھی وہ ایک خاص نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بروکلمان اپنی کتاب الادب العربی میں قرآن کے باب میں لکھتے ہیں، کہ قرآن کے بنیادی اصول نصرانیت سے ماخوذ ہیں لیکن گولڈ زیہر کا خیال ہے کہ ان آخذ کا تعلق یہودیت سے ہے، بعض لوگوں کے نزدیک وہ دونوں سے ماخوذ ہے، ان کے خیال میں مکی سورتیں نصرانیت سے اور مدنی یہودیت سے تاثر کا نتیجہ ہیں، کیونکہ مکہ میں مسلمانوں کے پڑوسی نجران کے عیسائی تھے اور

میں غطفان کے یہودیوں سے ان کا خلا ملا ہوا۔

عربی زبان کے قومی و عوامی ادب پر ان مستشرقین کی خاص توجہ رہی ،عشقیہ شاعری، الف لیلہ کے افسانوں اور اغانی کی کہانیوں کو بھی ان لوگوں نے اپنی ادبی تحقیق کا مرکز بنایا، نولدیکی اور موئر نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسیحی مبلغوں کے وعظ و پند کا اثر عربوں کی زبان پر آیا، اور پھر ان کے شعری ادب میں نمایاں ہوا، مستشرقین کے مغرب زدہ عرب شاگردوں نے عربی ادب پر فرانسیسی مادی نظریات کو منطبق کر کے غلط نتائج پیش کرنے کی کوشش کی کہ انسان ماحول اور زمانہ کا پابند ہے، وہ مجبور و بے اختیار ہے، وہ ایک مادی حیوان اور جنس اور روٹی کا غلام ہے۔

مستشرقین نے سبعہ معلقات، مقامات حریری، کلیلہ دمنہ، دیوان امرؤالقیس، الف لیلہ اور رسائل اخوان الصفا پر زیادہ داد تحقیق دی، کیونکہ ان پر اسلامی حقیقی عربی ادب کا کوئی اثر نہ تھا، جو قرآن و حدیث کے زیر اثر تھا، اسی طرح ان مستشرقین نے عمداً بشار، ابو نواس اور ضحاک جیسے شاعروں کے کلام کے احیاء پر زیادہ زور دیا یہ سب تعصب اور اسلام دشمنی کے زیر اثر ہوا، گب نے عہد جاہلی کو عہد بطولی (دورِ شجاعت) قرار دیا، مستشرقین کو اسلام سے پہلے کے دور کو عہد جاہلی کا نام دینا بھی گوارا نہیں، بلکہ وہ اسے روشنی، ترقی اور تہذیب و ثقافت کا دور قرار دیتے ہیں، اور اسلام کے عہد کو وسعت کے دور سے موسوم کرتے ہیں، تاکہ اس وہم و اشتباہ میں مبتلا کر دیں، کہ اسلام نے کوئی حقیقی انقلاب نہیں برپا کیا، بلکہ وہ محض اپنے سے پہلے کے دور کے تابع ہے، لغت کے دائرہ میں انھوں نے یہ وہم پیدا کیا کہ زبانیں دو ہیں، شمالی اور جنوبی۔

گب اور نیکلسن نے اس بات پر زور دیا کہ عرب دنیا، یونانی تہذیب و ثقافت سے متاثر ہے، خصوصاً علم کلام میں وہ مکمل طور پر یونانی تہذیب کی خوشہ چین ہے، اور نحو و بلاغت میں وہ یونانی کے ساتھ فارسی زبان و تمدن سے بھی متاثر ہے۔

گب کا یہ بھی قول ہے کہ جن لوگوں نے عباسی عہد میں فکر و فن کے پرچم کو سربلند کیا، وہ یا تو مسیحی تھے یا نیم مسیحی، معتزلہ کو بھی وہ اسی حیثیت سے اہمیت دیتے ہیں کہ یہ لوگ یونانی فکر سے متاثر تھے، آل بویہ اور شیعوں کی سیاسی کامیابی میں گب یونانی طرز فکر کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں، وہ موشحات و مقامات کی بھی قدر کرتے ہیں، مگر ملوکی دور کو وہ انحطاط کا دور کہتے ہیں، حالانکہ یہ دور علمی کارناموں اور فتوحات سے پُر ہے، عہد عثمانی کے بھی وہ بڑے نکتہ چیں ہیں اور اس کے متعلق سخت نفرت و تعصب کا اظہار کرتے ہیں، جدید عربی بیداری کو وہ فرانسیسی حملوں اور مشنریوں کے اثرات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

جاک بیرک اپنی کتاب مختارات من الادب العربی المعاصر میں عربی ادب کی نشأۃ ثانیہ کا سہرا تین عیسائی ادیبوں بطرس بستانی، بازجیاں اور جرجی زیدان کے سر باندھتے ہیں، اور لکھتے ہیں کہ یہ روشن مثلث اقلیت سے تعلق رکھتا ہے، بعد میں مسلمان بھی اس میں شامل ہوئے۔ وہ مہجرین ادیبوں مثلاً جبران و نعیمہ کو بھی بڑی اہمیت دیتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ جدید عربی ادب کی نمایاں شخصیت طٰہٰ حسین ہیں لیکن ان راویوں کی کوئی وقعت نہیں، کیونکہ وہ اپنے عہد کے خیالی ادب سے متاثر تھے، اسی لئے جب انھوں نے آزاد شاعری اور لوئیس عوض، حسین فوزی، نجیب محفوظ، اور سعید عقل وغیرہ کی تحریروں کو اہمیت دی تو کوئی بھی ان کا ہمنوا نہ ہوا۔

ڈاکٹر بنت الشاطی نے اپنے ایک تحقیقی مقالہ میں صرف نیکلسن کے بارہ میں لکھا ہے کہ عربی فن پاروں کو سمجھنے میں ان سے بے شمار غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، ان میں سے بعض سے تو صرف نظر کیا جا سکتا ہے، لیکن اکثر غلطیاں وہ ہیں جن سے نیکلسن کے علم کی بڑی مضحک صورت سامنے آتی ہے۔

مستشرقین اور سنت | سنت و حدیث کے بارہ میں مستشرقین کا نقطۂ نظر بعینہ وہی ہے جو اس سے پہلے قرآن اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق گزر چکا ہے، کیونکہ سنت بھی دراصل سیرت کا جزو اور قرآن کی تفسیر ہے، اس لئے اسے بھی مشتبہ، مشکوک جعلی اور کھوٹا قرار دینا ضروری تھا، نو مسلم مستشرق ایتان ڈینیہ لکھتے ہیں کہ یہ تصور ہی دشوار ہے کہ سیرت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) لکھتے وقت یا حدیث کا مطالعہ کرتے ہوئے مستشرقین اپنے جذبات و خواہشات سے آزاد ہیں، اسی لئے انھوں نے سیرت نگاری میں اس قدر تحریف سے کام لیا کہ صحیح واقعہ اور اصل حقیقت روپوش ہو گئی، باوجودیکہ ان لوگوں کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ معروضی اور غیر جانبدارانہ تنقید اور جدید علمی تحقیق کے اصولوں پر کاربند ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ان مستشرقین کے متعدد اعتراضات کا جواب ایتان ڈینیہ نے دیا ہے، ایک مستشرق لامانس کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ لامانس کی علمی شہرت سے لوگوں کو دھوکہ ہو گیا ہے اور انھوں نے ان کو ثقہ سمجھ لیا ہے حالانکہ وہ اپنی کتابوں میں ایسے دلائل پیش کرتے ہیں، جن میں اکثر مغالطہ آمیز واقعیت، حقیقت اور تاریخ کے خلاف ہیں، مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خلوت کو ناپسند کرتے تھے، حالانکہ تاریخ سے یہ پوری طرح ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں تنہا ہی عبادت کرتے تھے تاکہ آپ اپنے ذہن و شعور کو ایک نقطہ پر مرکوز کر کے اس مادی دنیا سے مکمل یکسوئی حاصل کر سکیں۔ لامانس نے لکھا ہے کہ آپ پر نیند کا غلبہ رہتا تھا، حالانکہ قرآن میں ہے:

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ

بیشک آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ دو تہائی رات سے بھی کم اور آدھی رات اور تہائی رات کو اٹھتے ہیں

لامانس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پُرخور ہونے کا الزام بھی لگایا ہے، حالانکہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ کھانے پینے اور دنیاوی لذتوں سے آپؐ کس قدر بے نیاز و بے پرواہ تھے، لامانس جب بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ اور صحابہ کرامؓ کا ذکر کرتے ہیں تو طعن و تشنیع کا کوئی موقع جانے نہیں دیتے اور سراسر تعصب و عناد سے کام لیتے ہیں، اس کے برخلاف اسلام کے دشمن ابوجہل، ابولہب اور منافقوں کی تعریف کرتے ہیں، اور ان کے معاملہ میں انتہائی نرم دکھائی دیتے ہیں جس کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاری اپنے دور کے عظیم ہیروؤں کے حالات کا مطالعہ کر رہا ہے، چند ایسے مستشرقین بھی ہیں جو لامانس کی طرح ہرزہ سرائی نہیں کرتے، بلکہ کبھی کبھی وہ کلمۂ خیر وانصاف بھی کہہ دیتے ہیں، مثلاً کارلائل اور ہنری ڈی کاسٹری جن کا بیان ہے کہ عقل حیران ہے کہ قرآن کی آیات کا صدور ایک اُمّی انسان سے کیسے ہوا، سارا مشرق اس بات کا معترف ہے کہ لفظاً و معنًی کسی بھی طرح سے اس قسم کی آیتیں پیش کرنے سے انسانی فکر قاصر ہے، محمدؐ نے قرآن کو اپنی رسالت کی تصدیق کے ثبوت کے طور پر پیش کیا، جو آج تک ایک ایسا راز ہے جس کے طلسم کو توڑنا محال ہے لیکن افسوس ہے کہ اس قسم کے خیالات رکھنے والے مستشرقین کی تعداد بہت کم ہے۔

اب ہم مستشرقین کے اس شبہہ کا ذکر کرتے ہیں کہ حدیث کی تدوین تاخیر سے ہوئی، یعنی دوسری صدی ہجری کے آغاز میں تدوین حدیث کا عمل شروع ہوا، جس سے مسلمانوں کو حدیث کے ذخیرہ میں کمی یا بیشی کرنے اور اپنے اغراض کے مطابق حدیثوں کو گھڑ لینے کا موقع ملا، گولڈزیہر، ڈوزی اور اسپرنگر اسی قسم کے خیالات کے ترجمان ہیں، گولڈزیہر کو اس بات کی صحت میں شک ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بہت سے صحیفوں کا وجود تھا، انھیں اس پر بھی کلام ہے کہ لوگوں کے سینوں میں حدیثیں محفوظ رہیں، اور وہ ثقہ راویوں کو ضعیف قرار دینے پر بھی مُصر ہیں، اور یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ حدیث کو مدوّن کرنے والوں نے صرف انہی روایتوں کو جمع کیا ہے، جو ان کے اپنی ذاتی اغراض و خواہشات کے مطابق تھیں، اسپرنگر کا بھی یہی خیال ہے کہ تدوین حدیث کا عمل دوسری صدی ہجری میں شروع ہوا، اور ان حدیثوں کی روایت زبانی ہوئی، ڈوزی حدیثوں کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کے ہی منکر ہیں۔

ان مستشرقین کے اعتراضات و شبہات کی علمی و تاریخی تردید ہوتی رہی ہے، جس سے ان کا تار و پود بکھر چکا ہے، یہاں ہم ڈاکٹر

مصطفیٰ سباعی کا ایک بیان نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ احادیث رسولؐ کو یاد رکھنے اور ان کی نقل وروایت پر صحابۂ کرام نے انتہائی توجہ دی، پھر ان کے بعد تابعین وتبع تابعین کا یہی طرز عمل رہا، ان لوگوں نے حدیثوں کو جمع کرنے اور ان کی روایت کرنے ہی کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ انھیں تحریف اور کمی وزیادتی کے ہر شائبہ سے محفوظ بھی رکھا، ان حضرات نے اس سلسلہ میں بے نظیر اور غیر معمولی جد وکاوش کی، اور جعلی اور غلط روایتوں اور جھوٹے اور وضاع راویوں کا پتہ لگانے میں حیرت ناک دماغ سوزی کا ثبوت دیا، غلط اور گھڑی حدیثوں کی پہچان کے لئے سخت ضابطے اور اصول مقرر کئے، اور انتہائی محنت کے بعد حدیث کے ذخیرہ کو صاف کرکے ان کو صحیح کتابوں میں شامل کیا، اگر تدوین حدیث کے ان سارے مراحل کا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے، تو مستشرقین کے تمام اعتراضات بے اصل معلوم ہوں گے، اور یہ ثابت ہوجائے گا کہ انھوں نے علم وتحقیق کے ساتھ کیسا مذاق اور کھیل کیا ہے، اور ذاتی بغض وعناد کی بنا پر تاریخ کا مرتبہ کس درجہ گرادیا ہے۔

ان مستشرقین کی علمی دیانت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ "معراج بنی عباس" نام کی ایک عامیانہ اور پُر از خرافات کتاب کو جس کا کوئی علمی مقام نہیں ہے، وہ انتہائی اہمیت دیتے ہیں، اور اس کا موازنہ طربیۂ خداوندی سے کرتے ہیں،

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے یورپ کے طویل سفر میں مستشرقین کی معیت میں متعدد یونیورسٹیوں کا مشاہدہ کیا تھا، جس کے بعد انھوں نے مستشرقین کے مندرجۂ ذیل اغراض ومقاصد کی نشاندہی کی ہے۔

(۱) نصوص کو اپنے خود ساختہ نظریۂ فکر اور من مانی خواہشات کے مطابق اور تابع کردینا۔

(۲) بالقصد وبالارادہ نصوص میں تحریف کردینا۔

(۳) تحریف کی گنجائش نہ ہونے کی صورت میں عبارت کا غلط مطلب نکالنا۔

(۴) مآخذ ومصادر کے بارہ میں اپنا ذاتی فیصلہ تھوپنا۔

چنانچہ وہ ادبی کتابوں سے حوالے نقل کرکے اسے حدیث کے مباحث میں چسپاں کردیتے ہیں، اور کتب تاریخ کے حوالے دے کر انہی کے مطابق فقہی مسائل میں اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں، اس کے نتیجہ میں وہ دمیری کی کتاب الحیوان کی روایتوں کو تو صحیح قرار دیتے ہیں، مگر امام مالکؒ کی مؤطا کی روایتوں کی تکذیب کرتے ہیں۔

مستشرقین اور اسلامی قانون شریعت | چونکہ اسلام کی غرض وغایت ہی اسلامی شریعت ہے، اس لئے مستشرقین کی نگاہ غلط انداز وفتنہ ساز سے یہ گوشہ بھی مخفی ومستور نہیں رہا، چنانچہ لامانس، مارگولیوتھ، گولڈزیہر، ریتان، گودان اور دوسرے مستشرقین

نے اسلامی شریعت میں بھی دراندازی کرکے اس میں شکوک و شبہات پیدا کئے ہیں، اور اس میں تضاد و تناقض ثابت کیا ہے، یہ لوگ اسلامی قانون کے مطالعہ میں محقق کے بجائے واعظ بن جاتے ہیں، اور مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی پستی اور تنزلی کا سبب [illegible] اسلامی شریعت و قانون ہے، جو ان کی ترقی، کامیابی اور بیداری و سرفرازی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے [illegible] شریعت کو زمانہ اور ماحول کے مطابق ہونا چاہئے، زمانہ کی تبدیلیوں کے ساتھ اس میں بھی تبدیلی آنی چاہئے، حالانکہ اسلامی شریعت، خدائے حکیم کی مقرر کردہ ہے، جو معاشرہ کے امن و سکون اور حقیقی فوز و فلاح کی ضامن اور اپنے مشمولات و مضمرات اور جزئیات و تفصیلات کے اعتبار سے نہایت وسیع، کشادہ اور ہمہ گیر ہے، اور جس کی ساخت میں ایسی لچک ہے جو زمانہ اور ماحول کے تغیرات کو بطریق احسن قبول کرتی ہے، اسی بنا پر اس کے اصل اور راسخ اصولوں میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہی نہیں، قرآن، حدیث، سیرت اور دوسرے اسلامی موضوعات کی طرح اسلامی شریعت کے بارہ میں بھی یہ مستشرقین تضاد رائے بلکہ پراگندگیٔ افکار کے شکار ہیں، ان کا دعویٰ کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام تر عربوں کے عرف و عادت کا مجموعہ ہے، اور یہ انتہائی غلط اور باطل دعویٰ ہے، شاخت وغیرہ کے اس قسم کے خیالات کو علمائے اسلام نے پوری طرح لغو ثابت کر دیا ہے، اس سے بڑھ کر ان کا خطرناک دعویٰ یہ ہے کہ اسلامی شریعت در اصل رومی قوانین سے ماخوذ و مستعار ہے، یہ دعویٰ بھی سراسر باطل ہے، ۱۹۳۷ء میں لاہائے میں قانون کی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں باقاعدہ ایک قرارداد میں اس کی وضاحت کی گئی کہ اسلامی شریعت ایک مستقل بالذات شئے ہے، جس کا رومی قانون سے کوئی تعلق نہیں، اس طرح قانون و انصاف کے بین الاقوامی اداروں میں شریعتِ اسلامیہ کی نمایندگی قبول کرنی پڑی۔

اسلامی شریعت کی بحث میں مستشرقین نے دین و دنیا کی تقسیم اور حکومت و مذہب کی تفریق کا مسئلہ بھی اٹھایا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اسلام تو چند مخصوص عبادات کا نام ہے، اسے معاشرہ کے انتظام اور سیاست و حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے گویا وہ اسلام کو اپنے دین مسیحی پر قیاس کرتے ہیں، جس کی دین اور سیاست کی دوئی کی پالیسی سے چنگیزی باقی رہ گئی ہے، اگر یہ مستشرقین واقعی اسلامی شریعت کا دیانتدارانہ تجزیہ کرتے تو انھیں یہ اعتراف کرنے میں تامل نہ ہوتا کہ اسلام اپنی خصوصیت اور مزاج کے اعتبار سے ایک دین حیات بھی ہے اور نظام حیات بھی، اور ان دونوں میں تفریق و فصل کی کوئی گنجائش نہیں، ان لوگوں نے البتہ دین و دنیا کے درمیان اس لئے حد فاصل قائم کی ہے کہ اسلامی معاشرہ میں اسلامی قوانین کے بجائے ان کے وضع کردہ قانون کی حکمرانی اور بالادستی قائم رہے، جس کے نتیجہ میں وہ کبھی اسلامی معاشرہ پر منطبق ہی نہ ہو سکے۔

اوپر گزر چکا ہے مستشرقین کے ایک طبقہ کا یہ کہنا ہے کہ اسلامی شریعت، رومی قوانین سے ماخوذ ہے، علماء نے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے شریعت اور قانون کے عمیق و دقیق فرق کی وضاحت کی ہے، اور بتایا ہے کہ شریعت جسم اور روح میں کوئی فرق نہیں کرتی، بلکہ ان میں ہر ایک کی پوری رعایت کرتی ہے، کیونکہ انسان ان دونوں کا مجموعہ ہے، وہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ فقہ اسلامی کے دائرۂ بحث میں عبادات، معاملات اور عقوبات وغیرہ شامل ہیں، جبکہ رومی قوانین کا موضوع اشخاص اور ان کے مابین خصومات ہیں، اسلامی قوانین کا سرچشمہ وہ کلام الٰہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب وحی کیا گیا۔ اور رومی قانون انسانی عقل کی کارفرمائی کا نتیجہ ہے، اسلامی قانون کا خلاصہ وعطر لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ ہے، رومی قانون کا دار ومدار سربراہِ حکومت یا عرف عام پر ہے، رومی قوانین کی کتابیں دستور وقانون امور مملکت اور نظام حکومت کے ضابطوں کو امور سیاست قرار دیتی ہیں، جب کہ فقہائے اسلام کے نزدیک مسلمانوں کا امام جس طرح ان کی نماز جماعت کا امام ہوتا ہے، اسی طرح وہ ان کا سربراہ حکومت بھی ہوتا ہے، قتل کے جرم میں مسلمانوں کے یہاں نیت کے اعتبار سے قتل عمد اور قتل خطا کی سزائیں دیت اور قصاص کی صورت میں مرتب ہوتی ہیں، لیکن رومی قوانین میں ایسی کوئی وضاحت نہیں، اسلام میں قتل، زنا، چوری، بہتان، شراب خوری اور ارتداد کے حدود کی نوعیت بھی یہی ہے، جبکہ رومی قوانین میں زنا، بہتان اور شراب نوشی حرام نہیں ہیں، اس لئے ان کی کوئی سزا ہی نہیں ہے۔

علمائے اسلام نے ان شبہات کا بھی جواب دیا ہے جو شاخت اور گولڈ زیہر وغیرہ کے پیدا کردہ ہیں کہ اسلامی عائلی، وراثتی اور جرائم وعقوبات کے قوانین، قبائلی نظام سے ماخوذ ومستفاد ہیں، شیخ ابوزہرہ نے اس غلط نظریہ اور اس کے پس پشت تعصب وعناد کی حقیقت عالمانہ انداز سے بیان کی ہے،

مستشرق ولماؤزن اور ان کے بعد کیتانی، بیکر، ڈیل اور گارڈ ھمن نے یہ الزام تراشی کی ہے کہ عربوں نے جب دوسرے ممالک کو فتح کیا تو اس وقت وہ مالیات واقتصادیات اور ٹیکس وغیرہ کے نظام ومسائل سے بالکل ناآشنا تھے، ولماؤزن کا خیال ہے کہ انھوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں سے غیر منظم طریقہ سے ٹیکس وصول کئے، اور پھر ایرانی ورومی نظام قانون کو اختیار کر لیا، اس اعتراض کا جواب دیا گیا کہ عرب اسلامی حکومت کے قیام سے ہی مالیات کے نظام سے بخوبی واقف تھے، اور بجز چند خاص صورتوں کے انھوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں سے کبھی کوئی ظالمانہ ٹیکس وصول نہیں کیا، اگر ٹیکس یا جزیہ لیا گیا تو باقاعدہ وباضابطہ طریقہ سے جس کی وصولی اور حساب کا علیحدہ نظام تھا، اور حالات وواقعات کے لحاظ سے اس میں

کمی اور زیادتی بھی ہوتی تھی، اور یہ سب مرکز خلافت کی خاص اور کڑی نگرانی میں ہوتا تھا۔

مستشرقین نے خراج کی امہات کتب شایع کیں یحییٰ بن آدم اور امام ابو یوسف کی کتاب الخراج کو بھی شائع کیا جو پہلے بھی چھپی تھیں، لیکن ۱۹۶۵ء میں امام ابو یوسف کی کتاب الخراج کا جو نیا ایڈیشن ان مستشرقین کے اہتمام میں شائع ہوا ہے، وہ معتبر اور لائق اعتماد نہیں ہے، کیونکہ یہ ان کی تحریف اور قطع و برید سے محفوظ نہیں رہ سکا، اور اس سے ان کے اغراض اور نیتوں کا پتہ چلتا ہے، انھوں نے اپنے خود ساختہ نظریات کے مطابق اسلامی قانون خراج کو ڈھالنے کی کوشش کی ہے، اور اس کی ایسی بگڑی اور مسخ تصویر پیش کی ہے جو تمام تر ان کے نظریات اور اغراض کے تابع نظر آتی ہیں۔

مستشرقین اور سیرت نبوی ؐ حقیقۃً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ہی مستشرقین کی ہرزہ سرائی، دسیسہ کاری اور خردہ گیری کا اصل محور و مرکز ہے، اس بارہ میں ان کا رویہ کبھی تو جارحانہ ہوتا ہے، اور کبھی وہ مغالطہ آمیز نرم لہجہ اختیار کرتے ہیں، ڈاکٹر کامل عیاد لکھتے ہیں کہ یورپ میں قرون وسطیٰ سے سترہویں صدی عیسوی تک اسلام کے بارہ میں عجیب و غریب خرافات اور داستان مشہور رہی ہیں، جن میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات مبارک سب سے زیادہ سب وشتم کا نشانہ بنائی گئی ہے، بعد میں یورپ نے مذہبی تعصب سے آزاد ہونے کا اعلان اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ بھی مسلمانوں کی طرح سیرت رسولؐ کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے، اٹھارہویں صدی میں کچھ مغربی اہل قلم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو مجروح کرنے سے پرہیز کیا، اور آپ کے معاملہ میں عدل و انصاف کا رویہ اختیار کیا، گو یہ عمل تا دیر قائم نہ رہ سکا، ان لوگوں نے یہ اعتراف کیا ہے کہ اکثر مستشرقین کا یہ عام شیوہ ہے کہ وہ حقیقت پر پردہ ڈال کر اسلام کے حقیقی چہرہ کو داغدار اور مسخ کرتے رہے ہیں، مستشرق گلیوم بوسٹل نے سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مسیحی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا، میشل بوڈیہ نے کلیسا کے مصادر سے اپنی معلومات کو آب و رنگ بخشا، ہوٹیگر نے سیرت کو پیش کرتے وقت مسیحی مشنری کے فریضہ کو انجام دیا، کچھ لوگوں کی نظر انتخاب میں صرف وہی واقعات آسکے جن میں ان کے لئے طنز و تشنیع کی گنجائش تھی، مزید براں انھوں نے ان میں اپنی جانب سے بہت کچھ مضحک اور بے سروپا واقعات بھی شامل کر دیئے، جن آیتوں میں مسیحیت کا ذکر تھا، ان پر خصوصی توجہ دی گئی، اور انجیل و قرآن کے مابہ الاختلاف واقعات کو بیان کر کے قرآن مجید کی حقانیت پر تمسخر کیا گیا، اس طرح وہ علمی سنجیدگی کے دعووں کے باوجود صلیبی شر انگیزی کی روش پر ہی قائم رہے۔

ان مستشرقین کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے چند واقعات کے متعلق سب کے خیالات

یکساں ہیں، مثلاً بحیرا راہب، ورقہ بن نوفل اور قس بن ساعدہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کا ذکر کرکے سب عجب اور دور ازکار نتائج اخذ کرتے ہیں، یہ لوگ بحیرا راہب سے آپؐ کے ایک مدت تک دینی تعلیم اخذ کرنے کا ذکر کرتے ہیں حالانکہ اس حقیقت سے یہ واقف نہیں ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بحیرا راہب سے دس گیارہ سال کی عمر میں ملے تھے، اور یہ سن وسال ایسا نہیں ہے کہ اس میں آپ کوئی تعلیم حاصل کرتے۔ چہ جائے کہ دینی مسائل کا استیعاب استقصا کرتے، پھر آپؐ کی ان سے ملاقات صرف ایک بار ابو طالب کی موجودگی میں ہوئی تھی۔ عقل محو تماشا ہے کہ صرف اس تھوڑے سے وقت میں بحیرا نے ایک بچہ کو کیسے اس قدر فیضیاب کیا، اور آپؐ نے کس طرح ان تعلیمات کو بالاستیعاب یاد داشت میں محفوظ رکھ کر تقریباً تیس برس کے بعد اپنی رسالت کی صورت میں پیش کیا، لیکن مستشرقین کے علمی ذوق کو اس سے کیا سروکار، انھیں تو محض بہتان تراشی کرنی تھی، ورقہ بن نوفل کو یہ لوگ نصرانیت کے ایک داعی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، حالانکہ ورقہ ایک موحّد شخص تھے، اور انھوں نے اس کی خبر دی تھی کہ آپ وہی ہیں، جن کی بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اخذ واستفادہ کیا ہوتا تو مشرکین مکہ ہی نہیں بلکہ تمام لوگوں میں ضرور یہ خبر عام ہوتی، جو ان کے حق میں ایک عمدہ حربہ ہوتی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو مجروح کرنے اور آپ کی عالمگیر اور دائمی رسالت میں شک وشبہہ پیدا کرنے کے لئے ان مستشرقین کا ایک خاص اور اہم اعتراض یہ ہے کہ آپؐ نے متعدد شادیاں کی تھیں، اس سے وہ آپ کے جنسی پہلو اور شہوت رانی کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں، لیکن مادہ پرست یورپ کے یہ دانشور اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ آپ کی متعدد بیویاں اس وقت تھیں، جب آپ کا سن پچاس برس سے بھی تجاوز کر چکا تھا، علاوہ ازیں آپؐ نے تبلیغی ودعوتی مصالح کے پیش نظر کئی شادیاں کی تھیں، ورنہ آپ کی جوانی کی عمر کا بڑا حصہ ایک ہی حرم کے ساتھ گزرا۔

اسی طرح مستشرقین نے وحی کو بھی اپنا تختۂ مشق بنایا ہے، وہ اسے آپؐ کی نفسیاتی وعقلی کمزوری اور بیماری کا نام دیتے ہیں، خالص مادہ پرست ہونے کی بنا پر یہ لوگ وحی کی حقیقت کے فہم وادراک سے عاجز وقاصر ہیں، وحی کی کیفیات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حامل وحی حضرت جبرئیلؑ کے تعلقات کی نوعیت کو یہ لوگ نہیں سمجھ سکے اور نہ ان حدیثوں کے مفہوم سے آگاہ ہوسکے جن میں حالات وکیفیات وحی بیان ہوئی ہیں، اس لئے انھوں نے اس کی نہایت غلط توجیہ کی ہے۔

کچھ مستشرقین اس نرم لہجہ سے اپنی بات شروع کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کے تقاضوں اور اپنے احول

کے چیلنجوں کی نباضی کی اور ان میں اصلاح و درستی کی سعی بھی کی۔ گویا آپؐ کی حیثیت دنیا کے عام مصلحین اور لیڈروں کی طرح ایک مصلح، انقلابِ حریت کے علمبردار اور معاشرتی، سماجی و اجتماعی انصاف کے داعی کی ہے۔ اور آپ صرف ایک ریفارمر تھے، اس قسم کی رائے زنی کا اصل سبب یہ ہے کہ ان لوگوں نے وحی اور پیغام الٰہی کی کنہ و کیفیت سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی، یا کی تو وہ اس میں عاجز و قاصر رہے، اس کے علاوہ بعض دوسرے اسباب بھی غلط فہمی کا باعث بنے ہیں، جن کا اجمالی ذکر اوپر ہو چکا ہے، یعنی نصوص اور اصل عبارتوں میں تحریف، مذہبی تعصب، اسلام اور مسلمانوں سے کد و عناد اور اپنی مرضی کے مطابق تشریح و تفسیر، اور دیدہ و دانستہ حق سے چشم پوشی۔ فریب اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی عادت وغیرہ۔ مارگولیوتھ نے سیرت رسولؐ پر ایک ضخیم کتاب لکھی، جس میں محققین نے بہت زیادہ غلطیوں کی نشاندہی کرکے ان کی اصل وجہ یہ بیان کی ہے کہ مارگولیوتھ واقعات کی تعبیر اپنی مرضی سے کرتے ہیں، غلط مفروضے قائم کرتے ہیں، اس کے علاوہ انھیں عربی زبان کا ناکافی علم تھا، لامانس نے خاص طور پر تحریف نصوص کے عمل کو اپنایا ہے، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ پیدائش تک میں تحریف کر ڈالی ہے، اور بلا کسی مستند تاریخی ثبوت کے حضرت فاطمہ زہرا کی پاک سیرت کو بھی عیب دار بنانے کی کوشش کی ہے، اسی لئے ان کا علمی مقام اب خود مستشرقین کی نگاہ میں ساقط ہو چکا ہے، اور انھوں نے ان کی مضحک غلطیاں پیش کرکے ان کی بے اعتبار تحریروں سے محتاط رہنے کی تلقین کی ہے۔

محمد کامل عیاد کا بیان ہے کہ مستشرقین کی اکثریت محض اپنے مذہبی تعصب کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کی قدر و قیمت پہچاننے سے قاصر رہی ہے، ان میں ایک قلیل تعداد ایسے لوگوں کی ضرور ہے جو مذہبی تعصب کی عینک سے واقعات کو نہیں دیکھتی ہے، لیکن وہ بھی اپنے نظریۂ تاریخ میں اس حد تک مبالغہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے سیرتِ رسولؐ کی روشن اور شفاف تصویر غبار آلودہ ہو جاتی ہے۔

ایک مستشرق زیڈ۔ ایف برڈلی ہیں، جن کی تصنیف سیرتِ رسولؐ کا ترجمہ عربی میں بھی ہوا ہے، یہ کتاب بھی غلط و اوہام سے پُر ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بتوں کی عبادت کرتے تھے، اور آپؐ کے حصہ میں ان بنی ہاشم کی وراثت آئی تھی جو کعبہ کے بتوں کے محافظ تھے، آپؐ نے اپنے دور دراز کے متعدد سفروں میں راہبوں سے اور سوق عکاظ میں واعظوں سے مواد و معلومات فراہم کیں، برڈلی نے بحیرا راہب اور ورقہ بن نوفل وغیرہ سے بھی آپ کے متاثر ہونے کا ذکر کیا ہے، اور ازواج مطہراتؓ کے باب میں بھی داد تحقیق دی ہے، ان کا دعویٰ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شام، یمن، فلسطین

ایران اور ایشیائے کوچک کی سیاحت کی، خدا جانے وہ کون سے تاریخی حوالے ہیں جن کی بنیاد پر بوڈلی نے آپ کے کثرت سفر کا ذکر کیا ہے، جب کہ مؤرخین کا اتفاق ہے کہ آپ نے دو یا تین بار صرف شام کا سفر کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مستشرقین کی کتابوں کے ایڈیشن ضرور نئے ہوتے ہیں، لیکن ان کے مضامین کی فرسودگی اور پامالی میں فرق نہیں آتا، نومسلم مستشرق ایتان ڈینیہ نے اسی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ مستشرقین تقریباً تین چوتھائی صدی تک اس کوشش اور بحث وتحقیق میں لگے رہے کہ کچھ ایسے نازک اور دقیق گوشے دریافت کرلیں جن سے جمہور مسلمانوں کے متفق علیہ ذخیرۂ سیرت کو مسمار کر دیں، مگر وہ آج تک ایک نئی بات بھی دریافت کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے، بلکہ اگر ہم پورے یورپ کے مستشرقین کے کارناموں کا بنظر غائر جائزہ لیں تو سوائے غلطیوں اور غلط بیانیوں کے کچھ بھی نظر نہیں آئیگا البتہ یہ حقیقت سامنے آئے گی، کہ ان لوگوں نے اپنی ساری کوشش وکاوش اس میں صرف کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو مسخ کر دیا جائے، اس کے لئے انھوں نے غیر مستند اور موضوع حدیثوں سے بھی مدد لی ہے، اور مستند واقعات وروایات کی ایسی توجیہ کی ہے، جن سے خلاف واقعہ اور غلط نتائج نکلتے ہیں، اسی طرح مشکوک ومشتبہ روایتوں اور محدثین کے ضعیف ومرجوح اقوال کو اچھالنے کی کوشش کی ہے، یا حدیثوں کے بعض اجزا نکال کر انھیں دوسرے رنگ میں پیش کیا ہے، جیسا کہ مارگولیوتھ نے ایک روایت کے اس جز یعنی انما حبب الی فی دنیاکم الطیب والنساء (تمہاری دنیا میں خوشبو اور عورتیں میرے لئے محبوب بنائی گئی ہیں) تو بیان کر دیا لیکن حدیث کے دوسرے حصہ وجعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ (اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے) کو حذف کر دیا، تاکہ یہ ظاہر ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا پر کس قدر فریفتہ تھے۔

(معارف ستمبر سنہ ۱۹۸۳ء)
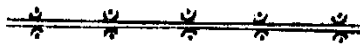
ہمارے عصری تعلیمی اداروں پر مستشرقین کے اعتراضات

از
مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھیؒ (دہلی)

مستشرقین کے نام سے یورپ اور امریکہ کے جن دانشوروں کو یاد کیا جاتا ہے ان کے متعلق مختلف رائیں ظاہر کی جاتی ہیں، کہا جاتا ہے، کہ یہ جماعت علوم وفنون کے شائقین کی ہے، سترہویں صدی عیسوی میں جب یورپ قرون مظلمہ کی تاریکی سے باہر آیا، اسلامی ممالک خصوصاً اندلس کے علمی خزانوں کے جواہرات اس کے قبضہ میں آئے، اور وہاں علم کی روشنی پھیلنی شروع ہوئی تو یہ اس کی طرف لپکے، ان میں سے ایک جماعت نے علوم اسلامی کو اپنا موضوع بنایا، تفسیر وحدیث وسیرت سے متعلق نایاب کتابوں کو جاں فشانی اور دیدہ ریزی کے ساتھ ایڈٹ کیا، شوق ومحنت کے ساتھ مغربی زبانوں میں ان کے ترجمے کئے، اور ان کو زیور طبع سے آراستہ کرا کر مشرق ومغرب میں پھیلایا۔

جس طرح ریگستان میں بھٹکنے والا قافلہ آب سرد وشیریں کا چشمہ پا کر اس پر ٹوٹ پڑتا ہے، یہ تشنگانِ علم اسی طرح ان علوم پر ٹوٹے، اور انھوں نے اپنی علمی پیاس بھی بجھائی، اور دوسرے کو بھی سیراب کیا، مسند امام احمد بن حنبل اور طبقات ابن سعد کی تدوین وطباعت کے سلسلہ میں مارگولیتھ اور پروفیسر سخاؤ قابل تشکر ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ وہ دانشور ہیں جنھوں نے ایشیا اور افریقہ پر مغربی اقوام کے اقتدار حاصل کرنے کے بعد ان پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے ایشیائی اور اسلامی علوم وفنون کی طرف توجہ کی، جیسا کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں ہوا کہ ۱۷۸۴ء میں کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی اور فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا۔ اور دہلی میں انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں دہلی کالج اور اس سے متعلق دار الترجمہ کی تاسیس کی گئی، جہاں ایک طرف انگریزی حکومت کی مشینری کے لئے ہندوستانی پرزے ڈھالے گئے، تو دوسری طرف نو وارد مغربی حاکموں کو اپنی مشرقی رعایا کی زبان، تاریخ وتمدن وتہذیب سے روشناس کرانے کا سامان کیا گیا۔

مستشرقین کی فہرست بہت طویل ہے۔ مولانا شبلی نعمانیؒ نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب سیرۃ النبیؐ کے حصہ اول کے مقدمہ میں بہت سے نام گنائے ہیں۔ اور اب نصف صدی گزرنے کے بعد، ان میں خاصہ اضافہ ہوچکا ہے، اس لئے سب کے متعلق کوئی ایک حکم لگانا انصاف سے بعید ہے، تاہم یہ حقیقت ناقابل انکار ہے، کہ ان میں بہت بڑی تعداد ان متعصب مصنفوں اور پادریوں کی ہے، جنھوں نے فلسطین کے میدان میں مجاہدین اسلام کے ہاتھوں، ممالک یورپ کے مشترکہ عیسائی لشکروں کے شکست کھانے کے بعد محاذ جنگ تبدیل کیا، اور اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف قلمی جنگ شروع کی اور ان کیلئے روئے روشن پر ایسی کیچڑ اچھالی کہ انسانیت و شرافت کا سر شرم و ندامت سے جھک گیا، اسی مقصد کو منظم طریقے پر پورا کرنے کے لئے بعد میں انھوں نے یورپ، امریکہ اور کینیڈا میں تحقیقات علوم اسلامی کے نام سے ادارے قائم کئے، اب زمانہ کے حالات بدل گئے ہیں، اس لئے طریقۂ جنگ بھی بدل گیا ہے، اب پیغمبر اسلامؐ اور تعلیمات اسلام پر جو کتابیں اور مضامین شائع کئے جارہے ہیں، ان کا انداز مناظرانہ نہیں بلکہ محققانہ اور غیر جانبدارانہ اور نئی اصطلاح کے مطابق معروضی ہوتا ہے، مگر اس میں دودھ کے گلاس میں زہر اس خوبی سے ملاتے ہیں کہ پینے والے کو احساس تک نہیں ہوتا اور اندر ہی اندر ایمان و یقین کی آنتیں کاٹ دیتا ہے۔

"معروضی مطالعۂ قرآن" کا مطلب جیسا کہ بتایا جاتا ہے، یہ ہے کہ قرآن کا مطالعہ صرف ایک کتاب کی حیثیت سے کیا جائے، اور اس امر کو نظر انداز کر دیا جائے کہ وہ کس کی ہے اور اس کا مقصد کیا ہے، گویا شروع ہی میں قرآن کے کتاب اللہ ہونے کی نفی کر دی جائے، اور ایمان کی بنیاد ہی کو منہدم کر دیا جائے، حالانکہ قرآن کریم وہ صحیفۂ ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی رہنمائی کے لئے نازل کیا گیا ہے، اس سے استفادہ کی شرط اول یہ ہے کہ اس کے منزل من اللہ ہونے پر یقین ہو۔ دل میں اس کی پوری عظمت و حرمت ہو، اس سے ہدایت طلبی کا جذبۂ کامل ہو، پھر آئینۂ دل گناہوں کے زنگ سے پاک صاف ہو تاکہ اس میں ہدایت ربانی کی کرنیں جلوہ گر ہوسکیں۔ یہ شرائط جس درجہ میں پائی جائیں گی اسی درجہ میں ہدایت قرآنی سے استفادہ ہوسکے گا اور حکمت قرآنی کے خزانہ سے دامان طلب کو بھرا جاسکے گا۔

قرآن کریم میں شروع ہی میں واضح کر دیا گیا ہے کہ ذَالِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ. هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ کہ یہ کتاب ایسی کتاب ہے، کہ جس کے منزل من اللہ ہونے میں، اور دین و دنیا کی صلاح و فلاح کا سرچشمہ ہونے میں

کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، یہ شمع ہدایت ہے، مگر ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ رکھتے ہیں، تقویٰ نفس انسانی کی وہ کیفیت ہے
جو اسے اللہ سے ڈرنے اور اس کی نافرمانی سے بچنے پر آمادہ کرے" ہدایت قرآنی کا حصول اسی پر موقوف ہے، اس کے بہت سے
درجات ہیں، جس درجہ کا تقویٰ ہوگا اسی درجہ کی ہدایت حاصل ہو سکے گی۔

خوف خدا اور اللہ کی نافرمانی سے احتراز تو بعد کی بات ہے، جب ان کی بنیاد ایمان باللہ ہی نہیں، تو خواہ قرآن کریم کی
الفاظ کی تحقیق میں ہزاروں صفحات سیاہ کر دیئے جائیں، اور قرآن کریم کی آیات کی ترتیب و تبویب میں جلدیں کی جلدیں تیار کر دی
جائیں ہدایت ربانی اور حکمت قرآنی کی روشنی سے دل و دماغ منور نہ ہو سکیں گے۔
ان لوگوں کا حصہ قرآن کریم جیسی کتاب ہدایت میں سے بھی بجز ضلالت و شقاوت، گمراہی و حیرانی کے کچھ نہیں، چنانچہ

ارشاد ربانی ہے کہ

يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَّيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا وَمَا
يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ

اس قرآن کریم سے، اللہ تعالیٰ بہت سے لوگوں کو
گمراہ کرتا ہے، اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے، اور گمراہ
فاسقوں کو ہی کرتا ہے۔

حدیث میں بھی فرمایا گیا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الكتاب اقواما
ويضع به آخرين

اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعہ کچھ قوموں کو بلند
کرتا ہے، اور کچھ کو گراتا ہے۔

بہر حال ہمارے ان مستشرقین کے شوق و محنت کی آپ داد دے سکتے ہیں، ان کے شاندار اداروں کی جہاں یہ بڑے
بڑے وظیفے دیکر مسلمان طلبہ کا شکار کرتے ہیں، ان کی ضخیم اور خوبصورت کتابوں کی جن کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے
آپ تعریف کر سکتے ہیں، مگر اسلام کی حقیقت اور قرآن کی حکمت کے انوار سے ان کے کارخانوں کو کیا تعلق، مجھے اس وقت
ایک واقعہ یاد آگیا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی طلائی جبلی بڑی شان و شوکت کے ساتھ منائی گئی، اس موقع پر مدارس اسلامیہ کی ایک
کانفرنس بھی منعقد ہوئی تھی، اس کے پہلے اجلاس کی صدارت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نے فرمائی تھی،
اور دوسرے اجلاس کی علامہ سید سلیمان ندوی نے کی، میں ایک طالب علم کی حیثیت سے حضرت مدنی کے ساتھ تھا، مولانا

ابوبکر شیث ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی اس اجلاس کے صدر استقبالیہ تھے، حضرت مولانا ابوبکرؒ نے حضرت مولانا مدنیؒ کا خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ :-

"الفاظ قرآن وحدیث کی تحقیق میں، خواہ یورپ اور امریکہ کے دانشور کتابوں کے انبار لگادیں، مگر معانی ومطالب کتاب وسنت کی تحقیق کے لئے ہمیں آپ جیسے علمائے اعلام کے سامنے ہی زانوئے ادب تہ کرنا پڑے گا۔"

بہر حال یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ علوم اسلامیہ کی تعلیم وتحقیق کے سلسلہ میں، یورپ، امریکہ اور کینیڈا کے اسلامیات کے ادارے، کھوٹے سکوں کی ٹکسال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، مگر ہماری انتہائی محرومی اور نادانی ہے کہ ہمارے ہندوستان کے اسلامی عصری تعلیمی اداروں میں وہاں کے ڈھلے ہوئے سکوں کو زر خالص سمجھ کر قبول کیا جارہا ہے۔

ہندوستان میں تین یونیورسٹیاں ہیں جن کا خصوصی تعلق مسلمانوں سے رہا ہے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، مسلم یونیورسٹی، تمام دنیا میں ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی مرکز کی حیثیت سے شہرت رکھتی ہے، اور مسرت ہے کہ ہندوستان کی پارلیمنٹ نے بھی اس کی اس حیثیت کو قانونی طور پر تسلیم کرلیا ہے،

سرسید احمد خاں مرحوم نے اینگلو محمڈن کالج کی حیثیت سے اس کی بنیاد ڈالی تو مقصد یہ قرار دیا کہ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پہ۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے انھوں نے شروع ہی میں شعبۂ دینیات قائم کیا جس میں مولانا عبداللہ انصاری، مولانا سلیمان اشرف، مولانا ابوبکر شیث رحمہم اللہ اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی جیسے علماء راسخین شامل رہے۔

۱۹۲۰ء میں انگریزی حکومت کے اثرات سے آزاد ایک اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے محسوس کی تو جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ نے انتہائی ضعف ونقاہت میں اس کا افتتاح اس امید سے کیا کہ ملت اسلامیہ کے جس درد وغم سے ان کی ہڈیاں گھل رہی ہیں، یہ اس کا مداوا ہوگی۔" اپنے استاد کی اسی آرزو کی تکمیل کے لئے حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے وہاں بیت الحکمۃ قائم کیا، اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کے فلسفۂ اسلام کا درس دیا جس میں مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین پابندی کے ساتھ شریک ہوتے رہے، ڈاکٹر صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ "ان کی خواہش ہے کہ انگریزی اور اردو ادب کے لئے ایسی کتابیں

تیار کی جائیں جن میں اسلامی عقائد و تعلیمات کو سمویا گیا ہو، تاکہ طلبہ اسلامی رنگ میں پوری طرح رنگے جا سکیں۔"

یہاں بھی علی گڑھ سے بھی زیادہ اہمیت کے ساتھ شعبۂ دینیات قائم رہا جس میں مولانا عبدالحی فاروقی، مولانا محمد سورتی اور مولانا محمد اسلم جیراج پوری جیسے فضلاء، قرآن کریم، حدیث شریف اور ادب عربی کا درس دیتے رہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی کو بھی اس حیثیت سے اسلامی یونیورسٹی کہا جا سکتا ہے، کہ یہ ایک مسلم ریاست کے زیر سایہ قائم ہوئی اس میں شروع ہی سے بڑے اہتمام سے شعبۂ دینیات قائم کیا گیا، جس میں مولانا مناظر احسن گیلانی جیسے فضلاء نے علوم اسلامی کی نشر و اشاعت کی اور ڈاکٹر حمید اللہ جیسے فاضل شاگرد پیدا ہوئے،

اب بھی مسلم یونیورسٹی کا شعبۂ دینیات قائم ہے، مگر اس کی حیثیت کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے، باقی دونوں یونیورسٹیوں میں شعبۂ دینیات کو ختم کر دیا گیا ہے اور اس کے بجائے اسلامک اسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ قائم کر دیا گیا ہے۔

ان شعبوں میں عمل دخل زیادہ تر مستشرقین یورپ و امریکہ کے لائق شاگردوں کا ہے۔ نصاب تعلیم سے قرآن و حدیث کے متون کو خارج کرنے کے بعد صرف علومِ اسلامی کی تاریخ اور ان کی تنقید پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ نصابی کتابیں زیادہ تر انہی مستشرقین کے نتائج افکار ہیں، جن میں اسلام کو مغربی لباس میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور تحقیق و تنقید کے نام پر، مفسرین و محدثین و فقہاء و صوفیہ کے افکار و کردار کو مجروح و مشتبہ بنایا جاتا ہے، تاکہ وہ ستون ہی گرا دیئے جائیں جن پر اسلام کی عظیم و رفیع عمارت قائم ہے، اس صورت حال کا نتیجہ واضح ہے، جب اساتذۂ کرام کا یہ حال ہو تو غریب طلبہ کا علمی و عملی حیثیت سے جو حال ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔

گر ہمیں مکتب است و ہمیں ملا | کار طفلاں تمام خواہد شد

یہی صورت حال کم و بیش ہندوستان کے علاوہ پاکستان، مصر و شام وغیرہ میں بھی ہو سکتی ہے، اگر وہاں کسی بھی وقت رائے عامہ کو منظم کر کے طاقت کے ذریعہ ان حالات کو بدلا جا سکتا ہے، مگر ہندوستان کے مسلمان ایسا نہیں کر سکتے، تاہم وہ ایک ایسے ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے جہاں ان کو اپنی تہذیب اپنا تمدن اور اپنے علوم کو باقی رکھنے کا بلکہ ان کو پروان چڑھانے کا دستوری حق دیا گیا ہے، اپنی آواز بلند کر سکتے ہیں، اور اپنی ملی و دینی درسگاہوں کو، جن کو اکابر بزرگوں نے خون جگر سے سینچ کر پروان چڑھایا ہے، برباد ہونے سے بچانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

ملے مقالہ کے خاتمہ کے بعد جامعہ طبیہ اسلامیہ کے ڈاکٹر شیر الحق نے اس پر کافی روشنی ڈالی۔

(۲)

مستشرقین اور تاریخ ترکی

از

ڈاکٹر اکمل ایوبی۔ ادارۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

"ترکوں کے خلاف مستشرقین نے جو علمی مہم چلائی ہے، اس مقالہ سے اس کا اندازہ ہوگا"۔ (مرتب)

مستشرقین نے اسلام اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کو براہ راست مجروح کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اسلامی دنیا کے اتحاد اور یک جہتی کو کمزور کرنے کے لیے بالواسطہ طریقوں سے بھی کام لیا ہے، اس سلسلے میں انھوں نے ان ترکوں کو آلۂ کار بنانے کی کامیاب کوشش کی، جنھوں نے صدیوں تک اسلام کا جھنڈا بلند رکھا، خانۂ کعبہ کے پاسبان بنے، اسلامی سطوت کا نشان رہے، اور شوکت اسلامی کے نقیب کے فرائض بھی انجام دیئے، جہاں تک ترکوں کی قدیم تاریخ کا تعلق ہے، وہ ماضی کے پردے میں چھپی ہوئی ہے، چینی ماخذوں کی رو سے ترکوں کا وجود ۱۳۰۰ق م تک ملتا ہے، دوسری صدی قبل مسیح میں ان کے مختلف قبیلے چین کی شمالی سرحد پر لوٹ مار کیا کرتے تھے، لیکن چھٹی صدی عیسوی میں ان کا دائرہ اتنا وسیع ہوا کہ مشرقی اور وسطیٰ ایشیا ان کی تگ و دو کے میدان بن گئے، اسی صدی میں ترکوں نے ایک طاقتور سلطنت بھی قائم کر لی تھی جو منگولیا اور چین کی شمالی سرحد سے لے کر بحر اسود تک پھیلی ہوئی تھی، لیکن ان کے مختلف قبائل وقتاً فوقتاً مغربی ایشیا اور مشرقی یورپ کی آبادیوں پر بھی حملہ کرتے رہے، ان قبائل میں کسی طرح کا قومی یا نسلی احساس موجود نہ تھا، اور نہ ان کی کوئی مشترک زبان تھی، ترکی زبان کے ساتھ ہی ساتھ یورپی ایرانی اور منگولی زبانیں بھی ان کے جرگوں میں بولی جاتی تھیں، ان کا ابتدائی مسلک آسمان پرستی یا آتش پرستی تھا لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے سامانیت، بدھ مت اور عیسائیت کو اپنایا لیکن آخر میں انھوں نے مذہب اسلام اختیار کیا۔ اسلام کے حلقہ بگوش ہونے اور مسلم علاقوں میں ہجرت کرنے کی وجہ سے ترکوں نے اپنی مادری زبان میں تبدیلی کی اور اپنے مخصوص قدیم رسم الخط کو تبدیل کر کے عربی رسم الخط اپنایا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اپنے تمدن، معاشرت، سماج اخلاق، ادب اور زبان پر اسلامی تہذیب و تمدن کا بہت گہرا اثر پڑا۔ اور جب خود ان کی حکومتیں ایشیا اور یورپ میں قائم ہوئیں تو یہ قوم اسلامی شوکت و طاقت کی علمبردار بن گئی، اور ان علاقوں میں اسلامی تمدن کے بیج ہی نہیں بوئے

بلکہ ان علاقوں کو پوری طرح اسلامی رنگ میں رنگ دیا، جہاں مسلمان ہزار کوششوں کے باوجود اپنے قدم نہیں جما پائے تھے، اس وقت ترک نام ہی ہیبت پیدا کر دینے کے لئے کافی تھا، اور انھیں شکست دینا یا ان کی قوت کو تباہ کرنا ایک ناممکن امر سمجھا جاتا تھا، اسی ہیبت کی وجہ سے فتح قسطنطنیہ کے تقریباً دو سو سال کے بعد بھی ایک فرانسیسی مصنف (GuiLLET) نے ۱۶۸۱ء میں اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ ہر عیسائی کو ہمیشہ یہ دعا کرتے رہنا چاہئے کہ خدا پھر کوئی سلطان محمد ثانی نہ پیدا کرے، جس نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے سلطان فاتح کا لقب پایا تھا، اس وقت ترکوں کے فتح وظفر کا سیلاب آگے بڑھتا گیا، یہاں تک کہ اس نے اسٹریا کو تاخت وتاراج کر دیا اور اس طرح اگر ایک طرف اندلس مسلمانوں کے قبضہ سے نکلا تو دوسری طرف اس زمانہ میں ترکوں نے اپنی فتوحات سے اسکی بخوبی تلافی کر دینے کے بعد ترک یعنی یورپ کا نیا دشمن دیانا کے دروازوں بحیرۂ اوقیانوس اور بحیرۂ اسود کے شمالی سواحل تک پہنچ گیا، اور فتح مصر کے بعد ترکوں کے کلاہ تفاخر میں خادم الحرمین الشریفین کا طرۂ امتیاز بھی لگ گیا۔

ترکوں نے اپنی قومیت کی طرف سے ہمیشہ بیگانگی برتی تھی، وہ اپنے آپ کو مسلمان قوم تصور کرتے تھے، مستشرقین نے اسی رگ کو مضبوطی سے پکڑا اور اسلامی اتحاد کو ضرب لگانے کی غرض سے ترکوں کو ان کی اس اصل قومیت کا احساس دلانے میں لگ گئے، جس کا دار و مدار نسل اور مادری زبان پر ہے۔ اس کی تکمیل کی غرض سے ایک فرانسیسی مستشرق Goseph De Guignes نے آٹھویں صدی کے وسط میں ایک ذہنی خاکہ بنایا اور عملی شکل دینے کے لئے ترکوں کی قدیم تاریخ لکھی، اور ان کے ان کارناموں کو شاندار الفاظ میں پیش کیا جو ترکوں نے اسلام قبول کرنے سے پہلے انجام دیئے تھے، اس مستشرق کی یہ کتاب علمی اور تحقیقی ضرورت ہے، لیکن اس نے قدیم غیر اسلامی ترکی تہذیب کے احیاء کی دعوت اس لئے دی کہ ترکوں کے اسلامی معاشرہ میں انتشار پیدا ہو، اس کا مقصد ترکوں کا تعلق غیر مسلم ترکوں سے قائم کرنا تھا، اور ان کو یہ بتانا مقصود تھا، کہ وہ صرف مسلمان نہیں ہیں بلکہ ترک بھی ہیں، یا یوں کہیئے کہ وہ ترک پہلے ہیں اور مسلمان بعد میں اور ان کا غیر اسلامی دور بہت شاندار رہا ہے، اسی مقصد کے حصول کے لئے جوسف وان ہمر، ڈیمبری، راڈلوف اور جاہون نے اپنی تصانیف کے ذریعہ کوشش کی، ہیو درتھ، سر جیمس ولیم ریڈ ہاؤس اور ایاس جون دلکس گب کی تصانیف بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں، اسی نقطۂ نظر سے ارتھر لملی ڈیوڈس نے بھی اپنی کتاب A grammar of The Turkian Language لکھی جو ۱۸۳۲ء میں لندن سے شائع ہوئی، یوں تو ڈیوڈس کی کتاب

ترکی قواعد سے متعلق ہے، لیکن مصنف نے اس کتاب میں ایک طویل مقدمہ بھی شامل کیا ہے جس میں ترکوں کی قدیم ترین تاریخ کو بہت نمایاں انداز سے پیش کیا گیا ہے، اور ان کے کارناموں کو خود ترکوں کو بتلانے کی کوشش کی گئی ہے، ترک ابھی تک اپنی تاریخ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع کرتے تھے، اور خلفائے راشدینؓ بنوامیہ اور عباسی دور کو اپنی ہی تاریخ کے ابواب تصور کرتے تھے، لیکن مستشرقین نے یہ کوشش کی کہ ترک اپنی قدیم تاریخ اور اسلام سے پہلے کی داستان سُنکر خوش ہوں اور ان میں اس پر فخر کرنے کا شوق پیدا ہو، تاکہ رفتہ رفتہ مذہبی احساس اور اسلامی اخوت کے بدلے ان میں نسلی تاثرات فروغ پاجائیں اور اسلامی اتحاد کو ضرب لگے اور ترکوں کی قومیت کا دار و مدار مذہب کے بجائے ترکی نسل پر قائم ہوجائے، ان مستشرقین کا اصل مقصد ترکوں کے اسلامی ذہن کو بدلنا، اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنا اور اسلامی تہذیب کو نقصان پہنچانا تھا، ان کو اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی اور ان کی تحریروں سے متاثر ہوکر ترکوں کا ایک حلقہ ان کا ہمنوا بن گیا یہ حلقہ ان ہی مستشرقین کے زیر اثر برابر فروغ پاتا رہا، ان کے مستقل داعی پیدا ہوتے گئے، اور ان ہی کے ترک شاگردوں میں سے مصطفےٰ جلال الدین پاشا، احمد جودت پاشا، شمس الدین شامی، احمد مدحت، نجیب عاصم، بورصالی طاہر، احمد حلمی سلیمان پاشا، محمد مراد، علی توفیق جیسے مصنفین ایک ذہنی انقلاب برپا کرنے میں لگ گئے، اس انقلاب کا رخ ترکوں کے فلسفی ضیا گوک آلپ نے باضابطہ ترکیت کی طرف موڑا جس کی وجہ سے ترکوں کا لگاؤ اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن سے کسی حد تک کم ہوا، اور مصطفےٰ کمال اتاترک نے ”اپنے اصلاحی کارناموں“ کے ذریعہ سے ترکوں کا تعلق صرف مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن ہی سے نہیں بلکہ ان کا رشتہ اسلامی دنیا سے بھی منقطع کرنے کی کوشش کی، مستشرقین کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا، چنانچہ مغرب میں اتاترک کے ان کارناموں کا زور شور سے چرچا کیا گیا اور یہ ظاہر کیا گیا کہ ترکی میں انقلاب برپا ہوگیا ہے اور ترکوں نے اپنا رشتہ اسلام سے بالکل منقطع کرلیا ہے، اس خیال کی اشاعت ٹوائن بی، کرک ووڈ، ورتھم، ہنری ایلین، آرم اسٹرونگ، ہیری لیوک وغیرہ جیسے مصنفوں نے کی، ان نامور مصنفوں نے اتاترک کی سیاسی، اور قومی خدمات کے ساتھ ہی ساتھ اس کی بے دینی اور اس کی بے اعتدالی اور اس کی ناعاقبت اندیشی کو اس کا کارنامہ قرار دیا تھا، یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے، ان مصنفوں نے مسلمان ترکوں کی تاریخ لکھتے وقت تعصب سے کام لیکر علمی بددیانتی کا ثبوت دیا ہے، اور زہر آلود خیالات کا اظہار کیا ہے، ان مستشرقین کو ترکوں سے سخت دشمنی تھی، ان کی تحریریں کینہ پروری سے پُر ہیں، ان بیشتر تحریروں میں تبلیغی مشن کی روح کارفرما ہے، مگر جب مصطفےٰ کمال اتاترک نے خود مستشرقین کے مقاصد کی تکمیل کردی تو اس کی شان میں قصیدے

پڑھنا ان کا اخلاقی فرض بن گیا اور سب نے اپنی اپنی بساط کے مطابق اس کی تعریف کی، اس کو سرفروش مجاہد، پرجوش فدائی وطن وملت، قابل ترین سیاست داں، قوم کا مصلح اعظم، ملک وملت کی تعمیر کرنے والا معمار، عجائب روزگار، آزادی کا عاشق، مجاہد اعظم، شمع آزادی کا پروانہ، دل ودماغ اور روح تک کو آزاد کرانے والا انسان اور عظیم الشان جذبات کا نورانی پیکر کہا گیا، انگریزی مصنفین کی کتابیں ہم ہندوستانیوں کی معلومات کا ماخذ بھی ہیں، اس لئے واقعات کی حقیقی نوعیت اور صحیح صورت حال ہم پر واضح نہ ہو سکی، اور نہ ہی عام اور غیر سرکاری ترکوں کا نقطۂ نظر پوری وضاحت سے ہمارے سامنے آسکا، غالباً اسی وجہ سے ہندوستان میں مصطفےٰ کمال اتاترک سے ایک طرح کی خوش عقیدگی پائی گئی اور دینی حلقوں میں بھی اس پر تنقید گوارا نہیں کی گئی اور اس کے سیاسی اور قومی خدمات کی وجہ سے دین کے خلاف اس کے اقدامات کو بھی نظر انداز کر دیا گیا، اس لئے اب اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہمارے یہاں ایسا بھی علمی اور تحقیقی کام ہو، جس سے مصطفےٰ کمال اتاترک کی اصلاحات کے ساتھ ہی ساتھ اسلام سے ترکوں کی وفاداری کی تصویر بھی سامنے آجائے اور اس فرق کی وضاحت بھی ہو جائے جو حکومت کے مختصر محدود طبقے اور مسلمان ترک عوام کے درمیان پہلے بھی تھا، اور آج بھی موجود ہے۔

یورپی ممالک کو ترکوں سے سخت عداوت تھی چنانچہ مغربی اہل قلم حضرات نے بھی ترکوں کی تاریخ لکھتے وقت تعصب سے کام لیا ہے، اور ترکوں کے مذہب یعنی اسلام پر طعنہ زنی اور دیوانہ وار اعتراضات کئے ہیں، اس وقت ان کی تمام تصنیفات وتالیفات پر تبصرہ کرنا مشکل ہے، تاہم چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں، ایورسلی نے اپنی کتاب دی ٹرکش امپائر میں عثمانی سلطان بایزید یلدرم (۱۳۸۹ء۔ ۱۴۰۲ء) کے حالات زندگی (ص ۴۸) لکھتے وقت ایک ترکی کہاوت یا مقولہ کو قرآن کریم کی آیت قرار دے کر اسلام کا دشمن ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے، اصل واقعہ یہ ہے کہ امیر کرمانیہ علاء الدین مغربی ایشیا کے ترکوں کی سرداری کا خواہشمند تھا، اس لئے عثمانیوں سے اس کی عداوت تھی، وہ دولت عثمانیہ کو نقصان پہنچانے کی برابر کوشش کرتا رہا، اور متعدد بار عثمانی علاقوں پر حملے کئے، جن میں سخت مقابلے بھی ہوئے، ایک مقابلہ میں علاء الدین نے سلطان بایزید یلدرم کے سالار عسکر تیمور تاش کو گرفتار بھی کر لیا، یہ خبر سن کر یلدرم نے کرمانیوں پر حملہ کیا اور ان کو شکست دے کر اپنے سالار عسکر کو آزاد ہی نہیں کرایا بلکہ علاء الدین اور اس کے دو لڑکوں کو گرفتار بھی کر لیا، سلطان نے ان تینوں کو تیمور تاش کی حراست میں دے دیا، مگر اس نے بایزید یلدرم کی اجازت کے بغیر ہی تینوں کو پھانسی دیدی

یلدرم یہ سنکر بہت برہم ہوا اور رنجیدہ بھی، مگر وہ اس ترکی کہاوت یا مقولہ کو یاد کر کے خاموش ہوگیا کہ "ایک امیر کی موت اتنی بری نہیں ہے جتنا ایک صوبے کا نقصان"۔ ہمارے مستشرق ایورسلی نے اس ترکی کہاوت یا مقولہ کو قرآن کریم کی ایک آیت قرار دیتے ہوئے یہ تحریر فرمایا ہے کہ اس آیت کے بموجب یلدرم نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ کرمانیہ کی پوری ریاست پر قبضہ کر کے اسے عثمانی سلطنت میں شامل کر لیا جائے، یہ سفید جھوٹ قرآن کریم کی بے حرمتی اور اسلام سے دشمنی ہی کی وجہ سے تحریر کیا گیا ہے؛ اسی طرح ایورسلی ایک جگہ اور لکھتا ہے کہ مغربی ایشیا کے عیسائی ترکوں سے ڈر کر اسلام لائے تھے۔ اور ان کے اور ترکوں کے درمیان شادی بیاہ کے تعلقات قائم ہوگئے اور دونوں کے میل سے ایک نئی نسل تیار ہونے لگی، جو دوسری ریاستوں کے باشندوں سے بہت کچھ مختلف تھی، اور اپنے کو "عثمانی" کہتی تھی، اس بیان سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ صرف ایشیا کے پرانے عیسائی یعنی نومسلم اور مسلمان ترکوں کے درمیان شادیوں کے نتیجہ میں جو اولادیں ہوئیں وہ "عثمانی" کہلاتی تھیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو عثمانی سلطنت کا باشندہ تھا، عثمانی کہلاتا تھا، اس میں نسل، مذہب اور زبان کی تفریق نہیں تھی، اسی طرح اچ۔ اے گبنز نے اپنی کتاب دی فونڈیشن آف دی اوٹومن امپائر میں یہ تحقیق کسی ثبوت کے بغیر پیش کی ہے کہ عثمانی سلطنت کا پہلا تاجدار یعنی سلطان عثمان اور اس کے تمام ساتھی بت پرست تھے۔ جو بعد میں مسلمان ہوئے ہیں۔ اس مصنف نے عثمان کی فاتحانہ سرگرمیوں کے متعلق یہ بھی لکھا ہے۔ کہ یہ سلاجقہ، قونیہ کے خاتمہ کا نہیں بلکہ اس تبدیلی مذہب ہی کا نتیجہ تھا کہ ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) کے بعد عثمان کی فاتحانہ سرگرمیاں شروع ہوگئیں، جب کہ اس سے قبل سغوت کی زندگی کے پچاس سال ان سرگرمیوں سے خالی تھے۔ اس نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ "عثمانی اسلام سے وابستہ ہیں۔ اور ان میں تبلیغی جوش ہے۔ یہ لوگ یونانیوں یعنی بازنطینیوں اور تاتاریوں دونوں کے یکساں دشمن ہیں"، مستشرقین نے سلطان عثمان کی ہمت، شجاعت اور اس کے عدل وانصاف کی خوب خوب تعریف کی ہے لیکن اس کے دامن پر خون کے دھبے بھی یہ کہہ کر لگا دینے کی کوشش کی ہے کہ اس نے اپنے ایک بے گناہ بوڑھے چچا کو قتل کر دیا تھا، جب کہ اس کے شواہد نہیں ملتے ہیں۔ اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ عثمانی ترکوں نے عیسائیوں کے نابالغ بچوں کو اسلامی تعلیمات دیکر اور ترکی زبان سکھا کر ایک ایسی زبردست فوج تیار کر لی تھی جس نے عثمانی فتوحات کی رفتار میں ایک سیلاب کی قوت پیدا کر دی تھی۔ وہ فوج اپنی نوعیت کے اعتبار سے نئی تھی، اس لئے ینی چری یعنی نئی فوج کہلائی۔ اس "ینی چری" لفظ کی شکل یورپی زبانوں میں کافی بگڑ گئی ہے۔ فارسی اور ہماری مادری اردو زبان میں بھی غلطی سے "جان نثاری"

ہوگیا ہے، بعض عربی کتابوں میں اسے "انکشاری" بھی لکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں صرف یہ بات قابل ذکر ہے کہ نیی چری کی بنیاد سلطان اورخان (۱۳۲۶ء ۔ ۱۳۵۹ء) کے دور حکومت میں رکھی گئی تھی اور سب سے پہلے ایک ہزار نوجوانوں کی فوج بنائی گئی تھی، مستشرقین نے لکھا ہے کہ سلطان اورخان نے ان تمام نوجوانوں کو جمع کیا اور حاجی بکتاش ولی نامی صوفی بزرگ کے سامنے پیش کیا جنھوں نے اس نئی فوج کی کامیابی کی دعا دی یہ واقعہ سراسر غلط ہے۔ کیونکہ حاجی بکتاش ولی نامی بزرگ سلطان عثمان کے دور میں تھے۔ اور تیرہویں صدی کے آخر میں ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ اور سلطان اورخان کے زمانہ میں ان کا وجود نہ تھا۔ میرے خیال سے "نیی چری" کو حاجی بکتاش ولی جیسے نامی صوفی سے منسوب کر دینے سے مستشرقین کا مقصد یہ ثابت کرنا رہا ہوگا کہ مسلمانوں کے صوفیوں نے بھی اسلام کو تلوار سے پھیلانے میں مدد دی ہے۔ اسی طرح مستشرقین نے سلطان عثمان کے جانشینوں کے محاسن کا اعتراف بہت کم کیا ہے۔ اور ان کی سنگ دلی اور نقص عہد کے متعدد جھوٹے واقعات بیان کئے ہیں۔ سلطان محمد نے قسطنطنیہ کی فتح کے روز جس رحمدلی اور رقیق القلبی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی مثال اس کے کسی ہمعصر نے پیش نہ کی۔ اس کے باوجود مستشرقین نے لکھا ہے کہ سلطان اور اس کے سپاہیوں نے بہت سے مظالم کئے اور یونانیوں کی پوری جماعت پر نہایت سخت مصیبت ٹوٹ پڑی ان ہی مستشرقین نے سلطان محمد فاتح کو دل کھول کر برا بھلا کہا ہے اور اس کو بدکار اور نفس پرست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اس سلسلے میں ڈیوک نوٹاراس اور اس کے لڑکوں کے قتل کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے اور اس کا یہ سبب بتایا گیا ہے کہ ڈیوک نوٹاراس نے اپنے لڑکوں کو سلطان محمد فاتح کی خلوت عیش میں بھیجنے سے انکار کر دیا تھا، جب کہ یہ قتل اس سازش کا نتیجہ تھا۔ جو ڈیوک نوٹاراس قسطنطنیہ کو ترکوں سے آزاد کرانے کے لئے اٹلی سے کر رہا تھا۔ اسی طرح سرجارج لارینٹ نے اپنی کتاب ٹرکی میں اسلام سے متعلق یہ بیان دیا ہے کہ وہ علم کی روشنی پھیلانے کا مخالف تھا۔ اور عثمانی ترکوں کی نسبت یہ کہا ہے کہ یہ قوم منظم جہالت کی دلدادہ تھی۔ اسی طرح کے بہت سے بیانات مستشرقین نے اسلام اور مسلمان ترکوں سے متعلق اپنی کتابوں میں درج کئے ہیں۔ اور حق اور سچائی کے بجائے تعصب اور تنگ نظری سے کام لیا ہے، انھوں نے ترکوں کی تاریخ لکھنے میں جس تعصب کا مظاہرہ کیا ہے اس کا اعتراف اب چند یورپین اسکالرس بھی کرنے لگے ہیں

ابھی رسالہ "اسلام اور عصر جدید" کی جلد ۱۴، شمارہ ۱ (بابت جنوری ۱۹۸۲ء) میں پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے برنارڈ لوئس کے ایک اس مقالہ کا ترجمہ شایع کیا ہے۔ جس کا عنوان "اسلام" ہے۔ یہ مقالہ جس کا انگریزی سے اردو ترجمہ جناب نذیر الدین مینائی صاحب نے کیا ہے۔ کافی پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ مگر بہت کم حضرات کی نظروں سے گزرا ہوگا۔ اس مقالہ میں برنارڈ لوئس نے خود اقرار کیا ہے کہ "یورپ میں لکھی گئی اسلامی تہذیب وتمدن سے متعلق کتابیں زیادہ تر ایسے حضرات نے لکھی ہیں جو اصل ماخذ کی زبان سے ناواقف تھے۔" اسی مقالے میں برنارڈ لوئس نے عثمان ترکوں کے متعلق تحریر کیا ہے کہ "یورپ میں مسلمانوں کی فتوحات میں دوررس اثرات کے اعتبار سے، عثمانی ترکوں کی فتوحات کو بہت اہمیت حاصل ہے عثمانی ترکوں کے حملوں اور فتوحات کا آغاز چودہویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے، عثمانی فتوحات نے یورپ کے بڑے حصے کو یونان، بلقان، ہنگری اور پولینڈ تک اسلامی حکومت کے زیرنگیں کرلیا۔" برنارڈ لوئس مزید لکھتے ہیں کہ "یورپی تاریخ کی زیادہ تر کتابیں ان ممالک میں عثمانی حکومت اور اس کے اثرات کو مسخ کرکے پیش کرتی ہیں۔ یہ کتابیں خالصتاً مغربی شواہد پر مبنی ہیں۔ جو زیادہ تر ناقص گھڑی ہوئی اور غیر معتبر ہیں۔ ان کتابوں میں تاریخ یورپ میں ترکوں کے رول کی افسوسناک حد تک گمراہ کن تعبیر ملتی ہے۔ برنارڈ لوئس کے اس بیان سے بھی اس امر کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ مستشرقین کی "معتبر" کتابیں کتنی غیر معتبر ہیں، اس لئے اب مسلمان اہل قلم حضرات کو خود اپنی مذہبی، علمی، تہذیبی اور ادبی تاریخ نہ صرف اپنی مادری زبان میں بلکہ یوروپین زبانوں میں بھی لکھنی چاہیے۔ تاکہ مستشرقین کے تخریبی اور تشکیکی اثرات کو رد کیا جاسکے اور مستند وصحت مند معلومات اور نقطۂ نظر اصل ماخذ کی بنیاد پر پیش کیا جاسکے۔
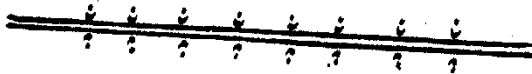
مستشرقین کی خدمات

اور

ان کے حدود

از

جناب سید وحید الدین صاحب ہمدرد نگر، نئی دہلی

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغربی عالموں نے علوم اسلامی کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے، بہت سے مخطوطات جو دور دراز کتب خانوں میں پوشیدہ تھے، ان کا سراغ لگایا، سائنٹفک طریقے سے ان کو ایڈٹ کیا اور دنیائے اسلام سے انکو روشناس کرایا۔ آج بھی مسلمان علما نے اس سلسلہ میں جو کچھ کام کیا ہے، کیا باعتبار مقدار، کیا باعتبار معیار ان کا مجموعی طور پر مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہر عالم جب کسی دوسری تہذیب کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ ان روایات اور تعصبات سے اپنے کو منزہ نہیں کر سکتا جن میں اس کی پرورش ہوئی ہے۔ اس طرح ہر تہذیب کا علمبردار اپنے ساتھ اپنی ہی تہذیب کا بوجھ اٹھائے رکھتا ہے، اور اپنی ہی روایات کی روشنی میں دوسری تہذیب کو جانچنے اور اس پر حکم لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ مستشرقین کا اسلام کے ساتھ معاملہ اپنی خاص نوعیت رکھتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مستشرقین علم طور پر یا تو یہودی النسل رہے ہیں یا پھر عیسائی سے وابستہ رہے ہیں۔ صلیبی جنگوں نے ایک معاندانہ فضا پیدا کر دی تھی، جس کا اثر اب تک باقی ہے۔ اسلام اور عیسائیت کے تعلقات اس طرح شروع ہی سے ایسے ماحول میں نشوونما

پلتے رہے جو اسلام کی صحیح تفہیم کے لئے بالکل ناسازگار تھا۔ خاص طور پر رسول اللہؐ کی سیرت کذب و افترا کا نشانہ بن گئی۔ یہاں یہ بات بھی واضح ہو جانا چاہیئے کہ اسلامی ثقافت کے دوسرے پہلو بھی ہیں۔ جن کا براہ راست مذہب سے تعلق نہیں۔ جیسے فن تعمیر، شعر و شاعری، مصوری (خاص طور پر خطاطی) وغیرہ اور سائنسی علوم جیسے ریاضی، ہیئت، بصریات، تاریخ وغیرہ، ان علوم کے بارے میں مستشرقین کا رویہ بڑی حد تک مذہبی تعصبات سے آلودہ نہیں ہوا ہے۔ جرمن مستشرق زخاؤ نے البیرونی کی کتاب الہند کو ایڈٹ کیا البیرونی کی اہمیت کا احساس اسی زمانہ سے دن بدن بڑھتا گیا۔ اسی طرح ابن خلدون کا کارنامہ بہت بڑی حد تک مستشرقین ہی کی کاوشوں سے ہمارے سامنے آیا اور دنیا کو معلوم ہوا کہ تاریخ کے عمرانی شعور کا سرچشمہ اسلامی فکر و نظر میں ملتا ہے۔ اصل مشکل اس وقت آ پڑتی ہے۔ جب ہم دینیاتی مسائل، قرآن حکیم اور رسول اللہ کی سیرت کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہاں پہلے تو اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کر لینا چاہیئے کہ مذہبی معاملات میں بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے متعلق ہم یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ لوگ بغیر فضل الٰہی کے ان سے اتفاق کر سکیں۔ لیکن ہم یہ ضرور توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ قیاس آرائیوں اور امکانات کو اپنے حدود میں رکھیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ مستشرقین نے اکثر ایسا نہیں کیا ہے بلکہ جہاں کوئی امکان سلبی نوعیت کا تھا اس کو انھوں نے دوسرے امکانات پر غلبہ دے دیا۔

مستشرقین کے اس رویّے کی ایک افسوسناک مثال بنی قریظہ کے واقعہ سے دی جا سکتی ہے جہاں اس واقعہ کے بیان میں تخیل کو زیادہ جگہ دی گئی ہے۔ یہاں میرا اس واقعہ کی نوعیت یا اصلیت سے بالکل سروکار نہیں ہے۔ یہ تو مورخین کا کام ہے وہ اس کی صحیح طور پہ جانچ کریں۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ جہاں رسول اللہؐ کے صحابی سعدؓ بن معاذ کے حکم بنائے جانے کا ذکر ہے۔ وہاں بول Buhl جیسے مستشرقین نے اس گمان کا اظہار کیا ہے کہ سعد کا فیصلہ رسول اللہؐ کے ایماء پہ ہوا ہوگا۔ مورخ تاریخ میں امکانات کا لحاظ کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا لیکن ایسا امکان جس کا نشانہ ایسی شخصیت ہو جس کے تقدس کے سہارے کروڑوں مسلمان اپنی روحانی نجات کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں۔ انتہائی افسوسناک ہے ایک سے زیادہ مستشرق نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ پہلے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودیوں سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ اور جب وہ پوری نہیں ہوئیں تو آپ نے قبلہ کا رخ بدل دیا۔

بعض دیانت دار مغربی عالموں نے مستشرقین کے "حدود" کا خود ہی اعتراف کیا ہے۔ اور برنارڈ لوئس نے اپنے ایک مضمون "اسلام" کی ابتدا اس طرح کی ہے۔

"یہ کہا گیا ہے کہ عربوں کی تاریخ یورپ میں خاص طور پر ایسے مورخین نے لکھی۔ جو عربی سے نابلد تھے یا ایسے عربی دانوں نے لکھی جو تاریخ سے نابلد تھے"۔ یہ بھی چھپی ہوئی بات نہیں ہے کہ ایسے علوم و فنون جن سے کوئی فنی صلاحیت کے بغیر عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ ان فاضلوں کے ہاتھ میں رہے جو متعلقہ علم و فن سے بالکل ناواقف تھے۔ مثال کے طور پر مسلمانوں نے فلسفیانہ فکر میں جو خدمت انجام دی ہے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکا اور یہ سمجھا جانے لگا کہ وہ ارسطو کے صرف نقال اور ناقل رہے ہیں، چونکہ مغربی فلسفہ کی تاریخ میں عیسائی علم کلام کو عرصہ تک کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی اسلئے مسلمانوں کے تفکر اور ان کے علم کلام کے سلسلہ میں ان کی خدمات کو بھی نظر انداز کر دیا گیا، اور اب یہ آہستہ آہستہ معلوم ہو رہا ہے کہ نہ صرف عیسائی علم کلام مسلمانوں کے [illegible] کے بغیر سمجھا جا سکتا ہے۔ بلکہ بعض بنیادی تصورات ایسے بھی مسلمان فلاسفہ نے پیش کئے جن کا اثر فلسفیانہ تفکر پر کافی رہا۔ ابن رشد کے علاوہ ابن طفیل نے جو تعلیم کا خاکہ اپنے فلسفیانہ رومانس حیّ بن یقظان میں پیش کیا ہے۔ وہ فلسفہ تعلیم کے مباحث میں اب قابل توجہ بن گیا ہے۔ اور یہ سوال کہ خدا کا تصور کہاں تک ذہنی ہے۔ اور کہاں تک اکتسابی، ایسا سوال ہے جس کی صدائے بازگشت ہم کو ڈیکارٹ اور لائنز کے فلسفہ میں ملتی ہے۔ یہی حال تصوف کا ہے۔ ابتدا میں تو مستشرقین تصوف کے ماخذ دوسرے مذہب میں ڈھونڈتے رہے، کسی نے فنا کے تصور کو بدھ مذہب کے نرواں سے جوڑنے کی کوشش کی، اور کسی نے صوفیانہ تصور توحید کو ویدانت سے ملانے کی کوشش کی، لیکن اب میسنون کی سرکردگی میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جو قرآن ہی میں تصوف کی بنیادیں تلاش کرتا ہے۔ اور اس کو خاص اسلامی مظہر قرار دیتا ہے، گو کہ یہ بات بھی واضح ہے کہ تاریخ تصوف میں بہت سی بے راہروی رہی ہے۔ اور یہ کیفیات سے مغلوب صوفیہ کی زبان سے ایسے الفاظ بھی صادر ہوئے جن کو شریعت کے مغائر سمجھا گیا لیکن ان کی تمام باتوں کے باوجود تصوف کا بنیادی مزاج تسلیم و رضا رہا ہے۔ اور قرآن ہی کے تصور احسان کو ایک بنیادی رکن قرار دیا گیا ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ مستشرقین سب ایک طرح کے نہیں رہے، بلکہ بعض ایسے بھی رہے ہیں جنھوں نے راسخ العقیدہ عیسائی ہونے کے باوجود کھلے دل سے اس حقیقت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے کہ عیسائی

روحانیت اور وہ ادب جو عیسائی روحانیت سے متاثر ہے۔ اسلام کے اثرات کو بیّن طور پر ظاہر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے نمایاں مقام ہسپانوی مستشرق پروفیسر اسین پلاسیوس (ASIN PALACIOS) کا ہے جس نے امام غزالی پر سب سے جامع کتاب لکھی، اگرچہ اس نے اپنی کتاب کا نام کچھ ایسا رکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غزالی کا جو شعور تھا، وہ اسلام سے زیادہ عیسائیت کے زیادہ قریب ہے، اس نے غزالی کے صوفیانہ شعور کو مسیحی شعور کی مثال سمجھا لیکن سب سے بڑا نمایاں کام اس نے یہ کیا کہ مغربی ادب اور خاص طور پر دانتے کے شاعرانہ شاہکار طربیہ سرمدی میں اسلامی اثرات کا کھوج لگایا جس سے مغرب کے ایک خاص طبقہ میں شدید ردعمل پیدا ہوا اس نے اپنی کتاب ......

ST-JOHN OF THE CROSS AND ISLAM میں اس بات کو پایۂ ثبوت کو پہنچا دیا کہ عیسائی زہد اور باطنی زندگی کے علمبردار اس حد تک اسلام سے متاثر ہوئے کہ اس حلقہ کی اصطلاحات میں ہسپانوی صوفی ابن عباد کا اثر ملتا ہے، اور یہاں ہم کو خالص صوفیانہ تمثیلات ملتی ہیں، بہرصورت ان کی تصانیف اور ان کے بنیادی خیالات سے متعلق ہمارا ردعمل کیسا ہی سلبی کیوں نہ ہو، ان کی خدمات اتنی عظیم ہیں کہ جن کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں، اگر کوئی شخص مسلمان یا غیر مسلم، اسلام کے ادب و مزاج کا جائزہ لینا چاہے تو ان کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔

اب میں ان تحدیدات کا مختصر ذکر کرنا چاہتا ہوں جن سے مغربی انداز فکر بری طرح متاثر ہے، یہاں کوئی تفصیلی جائزہ تو پیش نہیں کیا جاسکتا کیونکہ نہ تو میں مورخ ہوں نہ کوئی اسلامیات کا طالب علم۔ اس لئے میں ایک مختصر تبصرہ ایک اہم کتاب کے بعض مضامین پر پیش کروں گا جس سے مستشرقین کی خدمات اور ان کی تحدیدات دونوں اچھی طرح سامنے آجائیں گی یہ کتاب مشہور جرمن مستشرق رودی پاریٹ (RUDI PARET) کی مرتب کردہ ہے اس کا نام القرآن ہے۔ اس میں پاریٹ نے ان مضامین کا انتخاب کیا ہے۔ جو قرآن سے متعلق مغرب میں لکھے گئے، زیادہ تر مضامین جرمن زبان میں ہیں، اور بعض انگریزی اور فرانسیسی میں بھی ہیں، یہاں ہم کو اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ پاریٹ کا اور ان کے رفقاء کا اسلام کے متعلق کیا زاویۂ نگاہ ہے، اور کس حد تک یہ مقولہ کہ العلم حجاب الاکبر ان پر صادق آتا ہے۔ اور ساتھ ہی اس میں ایک ایسے مستشرق کا بھی مضمون ہے جس میں اس نے اپنے مذہبی رفقاء کے خلاف بڑے موثر انداز میں اپنی آواز بلند کی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مغربی تحقیق ابھی تک ان تعصبات سے خود کو آزاد نہیں کرسکی ہے۔ جو رسول خدا کی شخصیت

اور اسلام کی مذہبی بنیادوں کے متعلق ان کو ورثہ میں ملے ہیں اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ جن غیر مسلم محققین کا جغرافیائی دائرہ اسلام اور عیسائیت کی کشمکش سے باہر ہے ان کی تصانیف کا مزاج بالکل مختلف ہے۔ مثلاً جاپانی عالم اژتسو (IZUTSU) نے جو کچھ اسلامی تصوف اور دینیاتی تصورات کے متعلق سپرد قلم کیا ہے وہ ان طریقہ ہائے کار سے بالکل ہٹا ہوا ہے جن پر مغربی فکر گامزن رہی ہے، اس امر کا پروفیسر برنارڈ لیوس نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

"مغربی دینیاتی تعصبات کی آخری نشانیاں اب بھی بعض مغربی فضلاء کے پاس ملتی ہیں جو علمی خول اوڑھے ہوئے حواشی میں ظاہر ہوتی ہیں۔"

پروفیسر پارٹ کی مرتب کردہ کتاب میں جو مضامین جمع کیے گئے ہیں وہ اس کا بین ثبوت ہیں کہ کیوں قرآن ہمیشہ مغربی فاضل کیلئے ایک کتاب مختوم کی حیثیت رکھتا رہا ہے۔ پارٹ کا لکھا ہوا آربری کے قرآن کے ترجمہ پر تبصرہ قابلِ توجہ ہے، آربری مسلم روایت کا احترام کرتے ہوئے اس کو ترجمہ کا نام نہیں دیتے بلکہ وہ اسے ایک تعبیر قرار دیتے ہیں، اور مغربی علماء کی قرآن کو نئے سرے سے ترتیب دینے کی کوششوں کو بہت ناپسند کرتے ہیں۔ آربری کے نزدیک گو کہ وحی کا نزول بیک وقت نہیں ہوا لیکن ان چیدہ چیدہ پیاماتِ الٰہی کو بہ حیثیت کل کے دیکھنا ہوگا جب آربری نے قرآن کے انگریزی ترجمہ کو "تعبیر" کا نام دیا تو پارٹ نے اس کو مسلمان دوستوں کی خوشنودی کے حصول کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ یہ جرمن فاضل یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ خود ترجمہ کی کوشش ایک مشکوک عمل ہے، خود قرآنی متن کے متعلق نہایت ہی معاندانہ مشاہدات سے گریز نہیں کرتا۔ قرآن کا کوئی مترجم اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ قرآن اس معنی میں "کتاب" نہیں ہے۔ جس معنی میں کتابیں ہمارے کتب خانوں کی زینت بنتی ہیں۔ قرآن نہ صرف ایسی "کتاب" ہے جو پڑھی جاتی ہو بلکہ وہ قابل تلاوت و قرأت بھی ہے۔ اور یہ چیز ترجمہ میں نہیں پیدا ہو سکتی، اسی کتاب میں بول کا بھی ایک مضمون قرآنی مماثلتوں اور مقابلتوں (SIMILARITIES AND COMPARISIONS) پر ہے جو بہت قابل توجہ ہے۔ وہ اپنی توجہ خاص طور پر سورۂ نور کی آیات پر مرکوز کرتے ہیں۔ وہ یقینی طور پر یہ کہنے سے قاصر ہیں کہ کیا واقعی یہ آیات روحانی معنویت اور عمق کو ظاہر کرتی ہیں یا نہیں۔ ان کو بس اتنا یقین ہے کہ رسول اللہ نے عیسائی راہبوں کی صحرائی خلوت گاہوں میں جو چراغ روشن دیکھے تھے، انھوں نے ان پر اتنا گہرا اثر چھوڑا کہ

قرآن میں بطور تشبیہ کے ان کا استعمال کیا گیا، وہ یہ تو مانتا ہے کہ یہاں جو مثال پیش کی گئی ہے۔ وہ قابل توجہ اور انوکھی ہے، لیکن کسی نہ کسی طرح سے اس کی اہمیت گھٹانے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

اس کتاب کا مرتب ایک ممتاز جرمن عالم ضرور ہے۔ اور اس کا قرآن کا جرمن ترجمہ مستشرقین کے نزدیک بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ تاریخی طرز تحقیق کا بڑا علم بردار ہے حالانکہ اس طریقہ کار پر حال میں مغربی فضلاء نے بڑی سخت تنقید کی ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کسی سوسائٹی اور نظام حیات کے اقدار کو نظر انداز کر کے ہم اس تہذیب کے مزاج کو سمجھ نہیں سکتے اور صرف تاریخی کھوج سے ہم صداقت کا پتہ نہیں لگا سکتے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ برسوں کی تحقیق اور کاوش کے بعد پارٹ کس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ اس کے نزدیک اسلامیات سے متعلق مغربی علماء کی تحقیق نے جو نتائج پیش کئے ہیں وہ بنیادی طور پر صحیح اور معروضی ہیں۔ اور اب اگر کسی تبدیلی کی توقع کی جا سکتی ہے تو اس کی صرف ضمنی حیثیت ہو گی۔ اب ایسے سنسنی خیز نتائج پیش ہونے کی مستقبل میں توقع نہیں کی جا سکتی جن سے پچھلے نتائج کا ابطال ہو سکے۔ ہاں پارٹ کی تحقیق نے ایک سنسنی خیز نتیجہ تو ضرور پیش کیا ہے۔ اس کے انکشاف کے مطابق قرآن نہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اٹھائے جانے کا قائل ہے۔ بلکہ اس کا بھی کہ ان کی مقدس ماں بھی آسمان پر اٹھا لی گئیں اور ساتھ ہی پارٹ کے کہنے کے مطابق رسول اللہ کو یہ بھی یقین تھا کہ ایام اواخر میں حضرت مریمؑ کا ظہور ہو گا۔ بعد میں اسی خیال کی تائید میں ایک دوسرے محقق ہیننگ (GENNING) کا ایک پورا مقالہ دیا گیا ہے۔ یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ خیال کہ حضرت مریمؑ آسمان پر اٹھا لی گئیں کیتھولک کلیسا کا ایک عقیدہ بن گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس عجیب سے مفروضہ کی کیا بنیادیں فراہم کی گئی ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پارٹ اور ہیننگ دونوں "دوستانہ مراسلت" کے ذریعہ ایک دوسرے سے فیضیاب ہوئے۔ ان کے دعوے کی بنیاد قرآن حکیم کی یہ آیات ہیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (۵-۱۷)

اس آیت سے ہیننگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ دونوں کو زندہ تصور کیا گیا۔

اور یہ بھی تصور کیا گیا ہے کہ دونوں عالم سماوی میں زندہ موجود ہیں اور اسی لئے پیغمبر اسلامؐ حضرت مریمؑ کی اس عالم سماوی میں جسمانی منتقلی کے قائل تھے۔ اس عقیدے میں ہیننگ کو مشرقی کلیسا کے عقیدے کی جھلک نظر آتی ہے ان کو یہ بات قابل لحاظ معلوم ہوتی ہے، کہ حضرت مریمؑ کا ذکر حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ ساتھ کیا گیا۔ اور یہ صرف اس لئے ہوا ہے کہ پیغمبرؐ اسلام نہ صرف حضرت مسیحؑ بلکہ حضرت مریمؑ کی بھی عالم سماوی میں جسمانی منتقلی کو تسلیم کرتے ہیں، ہمارے فاضل محقق رقم طراز ہیں "شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ پہلے حضرت مسیحؑ کو ابن مریم کہا گیا یا شاید حضرت مسیحؑ کے تسلسل حیات کا خیال ان کے ذہن میں حضرت مریمؑ کے تسلسل حیات کے تصور کا محرک بنا۔ ان دو امکانات میں وہ دوسرے امکان کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کا فیصلہ کن ثبوت وہ اس میں دیکھتے ہیں کہ پیغمبرؐ اسلام نے مشرقی کلیسا سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس سارے نظریہ کا مقصد یہ بتانا ہے کہ کس طرح عیسائی اثر قرآنی تصورات میں عمل پیرا رہا۔ حالانکہ سیدھی سادھی توجیہ تو یہ ہے کہ یہاں قرآن کے پیش نظر نہ حضرت مسیحؑ کی اور نہ حضرت مریمؑ کی مخصوص حیثیت ہے۔ بلکہ سب کا اصرار تو صرف قدرت الٰہی پر ہے جو کسی ارضی مخلوق کے متعلق کوئی استثناء نہیں رکھتی، خواہ اس کا مقام کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔ جب قرآن حضرت مسیحؑ اور ان کی ماں کا ذکر کرتا ہے تو ان کا ذکر تمام ارضی مخلوقات کے ساتھ کرتا ہے، یہاں اس کا تعلق ان کے تقدس سے کچھ نہیں ہے طرفہ تماشا یہ ہے کہ اس آیت کو جس میں عیسائی تصور مسیحؑ کے خلاف سختی سے آواز اٹھائی گئی ہے، توڑ مروڑ کر مسیحی دینیاتی تصورات میں منتقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہرحال پیغمبر اسلام سے ایسے عقیدے کو منسوب کرنا جو ان کے ماننے والوں کے لئے بالکل اجنبیت رکھتا ہے سائنسی تحقیق کے مطالبات کے بالکل منافی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ خود پروفیسر پارٹ یعنی اس کتاب کے فاضل مرتب رسول اللہؐ کی سیرت کے متعلق کیا کہتے ہیں، ان کے مقالہ کی بحث اس سے ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت قرآن کی روشنی میں کس طرح نمودار ہوتی ہے اور ہم رسول اللہؐ کی زندگی کے متعلق قرآن سے کیا مواد حاصل کر سکتے ہیں۔ پارٹ کے کہنے کے مطابق سب سے پہلے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ بہت ہی حساس مذہبی آدمی تھے کیونکہ انھوں نے اپنی تمام فتوحات کا اپنے آپ کو ذمہ دار قرار نہیں دیا۔ بلکہ انکسار محض سے ان کو تائید الٰہی سے منسوب کیا یہاں تک کہ مکہ کی فتح بھی جسے "فتح" کہا گیا ہے، فتح کے معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب "فیصلہ" ہے، دوسرے

الفاظ میں اس کامیابی کا سہرا رسول اللہ اپنے یا اپنی جماعت کے سر نہیں لیتے بلکہ خدا کی عظمت اور قدرت کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن ایک پیغمبر تو پیغمبر ہر مسلمان آج بھی جب وہ کچھ کامیابی حاصل کرتا ہے اور اس کی توقعات پوری ہوتی ہیں خواہ اس کی سطح کچھ بھی کیوں نہ ہو، مادی یا روحانی، خدا کا شکر "الحمد للہ" کے ساتھ بجا لاتا ہے اور اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے فضل الٰہی میں اپنی کامیابی ڈھونڈتا ہے۔ یہاں انکساری کا کوئی سوال نہیں بلکہ اس چیز کو وہ حقیقت جانتا ہے۔ اور یہی اس کا ایمان ہے۔ اس کی انکساری اس ایمان ہی کا ایک جزو ہے۔ رسولؐ کے ضمن میں انکساری کا بیان مذہبی اقدار کے شعور کی طرف سے بے حسی کی علامت ہے۔

پارٹ اپنے بہت سے رفقاء کے ساتھ جو طریقۂ کار اختیار کرتا ہے۔ اس میں وہ تاریخی طریقۂ کار کے ساتھ ساتھ نفسیاتی تعبیر بھی شامل کرتا ہے۔ وہ ان واقعات میں جو قرآن میں پچھلے پیغمبروں کے متعلق بیان کئے گئے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تجربہ کا عکس دیکھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ ابتدائی تاریخ میں صورت حاضرہ کو پاتا ہے۔ یعنی اگر قرآن میں پچھلے پیغمبروں کے متعلق سوسائٹی کے اونچے طبقے (ملاء) کی مخاصمت کا ذکر ہے تو وہ اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ رسول اللہؐ بھی اس قسم کی مخاصمت سے دوچار رہے ہونگے اور اس بات کی تائید ان کے سوانح نگاروں سے ہوتی ہے، اس سے ہمارا فاضل مصنف ایک بہت دلچسپ انکشاف کا سہرا اپنے سر لیتا ہے۔ یعنی جہاں حضرت شعیبؑ کی مخالفت ہوئی تو مخالفوں نے کہا: "شعیب ہم کچھ نہیں سمجھتے جو تم کہہ رہے ہو۔ تمہارا تعلق ہم میں کے کمزور لوگوں سے ہے۔ اگر ہم کو تمہارے قبیلے کا خیال نہ ہوتا تو ہم تم پر پتھر پھینکتے کیونکہ تم ہمارے مقابلہ میں طاقتور نہیں ہو۔ قَالُوا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا ۖ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ ۖ وَمَا أَنتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ ○ (ھود ۱۱: ۹۱)

اب پروفیسر پارٹ کے خیال میں یہاں پتھر پھینکنے سے مطلب سنگساری نہیں ہے جیسا کہ انجیل کے قصوں میں وارد ہوا ہے بلکہ دھمکی ہے۔ جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دی گئی ہوگی کہ اگر وہ اپنی دعوت کو یونہی چلاتے رہے تو ان پر پتھر پھینکے جائیں گے۔ یہ واقعہ کہ کوئی دھمکی انھیں دی گئی ہوگی کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں معلوم ہوتا سوائے ان قصوں کے جو دوسرے پیغمبروں کے متعلق بیان کئے گئے ہیں۔ ہم کو پروفیسر پارٹ کی خیال آرائی سے کچھ بحث نہیں بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ پتھر رسول اللہؐ کی ذات پر سچ مچ پھینکے جاتے ہیں۔ لیکن وہ عرب

کے قدیم صحرا کے گلی کوچوں سے نہیں بلکہ بیسویں صدی کے یورپ کی دانشگاہوں کے مستند مراکز سے
اور رسول اللہ کی مذہبیت پارٹ کی دلچسپی کا اصل موضوع نہیں جتنا یہ بتانا کہ وہ ایک آدمی تھے۔ اور
ان میں وہ تمام کمزوریاں موجود تھیں جو ایک آدمی میں ہوتی ہیں۔ پیغمبر بھی ایسے واقعات سے دوچار ہوئے
کہ ان پر ناکامی و محرومی کا غلبہ ہوا۔ حزن و ملال بھی ان پر چھا گیا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ کیا کسی غیر یقینی
حالت نے ان کو اپنے راستے سے برگشتہ کیا۔ انھوں نے کبھی خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ لیکن وہ ہم جیسے انسان
ہونے کے باوجود بھی ہم سے الگ تھے۔ ایسے انسان جن کی مثال کی تکرار نہیں ہوسکتی اور اس سے زیادہ گہرے
معنوں میں جس معنی میں کسی فرد کی بھی تکرار نہیں ہوسکتی۔ ہم اپنے سارے فضل و ناموری کے باوجود کسی فرد میں وہ سپردگی
اور محبت پیدا نہیں کرسکتے جو انھوں نے نہ صرف اپنے معاصرین میں پیدا کی، بلکہ آج بھی بے شمار لوگوں کے
دلوں پر ان کی حکومت ایسی ہے کہ چودہ سو سال کے بعد بھی ان کے لئے وہ جان کی بازی لگانے کیلئے تیار ہیں
اور انھوں نے وہ مقام حاصل کرلیا ہے۔ جس کو نہ کسی تلوار اور نہ کسی کا قلم مٹا سکتا ہے۔ اور جس کے نام
کے طفیل ہر دور میں والہانہ شاعری اور وجد آفریں تصوف کے بہترین نمونے دیکھنے میں آئے۔

لیکن پارٹ کی مرتب کی ہوئی اسی کتاب میں ایک مضمون فوک کا بھی ہے جس نے بڑی سختی سے
ان تمام کوششوں کی مذمت کی ہے۔ جو رسول اللہ کے کردار اور شخصیت کو مسخ کرنے کے سلسلے میں
کی جاتی ہیں۔ اس مغربی فاضل کے کہنے کے مطابق مستشرقین جزئیات میں اس طرح پھنس گئے ہیں اور قرآن
و اسلام کی خصوصیت کا سراغ تاریخ میں تلاش کرنے میں اس قدر سرگرداں ہو گئے ہیں کہ رسول اللہ
کی تخلیقی شخصیت تک ان کی رسائی نہ ہوسکی۔ اس کے یہ الفاظ قابل غور ہیں "کبھی بھی عقلی علوم کے
ذریعے اس شخصیت کے اسرار کو بے نقاب کرنا ممکن نہ ہوسکے گا۔ اور کبھی بھی ہم اپنی جانچ اور تحقیق کے
ذریعہ یہ پتہ چلانے کے قابل نہ ہوسکیں گے کہ وہ کیا واردات تھے۔ جنھوں نے ان کی روح کو متاثر کیا یہاں
تک کہ انھوں نے اپنے ضمیر کی صبر آزمائشوں سے گذر کر اپنے کو خدا کی طرف سے منتخب کردہ ایک نذیر اور
رسول قرار دیا۔" اس کے مطابق اگر ہم اس حقیقت کو مان لیں تو یہ سوال کہ رسول اللہ کے پیش نظر کیا نمونے
اور تاریخ کے کون سے ماخذ تھے، جن سے انھوں نے استفادہ کیا، غیر اہم سوال بن جاتا ہے۔ یعنی وہ سوالات

جو تاریخ کے میکانکی تصورات کے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اپنی معنویت کھو دیتے ہیں۔

پھر یہی مصنّف لکھتا ہے کہ 'عیسائی مناظر اس بات پر مُصر رہے ہیں کہ مدینہ کا زمانہ باطنی انحطاط کا زمانہ تھا، اور مدینہ میں وہ ابتدائی ولولہ باقی نہیں رہا تھا۔ لیکن اس قسم کا تصور یہ حقیقت نظر انداز کر دیتا ہے کہ سچا مذہب پورے انسان پر حادی ہوتا ہے۔ اور اس کی تمام قوتوں کو متحرک کرتا ہے۔ یہ سوال کہ کیا رسول اللہ ؐ نے مکہ میں بھی سیاسی عمل میں کچھ حصّہ لیا ہے۔ لایعنی ہے۔ کیونکہ ان کے لئے مذہبی اور سیاسی سرگرمیوں کا امتیاز کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اصل یہ ہے کہ مدینہ میں ان کو وہ سازگار ماحول ملا جہاں وہ اپنی مکہ کی دعوت کو عملی شکل دے سکے اور جو بھی تصویر ہم رسول اللہ ؐ کی کھینچیں وہ نامکمل رہے گی۔ اگر ہم ان کی شخصیت کے جادو کو نظر انداز کر دیں یہ ان کی شخصیت ہی کی قوت تھی کہ انھوں نے (حضرت) ابوبکر رضی اللہ عنہٗ اور (حضرت) عمر رضی اللہ عنہٗ کو اپنی طرف کھینچا۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ان کو اسوۂ حسنہ کہا گیا ہے قرآن حکیم تو تفسیروں اور تشریحوں کے ذریعے امت کے سامنے پیش ہوا ہے۔ اور تعبیر و توجیہ کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ لیکن یہ رسول اللہ ؐ کا ہی اسوہ ہے جو راہبر اور راہنما کی حیثیت سے ان کے نام لیواؤں کے سامنے آیا ہے۔ جب کبھی بھی اجنبی اثرات کا غلبہ مسلمانوں کے لئے ایک خطرہ بنا تو سنت کی تجدید ان کا نعرہ بنی اور اب بھی مسلمانوں کے تقویٰ اور زہد میں ہم اس تجربۂ الٰہی کی جھلک دیکھتے ہیں۔ جس نے تیرہ سو (چودہ سو برس) برس پہلے عرب کے دور دراز صحرا میں محمد بن عبداللہ کو مجبور کیا کہ وہ دنیا کے سامنے آئے اور خدا اور اس کے فیصلہ کا پیام دنیا کو سنائے۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مستشرقین کی جماعت ایسی جماعت نہیں ہے۔ جس کے تمام افراد پر ہم یکسانیت کے ساتھ کوئی حکم لگا سکیں۔ خوشی کی بات ہے کہ مغرب کے عالموں کو بھی یہ احساس ہو گیا ہے کہ کسی دین پر مذہبی شعور سے بیگانہ ہو کر حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

منٹگمری واٹ کی کتاب
محمدؐ ایٹ مکہ پر ایک نظر

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

ڈبلو منٹگمری واٹ نے محمدؐ ایٹ مکہ، محمدؐ ایٹ مدینہ، محمد دی اسٹیٹسمین وغیرہ لکھ کر بڑی شہرت حاصل کر لی ہے، ان کے مضامین ایسے جرائد میں نکلتے ہیں جو مسلمانوں کی راسخ العقیدگی کے حامل ہیں، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی میں قرآن پاک کی دوسری بین الاقوامی کانگریس دسمبر ۱۹۸۲ء میں ہوئی تھی، تو وہ بھی اس میں مدعو تھے، اور ان کی بعض رائے کے حوالے بھی تقریروں میں سننے میں آئے، ان کی تصانیف کی شہرت تو سنی تھی لیکن پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا، ان کی تصانیف خاص طور پر حاصل کیں، ان کا مطالعہ شروع کیا، تو معلوم ہوا کہ وہ انہی مستشرقین میں ہیں، جو انتہائی زہریلی باتیں اپنے طاقت ور اور ماہرانہ انداز میں لکھ کر اپنی مطلب برآری کی کوشش کرتے ہیں،

میرے پیش نظر اس وقت ان کی کتاب محمدؐ ایٹ مکہ کا وہ ایڈیشن ہے، جو ۱۹۵۲ء میں چھپا، اب اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں، نئے ایڈیشن سامنے نہ رہنے کی وجہ سے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ پہلے ایڈیشن اور بعد کے ایڈیشن میں کیا کیا ترمیمات کی گئی ہیں، لیکن پہلے ایڈیشن میں سب سے پہلے اس کتاب کے ماخذوں پر نظر پڑی اس میں زیادہ تر اہرنیس، رچرڈ بل، بوہل، کائتانی، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، گولڈ زیہر، جیفری، لیمنس، نکلسن، نولدکی، سیل اینڈ وہری، ٹوری، د لیاد سن اور وسطا وغیرہ کے نام ملے، بخاری کا ذکر ضرور ہے، لیکن اس سے

مدد فرانسیسی ترجمہ سے لی گئی ہے، قرآن مجید کو رچرڈ بل کے ترجمہ سے سمجھا گیا ہے، ازرقی کی کتاب اخبار مکہ کا سہارا جرمن اسکالر وسٹن منلڈ سے لیا گیا ہے، ابن ہشام کی کتاب سیرت رسول اللہؐ، ابن سعد کی طبقات، طبری کی تاریخ الرسل والملوک اور واقدی کی کتاب المغازی کا ذکر ضرور کر دیا گیا ہے، مگر یورپی مصنفوں کی کتابوں کے حوالے اس کثرت سے ہیں کہ عربی کی تصانیف دبی ہوئی نظر آتی ہیں،

یورپ اور امریکہ کے فضلاء نے تحقیق و تدقیق کا یہ معیار قائم کر رکھا ہے، کہ اس میں حوالے معاصر ماخذوں اور نہیں تو زمانہ کے لحاظ سے قریب تر زمانہ کے ماخذوں کے حوالے دے کر اس کو مستند اور وقیع بنایا جائے، ترجمہ کے حوالوں سے اس کا پایہ گر جاتا ہے، پھر بہت بعد کے مصنفوں کے حوالوں سے تحقیقی تحریر ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے، لیکن زیر نظر کتاب کے مصنف نے زیادہ تر انیسویں اور بیسویں صدی کے مصنفوں کی کتابوں کے حوالے دیے ہیں، اور ان ہی کا سہارا لیا ہے، جن سے ان کی نیت کے کھوٹ کو مدد پہنچ سکتی ہے، اور پھر عربی کی اصل کتابوں کے حوالے کے بجائے ان کے ترجمہ سے استفادہ کیا گیا ہے، اس لحاظ سے اس کتاب کی وقعت بڑی حد تک گر جاتی ہے،

ابن اسحاق، ابن ہشام، کتاب المغازی از واقدی اور طبقات ابن سعد اور تاریخ طبری کے حوالے مصنف نے ضرور دیے ہیں، مگر اسی حد تک جتنے ان کے لیے مفید تھے، ان کتابوں کا جو ناقدانہ تجزیہ کیا گیا ہے، اس سے مصنف بظاہر بے خبر معلوم ہوتے ہیں، ابن اسحاق نے فن مغازی میں شہرت حاصل کی، وہ امام فن مغازی سمجھے جاتے ہیں، مغازی میں زیادہ تر لڑائیوں اور معرکہ آرائیوں کا ذکر ہوتا ہے، اس لیے یہ فن سیرت نگاری سے مختلف ہے، ابن اسحاق پر یہ اعتراض ہے کہ انھوں نے بعض واقعات یہودیوں سے سن کر لکھے ہیں، اس لیے ان پر پورا اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک گروہ ان کو ثقہ سمجھتا ہے، تو اسی درجہ کا دوسرا گروہ ان کو بے اعتبار قرار دیتا ہے، محمد ابن اسحاق ہی کی کتاب کو زیادہ منقح اور اضافہ کر کے ابن ہشام نے اپنی سیرت مرتب کی، لیکن ان پر یہ اعتراض ہے کہ انھوں نے اس کتاب کو زیادہ تر بکائی کے واسطے سے روایت کیا ہے، بکائی اگرچہ رتبہ کے شخص سمجھے جاتے ہیں، لیکن امام بخاری کے استاذ ابن مدینی اور نسائی کہتے ہیں، کہ وہ ضعیف ہیں، ابو حاتم بھی کہتے ہیں، کہ وہ استناد کے قابل نہیں،

واقدی کی روایتیں تو موجودہ دور کے سنجیدہ علمی حلقوں میں بالکل قابل قبول نہیں سمجھی جاتی ہیں کیونکہ اس کی لغو بیانی مسلّمہ عام ہو چکی ہے، محدثین کہتے ہیں کہ وہ اپنے جی سے روایتیں گھڑتا ہے، اس لیے وہ اس کو کذاب کہتے ہیں، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں؛

> دنیا جانتی ہے کہ واقدی کی حیثیت ایک داستان گو کی ہے جس کا شمار معتبر مورخین میں نہیں ہو سکتا۔ تاریخ و سیر میں اس کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے، جیسے آپ ملکہ الزبتھ کی سوانح عمری میں رینالڈس کا حوالہ دیں، .... امام شافعیؒ نے اگرچہ اس سے روایت کی ہے، مگر یہ صاف تصریح ہے کہ امام اس کی تصنیفات کو جھوٹ کا انبار کہا کرتے تھے، (مقالات سلیمان جلد ۲ صفحہ ۱۱۸)

پھر واقدی کس طرح معتبر ہو سکتا ہے؟

طبقات ابن سعد کا بڑا حصہ واقدی سے ماخوذ ہے، جو روایتیں واقدی سے لی گئی ہیں، وہ اس لیے صحیح نہیں سمجھی جا سکتی ہیں، کہ یہ ابن سعد میں درج ہیں،

طبری کی تاریخ مستند ضرور ہے، لیکن وہ بہت سی روایتیں ایسے راویوں کے ذریعہ بیان کرتا ہے، جن میں بہت سے ضعیف الروایۃ اور غیر مستند ہیں، اس لیے سیرت پر جو کچھ لکھا ہے اس میں اکثر جگہ مستند احادیث کی کتابوں سے کام نہیں لیا ہے،

آج سے تقریباً ستر برس پہلے علامہ شبلیؒ نے سیرت کے ماخذوں پر بڑی سیر حاصل کی ہے، جو اب تک چراغ راہ اور نشان منزل کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد ابن اسحاق اور تاریخ طبری وغیرہ سیرت و تاریخ کی کتابیں ضرور ہیں، لیکن سیرت کی تصنیفات میں ایک بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو (سیرت النبیؐ جلد اول ص ۹۷) وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ روزمرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روایتیں کافی خیال کی جاتی ہیں، لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں، ان کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لینے اور کدوکاوش کرنے کی خاص ضرورت ہے، (ص ۱۰۱) مولانا شبلیؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی ترتیب کے کچھ اصول بتائے ہیں، جس کی وضاحت

مختصر طریقہ پر اس طرح کی جا سکتی ہے کہ سب سے پہلے یہ کہ سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے ان کو سب سے مقدم رکھا جائے، کیونکہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآن مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے اختلافی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے، قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے، احادیث صحیحہ کے سامنے عام سیرت کی کتابوں کی روایتیں نظر انداز کی جا سکتی ہیں، جو واقعات بخاری و مسلم وغیرہ میں مذکور ہیں، ان کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر عام استقرا اور تفحص سے کام لیا جائے، تو تمام اہم واقعات میں خود صحاح ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں، بصورت اختلاف روایات احادیث کے رواۃ ارباب فقہ و ہوش کی روایات کو دوسروں پر ترجیح دینی چاہیے، سیرت کی کتابوں میں جو واقعات ہوں ان میں سلسلۂ علت و معلول کی تلاش نہایت ضروری ہے، اور جو روایت عام وجوہ عقلی، مشاہدہ عام، اصول مسلمہ اور قرائن حال کے خلاف ہوگی، لایق حجت نہ ہوگی، اہم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق و جمع سے اس کی تسلی کر لینی چاہیے، کہ راوی سے ادائے مطلب میں تو غلطی نہیں ہوئی ہی وغیرہ وغیرہ،

مولانا شبلیؒ نے اپنے زمانہ میں لکھا تھا، کیا یورپ کے سیرت نگاران پیغمبر اسلامؐ میں کسی نے بھی اس جانکاہی اور نکتہ سنجی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائف کے لیے قلم اٹھایا ہے؟ انہوں نے اس وقت یہ سوال اٹھایا تھا، کہ کیا ایک غیر مسلم ان قواعد اور اصول کی مراعات کے ساتھ قلم اٹھا بھی سکتا ہے، ڈبلیو منٹگمری واٹ سے بھی یہ سوال کیا جا سکتا ہے، مگر وہ کیوں اس جانکاہی اور نکتہ سنجی کی زحمت گوارا کرتے،

وہ قرآن کے ماخذ کو یہ لکھ کر ہلکا کر دیتے ہیں،.... کہ اس میں تو عقائد وغیرہ کی تفصیل ہے، اس زمانہ کے اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی حالات نہیں ہیں، اور یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ ان حالات کے بغیر عقائد کو توازن کے ساتھ سمجھا نہیں جا سکتا ہے، خوب، زبور، توریت اور انجیل میں کیا اس زمانہ کے اس قسم کے سارے حالات مل جاتے ہیں، تب ہی ان کے عقائد سمجھ میں آتے ہیں،

یورپ کے مصنفوں نے معلوم نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کتنی کتابیں لکھی ہیں، فارسٹر، اروِنگ، اسپرنگر، میور، مارگولیتھ، ڈی لیسی جانسٹن، منبر یہ اور خدا جانے اور کتنے ان گنت اہل قلم ہیں، جنھوں نے آپؐ کی سیرت پر بہت کچھ لکھا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی سیرت پر کچھ لکھنا ان کے لیے فخر کی بات ہے، اور

ہونی بھی چاہیے، لیکن اس فخر کے ساتھ وہ اپنی طبیعت کے مطابق نیش عقرب سے بھی باز نہیں آتے، منٹگمری واٹ بھی یہ فخر حاصل کرنا چاہتے تھے، اس لیے قلم اٹھایا، اور مختلف جلدیں لکھ ڈالیں، ان کا خیال ہے، کہ محمدؐ کی ایک تازہ سوانح عمری اس لیے لکھنے کی ضرورت تھی، کہ اسلام کے طلبہ آپ کی سیرت کا مطالعہ تاریخی نقطۂ نظر سے کرنے کے خواہاں ہیں، اس لیے انھوں نے مورّخ بن کر اس کتاب میں اس زمانہ کے اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی پس منظر کو پیش کیا ہے، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اس میں ایسے سوالات کے بھی جوابات ملیں گے، جو پہلے نہیں اٹھائے گیے، مگر اس کا فیصلہ ان کے ناظرین ہی کر سکتے ہیں، کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، کیا ان کے پیشرو یورپین مصنفین نہیں لکھ چکے ہیں، اروِنگ، میور اور مارگولیتھ وغیرہ کے ابتدائی ابواب میں وہ سب کچھ ملیگا، جو مصنف نے اپنے ابتدائی باب میں لکھا ہے، انھوں نے اپنے پیشرو مصنفوں کی تحریروں کو اپنے انداز میں مرتب کر دیا ہے، اسی کے ساتھ ان کے ناظرین کو یہ حق ہے کہ وہ فیصلہ کریں کہ وہ چبائے ہوئے نوالے کو چبا رہے ہیں، یا کوئی نئی بات پیش کر رہے ہیں، یا اسی کتاب میں کس حد تک وہ مورّخ ہیں، کس حد تک عیسائیت کے خالص مبلغ اور حامی ہیں، صحیح تو یہ ہے کہ وہ ایک خاص مقصد کے تحت اپنی کتاب لکھنا چاہتے تھے، جس کے لیے وہ ایک نتیجہ پر پہلے پہنچ گیے تھے، اسی کے مطابق اپنی تحقیق اور محنت کا صغریٰ اور کبریٰ مرتب کر لیا، ان کا کیا مقصد ہے وہ آیندہ سطروں میں ظاہر ہوگا،

کتاب کے پہلے باب میں عرب کے اقتصادی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی، مذہبی اور ذہنی پس منظر کا احاطہ کیا گیا ہے، اقتصادی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنف کا دعویٰ ہے کہ قرآن ریگستانی فضا میں نہیں بلکہ اعلیٰ تمدن کی صورت میں نازل ہوا، (ص ۳) لیکن اس دعویٰ کے باوجود وہ ایک چلتا ہوا فقرہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ عرب کے باشندے بھوک سے عاجز ہو کر فتوحات کے لیے چل پڑے (ص ۳) یہ لکھ کر ان کی فتوحات کی عظمت کو کم کرنے کی کوشش کی، مگر اقتصادی حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ نہیں بتایا کہ اس پس منظر میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں مدد یا رکاوٹ پہنچی، اس کی وضاحت کے بغیر عہد جاہلیت کے مکہ کی سیاست کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں، جس کے تجزیہ میں ان کے دل کا گوشہ بڑا نرم ہو گیا ہے، مکہ کی سیاست کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے، اس میں قریش کی دھڑ بندی، حلف الفضول، مکہ میں مختلف افراد اور قبائل کے اثرات، اس کی خارجہ پالیسی، اس پر بازنطینی ایرانی

اور حبشہ کی حکومتوں کی للچائی نظر، اس پر ابرہہ کے حملہ وغیرہ کا ذکر کرتے کے بعد رقمطراز ہیں کہ محمدؐ کی بعثت اس وقت ہوئی جب مکہ میں بڑی دولت اور بین الاقوامی سیاست کی آمیزش ناگزیر طور پر تھی۔ (ص ۱۱)

وہ ایام جاہلیت کے قریش کی عقلمندانہ اور صبر آزما سیاست دانی اور حلم کے بھی معترف ہیں، لکھتے ہیں کہ ان کی سیاسی عقلمندی میں حلم چمکتا نظر آتا ہے۔ (ص ۱۱) ان کی رائے ہے کہ ان کی قبائلی کش مکش معمولی درجہ کی تھی، جو مشترکہ مفاد ہی کی خاطر تھی، (ص ۸) وہ یہ بھی ظاہر کرنا چاہتے ہیں، کہ مکہ میں جمہوریت تھی، اسکا موازنہ اتھینس کی جمہوریت سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ اتھینس میں اخلاقی اصولوں اور ایمانداری پر زیادہ زور دیا جاتا ہے لیکن مکہ کے لوگ اس کے لیے فکرمند رہتے کہ عملی مہارت سے ایک اچھا رہ نما کیسے ابھر سکتا ہے۔ (ص ۱۰)

مکہ کی خارجہ پالیسی پر بھی بحث ہے، جس کو پڑھنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی پچھڑا ہوا نہیں بلکہ ایک ترقی پذیر علاقہ تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ بازنطینی اور ایرانی امپائر جیسی دو بڑی قوتوں کے ساتھ حبشہ جیسی چھوٹی قوت کو بھی مکہ سے برابر دلچسپی رہتی، یہ دلچسپی اس کی تجارتی سرگرمیوں کی وجہ سے رہی، بازنطینی حکومت سے مکہ کے تعلقات دوستانہ رہے، حبشہ بازنطینی حکومت کا دوست تھا، اس لیے ان دونوں قوتوں سے جب کوئی خطرہ نہ ہوتا، تو مکہ کا تجارتی کارواں دور دور تک جاتا، مگر جب حبشہ سے تعلقات اچھے نہیں رہے، تو ابرہہ نے مکہ پر حملہ کر دیا، اس کے وجوہ یہ بھی رہے، کہ ابرہہ کی نظر میں مکہ کی بڑھتی ہوئی نفع بخش تجارت کھٹکی، پھر اس کو جو تقدس حاصل تھا، اس کی اہمیت بھی اس کو پسند نہیں آئی، شاید اس کے حرم کی دولت پر بھی اس کی للچائی نظر پڑی، پھر اس تجزیہ سے بھی محظوظ کیا ہے، کہ مکہ اس زمانہ کی بڑی قوتوں کی کشاکش میں غیر جانب داری ہی کو اپنے لیے ضروری سمجھتا، اور جب بازنطینی اور ایرانی طاقتیں برسرپیکار ہوتیں، تو مکہ کی اس غیر جانبداری کی اہمیت بڑھ جاتی، یہ سب کچھ لکھنے کے بعد وہ رقمطراز ہیں، کہ مفید معلومات کے نہ رہنے کی وجہ سے یہ تمام باتیں قیاسات ہی سے لکھی جا رہی ہیں، جن میں اگر بہت سی تفصیلات صحیح نہیں بھی ہوں گی، تو اس کی عام مرقع آرائی (Sound) ہی نظر آتی ہے۔ (ص ۱۶) ایسے طرز استدلال اور انداز تحقیق کا کیا جواب ہو سکتا ہے، مولانا شبلیؒ نے آج سے بہت پہلے ایسے یورپین سیرت نگاروں کے متعلق لکھا کہ وہ نہایت دور دراز قیاسات اور احتمالات سے سلسلۂ معلولات پیدا کرتے ہیں، جن میں بہت کچھ ان کی خود غرضی اور خاص مطمح نظر کو دخل ہوتا

ہے، وہ اپنے مقصد کو ایک محور بنا لیتے ہیں، اور تمام واقعات اسی کے گرد گردش کرتے ہیں (سیرۃ النبیؐ ص ۵)
مصنف کی تحریر کی بڑی خوبی یہ ہے، اگر کوئی ناقد ان پر یہ اعتراض کرے۔ کہ ان کی کتاب میں عرب کے ایام جاہلیت کے تاریک اور اغدار پہلوؤں کا ذکر نہیں تو وہ ان کی نشاندہی آسانی سے کردیں گے لیکن ان کے قلم کی چابکدستی سے یہ نظر آتی ہے، کہ یہ تاریک اور داغدار پہلو اس دور کے روشن پہلوؤں کی تفصیلات میں دب کر رہ گئے ہیں، اب تک مسلمانوں کے سامنے ایام جاہلیت کی بڑی بھیانک تصویر تھی، جس کو مصنف اپنے خاص مقصد کے تحت رد کرنا چاہتے ہیں، وہ اس دور کی تجارتی سرگرمیوں اور دوسری خوبیوں کی مرقع آرائی اس لیے کرتے ہیں، کہ یہ ظاہر ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد مسلمانوں سے ان کا تصادم ان کی اپنی قدروں کو برقرار رکھنے کی خاطر تھا، غزوات مذہبی لڑائیاں نہ تھیں، بلکہ تجارتی برتری کی خاطر لڑی گئیں، وہ مکہ کے لوگوں کی معاشرتی اور اخلاقی خوبیوں کے بیان کرنے میں فراخ دلی سے کام لیتے ہیں، مسلمان مورخین تو یہ بتاتے ہیں کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک عیش و نعمت کے سامان بہت کم تھے، اس زمانہ میں گھروں میں جائے ضرور نہ تھے، چھلنیاں نہ تھیں، بھوسے کو پھونک کر اڑاتے تھے، جو رہ جاتا تھا، وہی آٹا ہوتا تھا، بخاری کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ راتوں کو گھروں میں چراغ نہیں جلتے تھے، تاریخ اور ادب میں یہ تصریح موجود ہے، کہ عرب کھنکھجورا، گوہ اور گرگٹ اور جانوروں کے چمڑے کھاتے تھے، بتوں پر آدمیوں کی قربانی چڑھائی جاتی تھی، باپ کی منکوحہ بیٹے کو وراثت میں ملتی تھی، حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ شادی جائز تھی، ازدواج کی کوئی حد نہیں تھی، قمار بازی، شراب خواری اور زناکاری کا رواج عام تھا، لڑائیوں میں لوگوں کو زندہ جلادینا، مستورات کا پیٹ چاک کر ڈالنا، معصوم بچوں کو تہ تیغ کرنا عموماً جائز تھا، (سیرت النبیؐ جلد اول ص ۱۱۸-۱۲۸) مولانا شبلیؒ نے مستند حوالوں سے لکھا ہے، کہ قریش میں سخت بداخلاقیاں پھیلی ہوئی تھیں، بڑے بڑے ارباب اقتدار نہایت ذلیل بداخلاقیوں کے مرتکب تھے، ابولہب جو خاندان ہاشم میں سب سے زیادہ ممتاز تھا، اس نے حرم محترم کے خزانہ سے غزال زریں چرا کر بیچ ڈالا تھا، اخنس ابن شریق جو بنو زہرہ کا حلیف اور رؤسائے عرب میں شمار کیا جاتا تھا، نمام اور کذاب تھا، نضر بن حارث کو جھوٹ بولنے کی سخت عادت تھی، اسی طرح اکثر ارباب جاہ مختلف قسم کے اعمال شنیعہ میں گرفتار تھے

(سیرت النبیؐ جلد اول ص ۲۱۷، معارف مطبوعہ مصر ۵۵)

مسلمانوں کا یہ اعتقاد ہے کہ اسی ظلمت، تیرگی اور تاریکی کو دور کرنے کے لیے ایک آفتاب عالم تاب کی ضرورت تھی، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پوری ہوئی، لیکن ہمارے فاضل مصنف موجودہ دور کی سیاسی، اقتصادی اور عمرانی اصطلاحات کا سہارا لے کر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان مورخین جو کچھ بیان کرتے ہیں، وہ سراسر غلط ہے، عربوں میں قبائلی یک جہتی کے ساتھ انفرادیت تھی، جب مختلف قبائل مل جاتے، تو ان کا اعلیٰ ترین یونٹ بن جاتا، (ص ۱۷) ان میں اتحاد، ایک مشترکہ زبان، شعری روایت اور مادی مفاد کی بناء پر تھا، ان کی بدویانہ اقتصادیت تجارتی اور سرمایہ دارانہ اقتصادیت کی طرف منتقل ہو رہی تھی، (ص ۱۸) وہ لڑائی میں بہادر، مصیبت میں صابر، انتقام لینے میں مشتعل مزاج، کمزوروں کے حامی، اور طاقت وروں کے خلاف سرکش ہوتے، (ص ۲۰) ان میں فیاضی، میزبانی، وفاداری، اطاعت شعاری جیسی اہم خوبیاں تھیں، ان کو اپنی آن اور عزت زیادہ محبوب تھی، جس کے لیے وہ قانون اور کسی بات کے صحیح اور غلط کی پرواہ نہیں کرتے تھے، (ص ۲۱، ۲۲) یہ عرب (Aristocracy) اور (Egalitarianism) کے مجموعہ تھے، ان میں مساوات تھی، لیکن جو بہتر سے بہتر ثابت ہوتا، وہی ان کا قاعد بن جاتا، (ص ۲۲) اسی طرح عربوں کی اور خوبیاں، اعلیٰ اخلاق، ان کی انسانی رشتہ داری کی روایت اور انسانی خوبیوں کا اعلیٰ معیار اس لیے دکھایا گیا کہ اسلام کی عظمت کو عربوں کی ان خوبیوں سے بڑی مدد ملی، اور جب یہودیوں اور عیسائیوں کی وحدانیت کا تصور اس میں شامل کر دیا گیا، تو اس میں اور بڑائی پیدا ہو گئی، (ص ۲۳) یہ زور بیان اس لیے صرف کیا گیا ہے کہ اسلام کی عظمت و جلالت میں گویا ربانی پیامات و الہامات کی تعلیمات کو کوئی دخل نہیں رہا، لیکن یہی عرب جب اسلام قبول کر لیتے ہیں، تو ان کے لیے مصنف جیسے مستشرقین کے دلوں کا نرم گوشہ ختم ہو جاتا ہے، ان عربوں میں زیادہ تر برائیاں نظر آتی ہیں،

مصنف نے عرب کے قدیم مذاہب کا مطالعہ تولڈیکی، ولہاوسن، لیمنس اور بارٹن وغیرہ کی تحریروں کے ذریعہ سے کیا ہے، گو وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایسی معلومات جستہ جستہ ہیں، اس لیے قیاسات سے زیادہ کام لینے کا امکان ہے، (ص ۲۳) وہ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں دیوتاؤں اور دیویوں کی بڑی تعداد تھی، (ص ۲۴)

اور محمدؐ کے زمانہ کے ایام جاہلیت میں مذہب کا اثر زیادہ نہ تھا، (ص ۲۳) وہ پتھروں اور درختوں کی پوجا کرتے تھے، (ص ۲۴) مگر اپنی تحریر کا رُخ بدل کر یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ وہ ان چیزوں کو یزدانی نہیں سمجھتے، بلکہ یزداں کا مسکن تصور کرتے، ان کی پرستش غالباً بیرونی اثرات کی وجہ سے تھی، وہ ان کی یزدانیت کے قائل نہ تھے، بدوئیں (Nomads) کو تو ان پر اعتقاد بھی نہ تھا، وہ ان کو محض کاشتکاروں کا دیوتا سمجھتے، (ص ۲۳) وہ یہ بھی لکھتے ہیں، کہ یہ عرب مکہ کے اردگرد کے مقدس مقامات کی زیارت کو بھی جاتے، حرم یعنی مکہ کے مقدس علقہ کا احترام بھی کرتے، اسی کے ساتھ وہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ جنگ احد میں ابوسفیان اپنے ساتھ لات اور منات بھی لیگئے تھے، مگر وہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ اس کا تعلق مذہب کے بجائے توہم پرستی پر تھا، وہ لات ومنات کا تو سرسری طور پر ذکر کر گیے ہیں لیکن اس زمانہ میں جو اور دوسرے بتوں کی پرستش ہو رہی تھی، اس کو بالکل نظر انداز کر گئے ہیں، صحیح بخاری (باب مکہ) میں ہے کہ خاص خانہ کعبہ اور اس کے اطراف میں تین سو بت تھے، ان میں سے اہم بتوں مثلاً لات، عزیٰ، منات، یغوث، یعوق، نسر، ود، صواع اور ہبل کا ذکر تو قرآن پاک میں ہے، اس زمانہ کی بت پرستی کی تفصیل لکھنے کے بجائے مصنف اس پر زور دیتے ہیں کہ ان کا اصل مذہب قبائلی طرز کی انسان دوستی (Humanalani anism) تھا، یعنی افراد تو فنا ہوتے رہیں گے، لیکن ان کا قبیلہ باقی رہیگا اور اس کو رہنا چاہیے، اور اسکی بقا کے لیے اس میں شریفانہ اوصاف باقی رہنا چاہیے، جو شریف النسل خون ہی سے ممکن ہے، (ص ۲۵)

فاضل مولف نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایام جاہلیت کے عرب خدا کے قائل رہے ہیں اور استدلال ہے کہ قرآن کی شروع کی آیتیں ان کو مخاطب کرتی ہیں، جو خدا پر یقین رکھتے تھے، یہ لکھنے کو تو لکھ گیے، لیکن اسی کے بعد یہ بھی کہتے ہیں، ان کا یہ یقین بہت کچھ مبہم اور گنجلک ہی، (ص ۲۶) پھر معلوم نہیں کس حوالہ سے یہ لکھ گیے ہیں، کہ قرآن میں سقر، القارعہ اور الحطمہ وغیرہ جیسے الفاظ بظاہر اس زمانہ میں سمجھے نہیں گیے، لفظ بظاہر بتا رہا ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں، اس پر خود ان کو یقین نہیں، پھر لکھتے ہیں کہ سورۂ قریش سے یہ گمان (suggestion) ہوتا ہے کہ مکہ کے روشن خیال لوگ خدا ہی کی پرستش کر رہے تھے، پھر یکایک یہ کہہ جاتے ہیں کہ خدا کے لیے عربی لفظ اللہ ال الہ کا مخفف ہی، جس کے لیے یونانی لفظ (Hotheos) کی طرح دیوتا (god) کے ہیں لیکن عام

لیکن عام طور سے اس سے خدا ہی کا مفہوم لیا جاتا ہے، یہ ممکن ہے کہ محمدؐ سے پہلے مکہ کے غیر اہل کتاب . . .
(pagan) اللہ سے مراد کعبہ کے مخصوص دیوتا ہی کو لیتے، اسی طرح جس طرح طائف کا دیوتا الات
کہلاتا، مصنف اپنے احتمالات کو جاری رکھتے ہوئے رقم طراز ہیں، کہ اگر اللہ خدا کے لیے استعمال ہوا جیسا
کہ یہودیوں اور عیسائیوں کا بیان ہے، تو پھر اس کے گنجلک ہونیکے مواقع عظیم ہو جاتے ہیں، اس لیے اغلب یہ
ہے، کہ مکہ کے کچھ لوگ تو خدا کو تسلیم کرتے لیکن ان کا یہ خیال بھی رہا کہ خدا پر یقین رکھنے کے ساتھ ان کی بت پرستی میں
ایسا تضاد نہیں، جس کی بنیاد پر وہ اس کو رد کر دیں، ان سطروں سے ظاہر ہے، کہ مکہ کے عربوں میں توحید کا
تخیل گنجلک سا تھا، لیکن ہمارے مصنف کا قلم جب آگے بڑھتا ہے، تو لکھ جاتے ہیں، کہ وحدانیت کا تخیل عیسائیوں
اور یہودیوں کے اثرات کی وجہ سے رہا ہوگا، ان سے تال میں کس طرح رہا، اس کی کچھ تفصیل بتانے کے بعد
یہ بھی تحریر کرتے ہیں، کہ مکہ میں عیسائی تھے، ان میں تاجر اور غلام بھی تھے، لیکن ان کے اثرات اہم نہ تھے،
(ص ۲۷) پھر وہ یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے اثرات میں بہت سے عجیب وغریب خیالات
بھی تھے جن میں وہ غیر معمولی تخیلات بھی تھے، جو جعلی عیسوی عقائد (gospel) سے حاصل کرکے عرب
عرب میں رائج کر دیے گیے تھے، قرآن میں تثلیث یعنی باپ بیٹے اور کنواری مریم کے تصور پر تنقید یقیناً
ان عیسائی عربوں پر تنقید ہے، جو یہ خیال رکھتے تھے، پھر مصنف اپنے احتمال سے کام لیتے ہوئے یہ بھی لکھتے
ہیں، کہ جہاں تک یہودیوں کے اثرات کا تعلق ہے، یہ ان کے مقدس صحیفہ کے ذریعہ سے نہیں ہوئے، بلکہ مختلف
قسم کے ثانوی ذریعہ سے پہنچے، مصنف کا یہ بھی احتمال کہ وحدانیت کے سلسلہ میں یہودیت اور عیسائیت کے اثرات
کے علاوہ اور ذرائع سے بھی یہ اثر ہوا، گو یا بہت قلیل رہا ہوگا، وہاں ایسے چھوٹے فرقے بھی رہے ہوں گے جن
پر وحدانیت کے معاملہ میں یونانی فلسفہ کا اثر رہا ہوگا، ایسے فرقے صابین کے تھے، اس زمانہ میں لفظ حنیف کا
کچھ استعمال ہوا، تو اس کی ایسی ہی ممکن تعبیر ہے، لیکن ان تمام احتمالات کا اشہب دوڑانے کے بعد مصنف
یکایک یہ لکھ جاتے ہیں:

> میں سادہ طریقہ پر یہ کہوں گا کہ وحدانیت کے سلسلہ میں کسی باضابطہ تحریک کی کوئی
> اچھی شہادت نہیں ملتی، اور اگر کوئی ایسی تحریک تھی، تو اس کے پیچھے سیاسی مقاصد تھے،

مثلاً عثمان بن الحویرث نے عیسائیت اس لیے قبول کی کہ وہ بازنطینیوں کی مدد سے مکہ کا تنہا فرماں روا ہو جاتے"۔ (ص ۲۸)

یہ لکھ کر مصنف یہ کہہ جاتے ہیں، کہ حنیفیوں کے اس روایتی بیان میں سچائی ہے کہ وہ ایک نئے مذہب کی تلاش میں تھے، عرب اور خصوصاً مکہ میں چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں جو مذہبی ماحول تھا، اس میں بہت سے ایسے سنجیدہ لوگ رہے ہوں گے، جو ایک خلا محسوس کر رہے ہوں گے۔ اور اپنی گہری ضروریات کو پورا کر کے اپنے کو مطمئن کرنے کے خواہشمند تھے، اسی کے ساتھ اپنے احتمال سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ عربوں نے یہودی و عیسائی خیالات کو کچھ ترمیم کے ساتھ قبول کیا، اس ترمیم کی وضاحت یہ کی ہے کہ انھوں نے تقدیر یا دہر کے پرانے خیالات کو خدا سے وابستہ کر رکھا تھا، عربوں میں خدا کا خیال اس حد تک جاگزیں تھا، کہ وہ اپنے توہمی مراسم کو بھی خدا کے احکام ہی سے منسوب کر دیتے تھے، مصنف کا احتمال آگے بڑھتا ہے، اور وہ لکھتے ہیں، کہ مکہ سے ابرہہ کی مراجعت کی پرانی تعبیر قرآن سے پہلے کی ہو سکتی ہے، اور یہ خیال کہ عاد اور ثمود کے پیغمبر ہودؑ اور صالحؑ تھے، غالباً قرآن سے پہلے کا تھا، اور یہودیت اور عیسائیت کے تخیل نبوت سے لیا گیا ہے، یہ احتمال ان کی اس تحریر سے بھی ظاہر ہے کہ محمدؐ سے پہلے مسیلمہ نے پیغمبری کا جو دعویٰ کیا وہاں ظاہر ہے کہ نبوت کا خیال وہاں جڑ پکڑ چکا تھا، (ص ۹۳) معلوم نہیں مصنف نے یہ کیسے لکھ دیا کہ مسیلمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اپنی نبوت کا اعلان کیا تھا، یہ تو اسلام کی ہر معمولی تاریخ سے معلوم ہو سکے گا کہ مسیلمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا، لیکن آپؐ کی زندگی میں اس کی آواز نہیں سنی گئی حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں اس کی آواز ابھری تو اس کے خلاف فوج کشی کی گئی، اور وہ وحشی بن حرب کے ہاتھوں قتل ہوا،

اس قسم کی غلط بیانی اور احتمال کی خامہ فرسائی کے بعد مصنف آخر میں لکھتے ہیں، کہ محمدؐ کی سیرت کے مطالعہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اثرات کو اہمیت دینا ضروری نہیں، کیونکہ اس سلسلہ کی بہت سی تفصیلات متنازعہ فیہ ہیں لیکن اس کا احساس رکھنا ضروری ہے کہ ایسی خبریں ہوا میں محمدؐ کے پاس قرآن آنے سے پہلے تھیں، اور یہ آپ کی ذات کی تیاری اور آپؐ کے مشن کے ماحول کا جزبن گیا، (ص ۲۹) یہ لکھ کر اپنے قلم

کی چابکدستی ظاہر کی ہے،

اس کے بعد مصنف نے اپنا ابتدائی باب ختم کر دیا ہے لیکن اس میں ان کے یقینیات کے بجائے قیاسات، احتمالات، ظنیات، تاویلات اور بے جا معلومات کو زیادہ دخل ہے، وہ بظاہر، "غالباً، اندازہ کیا جاتا ہے، ہوگا، رہا ہوگا، شاید اور خیال ہے، احتمال ہے،" وغیرہ جیسے الفاظ کا سہارا زیادہ لیتے ہیں، وہ کیا کہنا چاہتے ہیں، اس کا سمجھنا آسان نہیں، وہ یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے عرب کچھ نہ کچھ وحدانیت سے متاثر تھے، ان پر یہودیت اور عیسائیت کے تخیل وحدانیت کا بھی کچھ اثر پڑا، اگر وہ یہ بھی یہ کہتے ہیں محمدؐ کی سیرت میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اثرات کو اہمیت دینا ضروری نہیں،

جب مصنف یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں وحدانیت کی کوئی باضابطہ تحریک ہونے کی کوئی اچھی شہادت نہیں، تو پھر قیاسات اور تاویلات کی گھنی جھاڑیوں میں قلم کا گھوڑا دوڑانا کہاں تک صحیح ہے، اصلی یہودیت اور اصلی عیسائیت میں توحید کا جو تصور تھا، وہ ضرور اسلام میں آیا، اصل توریت اور اصل انجیل میں توحید کی وہی تعلیمات تھیں، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاتم النبیین کے ذریعہ سے کلام پاک میں پیش کیں، اگر ان تینوں ربانی صحیفوں میں توحید سے متعلق ایک ہی بات نظر آئے، تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، خود اللہ تعالیٰ نے ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ اہل کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں سے کہہ دو کہ ایک بات مان لو، جو تمہارے یہاں بھی وہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو نہ پوجو،

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ ۔	کہہ، اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو کہ تمہارے اور تمہارے درمیان برابر ہے، یہ کہ بجز اللہ کے ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں،
(آل عمران: ۶۳)	

البتہ کلام پاک میں توحید کی وہ تعلیم نہیں جو تحریف شدہ توریت اور انجیل میں ہے مثلاً یہود کہتے ہیں، کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں، مسیحیوں نے بھی دعویٰ کیا کہ یسوع مسیح اللہ کے بیٹے ہیں، اصل انجیل میں ایسی کوئی تعلیم نہیں، اور

نہ اس میں یہ کہا گیا کہ اللہ یسوع مسیح اور مریم تینوں ایک ہیں، اسے تین مت کہو، ایک کہو، اصل انجیل میں حضرت عیسیٰؑ نے کبھی یہ تعلیم نہیں دی، کہ میری ماں کو معبود مانو، یہود و نصاریٰ نے تو اللہ کو چھوڑ کر احبار و رہبان کو بھی اپنا رب بنا رکھا تھا، قرآن مجید نے ایسے تمام عقائد کی تردید کی،

قرآن میں ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ذَٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ۝ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝ يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَن يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝

(سورۃ التوبہ: ۳۰ تا ۳۲)

یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے، عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے، یہ بے حقیقت باتیں ہیں، جو وہ اپنی زبانوں سے نکالتے ہیں، ان لوگوں کی دیکھا دیکھی، جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے تھے، خدا کی مار ان پر یہ کہاں سے دھوکا کھا رہے ہیں، انھوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے، اور اسی طرح مسیح بن مریم کو بھی، حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں، یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کیے بغیر ماننے والا نہیں، خواہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو،

یہودیوں اور عیسائیوں نے توحید کی جب اصل تعلیم کو بھلا دیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنے خاتم النبیینؐ کے

مدینہ سے اپنے آخری صحیفۂ آسمانی میں یاد دلادیا، اس سے یہ گمان ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم میں یہودیت اور عیسائیت کا اثر ہے، یا یہودیوں اور عیسائیوں سے سنی سنائی یا ان سے حاصل کی ہوئی باتوں کو قرآن مجید میں جمع کر دیا گیا ہے، قرآن مجید نے تو ان کے یہاں جو بگڑی ہوئی تعلیم تھی، اسکو رد کر کے اس کو سنوارنے کی کوشش کی ہے،

قرآن میں وہی سب کچھ ہے جو توراۃ اور انجیل میں ہے، انجیل میں بھی سب کچھ تھا، جو توریت میں تھا، قرآن مجید میں ہے:

"پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰؑ کو بھیجا، توراۃ میں سے جو کچھ اس کے سامنے موجود تھا، وہ اسکی تصدیق کرنے والا تھا، خود ہم نے اس کو انجیل عطا کی جس میں رہنمائی اور روشنی تھی، اور وہ بھی توراۃ میں سے جو کچھ اس وقت موجود تھا، اس کی تصدیق کرنے والی تھی، خدا ترس لوگوں کے لیے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی، ہمارا حکم تھا کہ اہلِ انجیل اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں، جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے، اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں، پھر اے نبی ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی، جو حق لے کر آئی ہے، اور الکتاب میں جو اس کے موجود ہے، اس کی تصدیق کرنے والی اور اسکی محافظ و نگہبان ہے" (المائدہ۔ ۵ ارکوع)

پھر بہت صاف صاف قرآن مجید ہی میں ہے:

"جو کچھ قرآن میں بیان کیا جا رہا ہے، یہ بناوٹی باتیں نہیں ہیں، بلکہ جو کتابیں اس سے پہلے آئی ہیں، ان ہی کی تصدیق ہے، (سورۃ الرعد۔ رکوع ۱۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آج کل کے مستشرقین کی طرح یہ بھی اعتراض ہوا کہ قرآن مجید میں اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں، قرآن مجید میں ہے:

اور جب کوئی ان سے پوچھتا ہے کہ تمہارے رب نے یہ کیا چیز نازل کی ہے، تو کہتے ہیں کہ اجی یہ تو اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں، یہ باتیں وہ اس لیے کرتے ہیں کہ قیامت کے روز اپنے

بوجھ بھی پورے اٹھائیں، اور ساتھ ساتھ کچھ ان لوگوں کے بوجھ بھی سمیٹیں جنھیں بربنائے جہالت گمراہ کر رہے ہیں، دیکھو کیسی سخت ذمہ داری ہے جو یہ اپنے سر پہ لے رہے ہیں، (النحل ع ۳)

قرآن مجید میں یہ بھی ہے کہ:

"دوسری طرف خدا ترس لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے جو تمہارے رب کیطرف سے نازل ہوتی ہے، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ بہترین چیز اتری ہے، اس طرح کے نیکوکاروں کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے، اور آخرت کا گھر تو ضرور ہی ان کے حق میں بہتر ہے"،

(النحل ۱۴ رکوع)

اللہ کے لغوی اور نحوی اشتقاق کی بحث تو پرانی ہے، جس کو پھیلا کر اس مفہوم کو گنجلک کر دیا گیا ہے، چاہے اس پر جتنی بحث کی جائے، مسلمان عام طور سے یہی سمجھتے ہیں، کہ یہ عربی لفظ ہے، اور عربی کے الہ سے مشتق ہے، اور یہ تسلیم کہ یہ کلدانی اور سریانی کے الاہیا یا عبرانی کے الوہ سے مشتق ہے، اور یہ تسلیم کہ قرآن سے پہلے جاہلی شعراء کے یہاں یہ لفظ ملے گا، لیکن یہ سوال یہ ہے کہ کلدانی، سریانی، عبرانی بولنے والوں اور جاہلی شاعروں کے یہاں اور قرآن اور اسلام میں اللہ کا تصور کیا ہے، اللہ کے استعمال سے یہ ظاہر ہے کہ ایام جاہلیت میں توحید تھی، تو پھر مصنف کا یہ لکھنا کیا معنی رکھتا ہے، کہ اس زمانہ میں دیوتاؤں اور دیویوں کی بڑی تعداد تھی، (ص ۲۳) پتھروں اور درختوں کی پوجا ہوتی تھی، (ص ۲۳) خدا پر یقین رکھنے کے ساتھ ان کو خیال رہا کہ ان کی بت پرستی میں ایسا تضاد نہیں جس کو وہ رد کر دیں، اسی طرح وحدانیت کے سلسلہ میں کسی باضابطہ تحریک کی کوئی اچھی شہادت نہیں ملتی، (ص ۲۸) وغیرہ وغیرہ، ایام جاہلیت میں اللہ کا ذکر ضرور ہے، اور کچھ تھوڑے سے لوگ توحید کے قائل رہے، لیکن اس زمانہ کے عام لوگوں کا یہ مقصد رہا، کہ اللہ کے سوا اور بھی معبود (الٰہ) ہے، اس کے کچھ شریک بھی ہیں، اس میں اور جنوں میں باہم کوئی رشتہ قائم ہے، اس کے بیٹے اور بیٹیاں بھی ہیں، وغیرہ، اسی لیے ایم، اے میور کو بھی یہ لکھنا پڑا، کہ اس زمانہ میں بت پرستی اور بنو اسمٰعیل کے بے ہودہ اعتقادات کی لہر جوش مارتی ہوئی کعبہ سے آکر ٹکراتی تھی، (دیباچہ ۷۱ c x) قرآن مجید نے ایسے تمام باطل عقائد اور توہمات کی تردید کی، اور اللہ کے تصور میں اس کی وحدت، وحدانیت، مشیت، وسعت،

قدرت، رحمت، محبت کی ایسی اعلیٰ تعلیم پیش کی، جو موجودہ توریت اور انجیل میں بگاڑ دی گئی تھی جس کو قرآن مجید اور اسلام نے پھر سے استوار کر کے نکھار دیا، واضح رہے کہ جس زمانے میں وحی الٰہی آئی، اس نے عدالت میں کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں سکھائی، پرانی ہی باتوں کی تعبیر انسان کے وجدانی عقائد و تصورات اور علم کے مطابق کر دی، اس حقیقت کو مستشرقین اپنے مخصوص طرز کے معروضی مطالعے کے ذریعہ جس رنگ میں چاہیں پیش کریں، مگر حقیقت اپنی جگہ پر حقیقت ہی رہے گی،

خود قرآن مجید میں ہے:

مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ۔	اے نبی! تم کو جو کچھ کہا جا رہا ہے، اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کو نہ کہی جا چکی ہو، بے شک تمہارا رب بڑا اور درگذر کرنے والا ہے، اور اس کے ساتھ بڑی ہی
(سورہ حٰم سجدہ ۴۳-رکوع ۴)	درد ناک سزا دینے والا بھی ہے،

اسلام کی یہ صریح تعلیم ہے کہ تمام سچے مذاہب درحقیقت ایک ہی ہیں، ایک ہی پیغام ہے، جو آدمؑ سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سنایا جاتا رہا، میرے استاد محترم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے ایک مضمون "رسول وحدت" میں اس کی تصریح اس طرح کی ہے کہ قرآن مجید نے ہمارے سامنے دو لفظ پیش کیے ہیں، دین اور شریعت جس کو منسک اور منہاج بھی کہتے ہیں، دین سے مراد مذہب کے وہ بنیادی امور ہیں جن پر تمام مذاہب حقہ کا اتفاق ہے، مثلاً خدا کی ہستی، اس کی توحید، اس کی صفات کاملہ، انبیاء کی بعثت، خدا کی خاص عبادت، حقوق انسانی، اچھے اخلاق اور برے اعمال کی جزا و سزا، یہ وہ اصل دین ہے جس میں تمام پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی، اس کو لے کر اول سے آخر تک تمام انبیاءؑ آئے، اس میں زمان و مکان کے تغیر کو کوئی دخل نہیں، نہ قوم و ملت کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف ہوا، وہ ہر زمانہ اور ہر مقام میں یکساں رہا، اور وہاں کے پیغمبروں نے اس کی یکساں تعلیم دی، اب اگر اس میں کسی جہت سے کوئی اختلاف ہوا تو یا تو طریقۂ تعبیر

کی غلطی ہے، یا باہر کی چیزیں اس میں مل گئی ہیں، اور اس کی حالت میں تغیر پیدا ہو گیا ہے، دوسری چیز یعنی شرعۃ منہاج اور منسک وہ جزئیات احکام ہیں، جو ہر قوم و مذہب کی زمانی و مکانی خصوصیات کے سبب سے بدلتے رہتے ہیں، مثلاً عبادت الٰہی کے طریقوں میں ہر مذہب میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہے، عبادت کی سمتیں الگ الگ ہیں، اعمال فاسدہ کے انسداد کی تدبیریں جدا جدا ہیں، اب قرآن کے نقطۂ نظر سے مذاہب کے اختلاف کا یہ مطلب ہوا کہ اصل دین جو ازلی سچائی اور ابدی صداقت ہے، ناقابل تبدیل اور ناقابل تغیر ہے، البتہ حصول مقصد کے راستے اور طریقے مختلف پیغمبروں کے زمانوں میں اگر اصلاح اور تبدیل کے قابل پائے گئے تو بدلتے رہتے ہیں، دنیا میں انبیاء علیہم السلام کا وقتاً فوقتاً ظہور اسی مقصد کے تحت ہوتا رہا ہے کہ وہ اسی ازلی اور ابدی صداقت کو دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں، اور دین کو اصل مرکز پر قائم رکھیں، اور ساتھ ہی اپنی قوم و ملک اور زمانہ کے حالات کے مطابق خاص احکام اور جزئیات جو ان کے لیے مناسب ہوں ان کو بتائیں اور سکھائیں۔ انبیاء علیہم السلام کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاحب شریعت نبی کے بعد دوسرا صاحب شریعت نبی اسی وقت بھیجا گیا ہے، جب پہلا صحیفہ کھو گیا ہے، یا ذہنی تحریکات اور دستی تصرفات سے ایسا بدل گیا ہے کہ اصلیت مشتبہ ہو گئی ہے، حضرت ابراہیمؑ کے صحیفوں کے گم ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰؑ پر تورات نازل ہوئی، اور جب اس میں اختلافات پیدا ہوئے تو زبور وغیرہ مختلف صحیفے آتے رہے، جو عہد نامہ قدیم میں موجود ہیں، پھر اس کی تکمیل کے لیے انجیل آئی، اور جب اس میں انسانی اختراعات کا دخل ہو گیا تو قرآن اترا،

باب ۔ ۲

اس باب میں مصنف نے پہلے یہ بحث چھیڑ دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آباؤ اجداد کو مکہ میں اہمیت حاصل تھی، کہ نہیں، ان کا جو طرز استدلال عام طور سے اس کتاب میں ہے، وہی اس باب میں بھی ہے، ظاہر ہے کہ وہ اپنے ناظرین کے دلوں میں آپ کے اسلاف سے متعلق کچھ نہ کچھ شکوک ضرور پیدا کر دینا چاہتے تھے۔ اسی لیے اپنے خاص سلسلۂ معلولات سے پھر کام لیا ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے متعلق مولانا شبلیؒ رقم طراز ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا

خاندان اگرچہ اباً عن جدٍ معزز اور ممتاز چلا آتا تھا، لیکن جس شخص نے اس خاندان کو قریش کے لقب سے ممتاز کیا، وہ نضر بن کنانہ تھے، بعض محققین کے نزدیک قریش کا لقب سب سے پہلے فہر کو ملا، اور ان ہی کی اولاد قریشی ہے، نضر کے بعد فہر اور فہر کے بعد قصی بن کلاب نے نہایت عزت اور اقتدار حاصل کیا، اس زمانہ میں حرم کے متولی حلیل خزاعی تھے، قصی نے حلیل کی صاحبزادی سے جن کا نام حبی تھا، شادی کی تھی، اس تعلق سے حلیل نے مرتے وقت وصیت کی، کہ حرم کی خدمت قصی کو سپرد کی جائے، اس طرح یہ منصب بھی ان کو حاصل ہو گیا۔ قصی نے ایک دارالمشورہ قائم کیا، جس کا نام دارالندوہ رکھا، قریش جب کوئی جلسہ یا جنگ کی تیاری کرتے تو اسی عمارت میں کرتے، قافلے باہر جاتے، تو یہیں سے تیار ہو کر جاتے، اور دیگر تقریبات کے مراسم بھی یہیں ادا ہوتے...... قصی نے بڑے بڑے نمایاں کام کیے، جو ایک مدت تک یادگار رہے، مثلاً سقایہ اور رفادہ جو قدام عرب کا سب سے بڑا منصب تھا، ان ہی نے قائم کیا، تمام قریش کو جمع کر کے تقریر کی کہ سیکڑوں ہزاروں کوس سے لوگ حرم کی زیارت کو آتے ہیں، ان کی میزبانی قریش پر فرض ہے، قریش نے ایک سالانہ رقم مقرر کی جس سے منیٰ اور مکہ معظمہ میں حجاج کو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا، اس کے ساتھ چرمی حوض بنوائے جن میں ایام حج میں پانی بھر دیا جاتا تھا، کہ حجاج کے کام آئے، مشعر حرام بھی ان ہی کی ایجاد ہے، جس پر ایام حج میں چراغ جلائے جاتے تھے، قصی نے اس قدر شہرت اور اعتبار حاصل کیا کہ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ قریش کا لقب ان ہی کو ملا، علامہ ابن عبدربہ نے عقد الفرید میں بھی لکھا ہے، اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ قصی نے چونکہ خاندان کو جمع کر کے کعبہ کے آس پاس بسایا، اس لیے ان کو قریش کہتے ہیں، قصی کے بعد قریش کی ریاست ان کے منجھلے بیٹے عبدمناف نے حاصل کی، اور ان ہی کا خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص خاندان ہے، انہی کے دوسرے بیٹے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہاشم کے ذمہ حرم کے زائرین کے لیے سقایہ اور رفادہ کی خدمت سپرد ہوئی، انھوں نے یہ فرض نہایت خوبی سے انجام دیا، حجاج کو سیر چشمی سے کھانا کھلانے کے لیے سبیل رکھتے تھے، تجارت کو نہایت ترقی دی، روم کے قیصر اور حبش کے بادشاہ سے عرب تاجروں کے لیے ٹیکس معاف کرایا، جس سے قریش کے قافلۂ تجارت کی عزت بڑھی، عرب کے مختلف قبائل میں دورہ کر کے یہ معاہدہ کیا کہ قریش کے کاروانِ تجارت کو ضرر نہ پہنچایا جائے گا، ایک دفعہ قحط پڑا، تو ہاشم نے شوربہ میں روٹیاں چورا

کر کے لوگوں کو کھلائیں، اسی لیے وہ ہاشم کے نام سے مشہور ہو گیے۔ (سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۱۶۴-۱۶۵)

مگر ہمارے مصنف نے ان کی اہمیت یہ لکھ کر کم کر دی ہے، کہ حجاج کی دیکھ بھال کا معاملہ ایک ادنیٰ درجہ کی چیز تھی، تجارت سے بڑے منافع حاصل ہو رہے تھے، اسی لیے یہ کام ہاشم کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ (ص ۳۰)

وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطلب کے متعلق لکھتے ہیں، کہ انھوں نے چاہ زمزم کی کھدائی کر کے یہ تو ثابت کر دیا کہ ان میں کام کے ابتدا کرنے اور سرگرم عمل ہونے کی صلاحیت ہے، اور خانہ کعبہ کی عزت برقرار رکھنے میں بھی حصہ دار تھے، لیکن اس اعتراف کے باوجود وہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں نمایاں آدمی تھے، مگر کچھ نہ معلوم ہونے کے باوجود ان کو یہ معلوم ہو سکا کہ حجاج کو پانی فراہم کرنے کا حق ان ہی کو تھا، پھر ان کی امتیازی حیثیت کو ظاہر کرنے کے لیے یہ لکھتے ہیں، کہ ان کی لڑکیوں کی شادی مکہ کے بعض بہترین اور طاقتور ترین خاندانوں میں ہوئی، یہ معلومات بھی فراہم کی ہیں کہ جب مکہ پر ابرہہ کا حملہ ہوا تو وہی صلح وصفائی کے لیے بھیجے گیے، اس کی اہمیت یہ لکھ کر کم کر دی ہے، کہ وہ مکہ کے لوگوں کی طرف سے نہیں، بلکہ ایک اقلیت کی طرف سے ملے، پھر لکھتے ہیں کہ ان کے ملنے کا جو بھی مقصد رہا ہو، لیکن جب ابرہہ کی مراجعت ہوئی تو ان کی حکمت عملی کی خود بخود نفی ہو گئی، پھر اپنی عادت کے مطابق قیاس سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ ہم نہیں بتا سکتے، کہ ابرہہ سے ملنے کے بعد عبد المطلب کا اثر بڑھا کہ نہیں، کیونکہ اس کے بعد ہی ان کی وفات ہو گئی، لیکن یہ بہت آسانی سے بتا سکتے کہ ابرہہ سے ان کے ملنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے قبیلہ کا حال برا ہو رہا تھا، اس قسم کا اندازہ لگانے میں مصنف بہت ماہر ہیں،

مصنف نے عبد المطلب کی اہمیت بھی کم کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ان کے پیش رو سوانح نگاروں میں میور نے ان کی عظمت اور سطوت کی پوری تصویر اپنی کتاب دی لائف آف محمد میں پیش کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ چاہ زمزم کی کھدائی عبد المطلب کی زندگی میں بڑی کامرانی تھی اور دوسرے کنوئیں چھوڑ دیئے گیے، اور سب اس کی طرف مائل ہوئے، عبد المطلب اس سے تمام زائرین کو پانی مہیا کرتے، اور بہت جلد کعبہ کے حصہ دار ہو گیے، ان کی شہرت بڑھتی چلی گئی، ان کے خاندان کے طاقتور بیٹوں نے ان کے رتبہ کو اور بڑھایا، اور وہ مکہ کے سردار

بن گیے، ان کی یہ سرداری ان کی وفات تک رہی، میور نے یہ بھی لکھا ہے، کہ امیہ کے قبیلہ کو عبدالمطلب کی خوشحالی اور شہرت سے رشک پیدا ہوا تو اس کے لڑکے حرب نے اپنی فوقیت دکھانے کی خاطر عبدالمطلب کو چیلنج دیا، لیکن ایک قریشی نے ثالث بن کر عبدالمطلب کی برتری کا فیصلہ دیا، جس کو حرب نے تسلیم نہیں کیا اسی وقت سے بنو ہاشم اور بنو امیہ میں رشک وحسد پیدا ہونا شروع ہو گیا، عبدالمطلب کے اقتدار اور طاقت میں اس وقت بھی اضافہ ہوا، جب انھوں نے مکہ کے بنو خزاعہ سے باہمی اعتماد کا معاہدہ کیا، یہ معاہدہ کعبہ میں آویزاں کیا گیا، اور جب ابرہہ نے مکہ پر کعبہ کو منہدم کرنے کے لیے حملہ کیا، تو مکہ کے لوگوں نے عبدالمطلب ہی کو اور سرداروں کے ساتھ ابرہہ کے پاس بھیجا، ابرہہ نے اس حملہ میں عبدالمطلب کے "دو سو" اونٹ پکڑ کر ضبط کر لیے تھے، عبدالمطلب ابرہہ کے پاس پہنچے، تو اس نے ان کی بڑی عزت کی، اس لیے ان کے اونٹوں کو اس امید پر واپس کر دیا، کہ وہ کعبہ کے منہدم کرنے میں مدد دیں، عبدالمطلب نے اس کی بات نہیں مانی، بات آگے نہیں بڑھی، عبدالمطلب مکہ واپس آتے، اپنے لوگوں کو تو پہاڑوں کی طرف چلے جانے کو کہا، لیکن کعبہ کے دروازے پکڑ کر دعا کی، کہ اے اللہ اپنے گھر کو بچا لے، اور صلیب کو اس پر فتح نہ عطا کر اس کے بعد ابرہہ کی فوج میں وبا پھوٹ پڑی، وہ واپس ہوئی تو سمندر میں غرقاب ہو گئی، اور ابرہہ بھی صنعا پہنچتے ہی مرگیا، (دی لائف آف محمد، دیباچہ ۱۱ × ۷ c)

میور کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالمطلب اپنے زمانہ کے اہم ترین، معزز ترین اور متمول ترین سرداروں میں تھے، مگر منٹگمری واٹ کی تحریروں سے ان باتوں کی تردید ہوتی ہے، ان کا خیال ہے کہ حرب بن امیہ اور عبدالمطلب کے حریف ہونے کی روایت مشکوک ہے، کیونکہ یہ بات زیادہ تفصیل سے نہیں بیان کی گئی ہے، پھر وہ یہ کہتے ہیں، کہ عبدالمطلب ابرہہ سے مکہ کے تمام لوگوں کی طرف سے نہیں ملے بلکہ ایک اقلیت کی طرف سے نمایندگی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اور ابرہہ سے جا کر ملنے کی پالیسی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے قبیلہ کی حالت بدتر ہوتی جا رہی تھی، اس قسم کے اندازے لگانا ایک مورخ کے شایان شان نہیں، بہرحال میور اور منٹگمری میں کون صحیح ہے، اس کا اندازہ لگانے کے بجائے یہ تو آسانی سے کہا جا سکتا ہے، کہ یورپی اہل قلم اپنی مرضی کے مطابق جو چاہیں لکھیں اور اپنے زور قلم سے

لکھ کر ناظرین کو متاثر کریں۔ ڈی یسی جانسٹن نے اپنا زور قلم یہ لکھ کر دکھایا ہے کہ زمزم کی کھدائی کے بعد عبدالمطلب کا رتبہ اور اقتدار اپنے باپ سے زیادہ بڑھ گیا تھا، اور جو فضیلت قصی کو حاصل تھی، وہ ان کو حاصل ہوگئی، اور ان کی شہرت بڑی بلندی پر اس وقت پہنچی، جب ان کی وفات سے آٹھ سال پہلے ابرہہ نے مکہ پر حملہ کیا، لیکن وبا سے اپنی فوج سمیت موت کے گھاٹ اترا۔ (ص ۴۰-۳۹)

حلف الفضول کی تفصیل طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۸۲ کے حوالے سے مولانا شبلیؒ نے یہ لکھی ہے کہ لڑائیوں کے متواتر سلسلہ نے سیکڑوں گھر برباد کر دیئے تھے، قتل و سفاکی موروثی اخلاق بن گیے تھے، یہ دیکھ کر بعض طبیعتوں میں اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی، جنگ فجار سے لوگ واپس ہوئے، تو زبیر بن عبدالمطلب نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور خاندان کے سرگروہ تھے، یہ تجویز پیش کی چنانچہ خاندان ہاشم زہرہ اور تیم عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جمع ہوئے، اور معاہدہ ہوا کہ ہم میں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کریگا، اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس معاہدہ میں شریک تھے، اور عہد نبوت میں فرمایا کرتے کہ معاہدہ کے مقابلے میں اگر مجھ کو سرخ رنگ کے اونٹ بھی دیئے جاتے، تو میں نہ بدلتا، اور آج بھی ایسے معاہدہ کے لیے بلایا جائے تو میں حاضر ہوں، (سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۱۸۳)

اب اسی بات کو مصنف نے کیا سے کیا کر دیا ہے، وہ پڑھنے کے لائق ہی لکھتے ہیں:

کچھ دنوں کے لیے بنو ہاشم کی قیادت زبیر بن عبدالمطلب کے سپرد کر دی گئی، یہ فجار اور حلف الفضول کا زمانہ تھا، زبیر کو کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں ہوئی، حلف الفضول کمزور قبیلوں کے اتحاد کا معاہدہ تھا، اس میں نمایاں حصہ عبداللہ بن جدعان نے لیا، کیونکہ اس کا اجتماع اس کے گھر میں ہوا تھا، وہ فجار کے موقع پر مکہ کے اہم آدمیوں میں تھا، (ص ۳۲)

اوپر کی سطروں میں تو یہ لکھ گیے ہیں کہ حلف الفضول کمزور قبیلوں کا باہمی معاہدہ تھا لیکن آگے چل کر لکھتے ہیں۔

فجار کی جنگ اس وقت ہوئی جب محمد پندرہ[۱۵] اور بیس[۲۰] کی عمر کے درمیان تھے، اور کہا جاتا ہے کہ اس لڑائی میں اپنے چچاؤں کی طرف سے اس میں تھوڑا حصہ لیا، وہ حلف الفضول کے موقع پر شاید موجود تھے

کہا جاتا ہے کہ بعد میں اس کی تعریف بھی کی، اس معاہدہ کا مقصد نسبتہً مضبوط تر اور متمول تر قبیلوں کی بدعنوانیوں کے خلاف انصاف کو برقرار رکھنا تھا، اور یہ مقصد قرآن کی تعلیمات کے بعض مقصد سے بہت قریب تھا (ص ۲۳)
مولانا شبلیؒ کے بیان سے تو ظاہر ہے کہ یہ معاہدہ اس لیے ہوا کہ ہر شخص مظلوم کی حمایت کریگا، اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا، لیکن مصنف نے اپنی طرف سے یہ اختراع کیا، کہ یہ معاہدہ مضبوط اور متمول قبیلوں کیخلاف کمزور قبیلوں کی طرف سے تھا، دونوں تعبیروں میں کافی فرق ہے،

زبیر بن عبدالمطلب کی نمایاں حیثیت کو مصنف نے اس لیے کم کرنے کی کوشش کی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے، وہ ابوطالب کی بھی اچھی تصویر نہیں کھینچتے، وہ لکھتے ہیں کہ ابوطالب اپنے قبیلہ کے سردار تھے، لیکن مولانا شبلیؒ کی یہ تحقیق ہے کہ عبدالمطلب کی مسند ریاست پر حرب متمکن ہوا، جو بنو امیہ کا نامور فرزند تھا، مناصب ریاست میں صرف سقایہ یعنی حجاج کو پانی پلانا عباس کے ہاتھ میں رہا، جو عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے، (سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۷۷-۷۶) ابوطالب برابر تجارت کرتے رہے لیکن مصنف کا بیان ہے کہ ان کی غربت کی وجہ سے محمدؐ ان کے لڑکے علی کو اپنے ساتھ رکھنے لگے، یہ صورت حال اس لیے پیدا ہوئی تھی کہ ابوطالب میں نمایاں خوبیاں نہ تھیں، پھر عبدالمطلب کی وفات سے پہلے اس قبیلہ کا زوال بھی شروع ہو گیا تھا، (ص ۳۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد بزرگوار کے متعلق مصنف کا بیان ہے کہ وہ شاید محمدؐ کی پیدائش سے پہلے وفات پا گیے تھے (ص ۳۳) اور محمد کی پیدائش شاید ان کی والد کی وفات کے بعد ہوئی، (ص ۳۳)
مصنف نے اس تحریر میں "شاید" لکھ کر اپنی تحقیق کا کچھ اچھا نمونہ پیش نہیں کیا، کیونکہ اس میں کسی کو شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کی وفات ان کی پیدائش سے پہلے ہو گئی تھی، میور نے واضح طور پر لکھا ہے کہ ان کی وفات محمدؐ کی پیدائش سے پہلے ہی ہو گئی تھی، (باب اول ص ۴) مارگولیتھ نے تو صاف طور پر لکھا ہے کہ یہ یقینی ہے کہ مستقبل کے پیغمبر کے والد کی وفات بیٹے کی پیدائش سے پہلے ہو گئی (ص ۴۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیلہ کی اہمیت کو مصنف نے اپنی معروضی تحقیق سے ایک بار پھر گھٹانے کی کوشش کی، پہلے تو یہ لکھتے ہیں کہ مجموعی حیثیت سے یہ اثر پڑتا ہے کہ محمدؐ کا قبیلہ مکہ کی زندگی میں ایک

زمانے میں آ گے آگے تھا، لیکن محمدؐ کے مشن کے آغاز سے پہلے یہ زوال پذیر تھا، یہ محض کمزور اور غریب قبیلوں کا ایک نمایاں رکن تھا، اس کے افراد شام کی تجارت سے دلچسپی لیتے رہے، لیکن شاید عبد شمس اور مخزوم قبیلوں کی طرح بڑی تجارت کے حصہ دار نہ تھے، (ص ۳۳) مصنف کا سخن تکیہ شاید اور غالباً ہے، اس کی آڑ لے کر وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں، شاید اور غالباً جیسے الفاظ کبھی مورخانہ تحقیق پر دلالت نہیں کرتے،

مصنف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کی تاریخ ۵۷۰ء لکھی ہے، اس کے لیے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، صرف یہ لکھ دیا ہے کہ عام طور سے یہی خیال کیا جاتا ہے، میور نے یہی تاریخ لکھی ہے، مارگولیتھ نے کوئی تاریخ نہیں لکھی ہے، ارونگ نے ۵۶۹ء کی تاریخ لکھی ہے، (ص ۲۴) مولانا شبلیؒ نے ولادت کی تاریخ ۹ ربیع الاول روز دوشنبہ مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء لکھی ہے، اس کی سند میں رقم طراز ہیں کہ مصر کے مشہور ہیئت داں عالم محمود پاشا فلکی نے ایک رسالہ میں دلائل ریاضی سے یہی تاریخ ثابت کی ہے، (سیرۃ النبیؐ ص ۱۷۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی زندگی کے جو واقعات قصے کے طور پر درج ہیں، ان کے متعلق مصنف کا طرز استدلال وہی ہے، جو عام طور سے ان کی اس کتاب میں ہے، وہ کہتے ہیں کہ آپ کی شادی سے پہلے کے بہت سے قصے ہیں، جو دینی انداز کے ہیں، مگر ایک سیکولر مورخ کے نزدیک صحیح نہیں ہیں، یہ اس لیے بھی کہ ان واقعات کا ذکر محمدؐ کی آیندہ زندگی میں نہیں کیا جاتا، اور نہ ان کی کوئی سند ہے، اس کے بعد اپنی تحریر کا رخ بدل کر کہتے ہیں کہ راسخ العقیدہ مسلمان ان کو اہمیت دیتے ہیں، اس لحاظ سے وہ ان کے لیے سچے ہیں، اور ان کے پیغمبر کی زندگی کے آغاز کا ایک مناسب دیباچہ ہے، اور پھر وہ اپنے شاید سے کام لے کر لکھتے ہیں، کہ شاید ان کے بیان کرنے کا طریقہ ایسا ہے کہ جیسے یہ آنکھوں دیکھا حال ہے، اور مثال میں ابن اسحاق کی کتاب سے وہ سارے قصے چار صفحے میں نقل کر دیے گئے ہیں، جو آپؐ کے ایام رضاعت سے سفر شام تک بیان کیے گیے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ:

حضرت حلیمہ سعدیہ آپ کی رضاعت کے لیے تیار ہو گئیں، تو ان کو اتنا دودھ ہونے لگا، کہ آپؐ کے ساتھ آپ کا رضاعی بھائی بھی خوب سیر ہو کر دودھ پینے لگا، اور جب وہ مکہ سے اپنے گھر واپس جانے لگیں

تو ان کی اونٹنی نے راستہ میں خوب دودھ دیا، اور اسی طرح برابر دیتی رہی، اور جس گدھی پر سوار ہوئیں وہ بہت تیز چلنے لگی، اور جس چراگاہ میں ان کی اونٹنی چرنے جاتی، وہ بہت شاداب رہنے لگی، پھر اس میں آپ کے شق صدر کی تفصیل بھی ہے، اور یہ بھی ہے کہ خود حضرت آمنہ نے بیان کیا کہ آپؐ جب پیٹ میں تھے، تو ان کے اندر سے ایک نور نکلا جس نے بصرہ کے محل کو منور کر دیا، پھر اس میں حضرت ابو طالب کے ساتھ آپؐ کے سفر شام کا ذکر ہے، جہاں عیسائی راہب سے ملاقات ہوئی، اس نے آپؐ کی نبوت کی بشارت دی، اور بہت سی نصیحتیں کیں،

ابن اسحٰق کی یہ تمام روایتیں غیر مستند سمجھی گئی ہیں، حضرت حلیمہ سعدیہ کی رضاعت کے سلسلہ میں جو قصے بیان کیے گیے ہیں، ان کو غیر معتبر سمجھ کر مولانا شبلیؒ نے بالکل رد کر دیا ہے، اور اپنی کتاب میں اس کا ذکر کرنا بھی پسند نہیں کیا ہے، انھوں نے شق صدر کے واقعہ کا بھی حوالہ نہیں دیا، سر سید احمد خاں نے اپنے خطبات احمدیہ میں اس کی پرزور تردید کی، اور لکھا کہ عیسائی مصنف ایک بڑی غلطی میں پڑے ہیں، وہ اپنے یہاں کی مقدس کتابوں کو جن میں کتب تواریخ اور سیر ملوک اور قضاۃ وغیرہ داخل ہیں، اور توریت و انجیل کے ان تمام مقاموں کو جن میں تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں، بمنزلہ وحی یعنی کلام الٰہی کے برابر سمجھتے ہیں اور ان سب کو ہر طرح کی غلطی اور خطا سے پاک جانتے ہیں، حالانکہ ان میں بہت سی غلطیاں پائی جاتی ہیں اسی طرح انھوں نے خیال کر لیا ہے کہ مسلمان بھی اپنی حدیثوں اور روایتوں کو ایسا ہی بے نقص سمجھتے ہونگے، اور اس خیال خام سے انھوں نے مسلمانوں کی تمام حدیثوں کو ناقابل خطا تصور کر کے اسلام پر نہایت سخت طعن و تشنیع کی ہے، حالانکہ وہ خود بڑی غلطی میں پڑے ہیں، کیونکہ مسلمان اپنے یہاں کی روایات و احادیث کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں، جیسے کہ اور تواریخ کے واقعات کو دیکھتے ہیں، اور ان کو یونہی ممکن الخطا خیال کرتے ہیں، مسلمان اپنے یہاں کی حدیثوں اور روایتوں کو اس وقت صحیح سمجھتے ہیں، جب ان کے لیے کافی ثبوت اور معتمد سند پاتے ہیں، ورنہ ان کی کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتے، یہ روایتیں جو شرح السنہ اور دارمی میں مذکور ہیں، صحت سے بہت دور ہیں، بعض علمائے اسلام ان کو محض ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں، اور بیہودہ افسانے خیال کرتے ہیں، جو محض جہلاء کو خوش کرنے کیلئے گڑھے گیے ہیں، پس عیسائی مورخوں نے اس بات میں

بڑی غلطی کی ہے کہ ان نامعتبر روایتوں کی بنیاد پر اسلام پر اعتراض کیا ہے، (خطبات احمدیہ صفحہ ۲۶۴-۲۶۵)
سرسید نے یہ بات آج سے ۱۱۲ برس پہلے لکھی تھی، مگر یہ مستشرقین جن میں منٹگمری واٹ بھی شامل ہیں، دوسروں کی کب سنتے ہیں، وہ تو اپنی سی کہنا جانتے ہیں، اسی طرح بحیرا کی ملاقات کی روایت کو مولانا شبلی نے بالکل ساقط الاعتبار قرار دیا، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:
سرولیم میور، ڈریپر اور مارگیولس وغیرہ سب اسی واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں، اور اس بات کے مدعی ہیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہب کے حقایق واسرار اسی راہب سے سیکھے اور جو نکتے اس نے بتا دیئے تھے، اسی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی، اسلام کے تمام عمدہ اصول ان ہی نکتوں کے شروح اور حواشی ہیں،
مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں، کہ بحیرا کی ملاقات میں اس کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں ملتا، حقیقت یہ ہے کہ اس ملاقات کی روایت ہی بالکل ناقابل اعتبار ہے، اس کے جس قدر طریقے ہیں، سب مرسل ہیں، یعنی راوی اول واقعہ کے وقت خود موجود نہ تھا، اور اس راوی کا نام نہیں بیان کرتا، جو شریک واقعہ تھا، (سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۸۰)
منٹگمری واٹ نے ابن اسحٰق کی ان روایتوں کو یکجا کرکے اپنی علمی تحقیق کا ثبوت دیا ہے، تو ان کی یہ تحقیق سعی نا مشکور ہے، اور ان کو نقل کرکے ان کی تضحیک کرنا مقصود ہے، تو مسلمان محققین کب ان کو قابل اعتبار سمجھتے ہیں، جو ان کی تضحیک سے وہ متاثر ہو جائیں گے، یا اگر وہ واقعی ان کو اس لیے مستند اور صحیح سمجھتے ہیں، کہ یہ ابن اسحاق کی روایتیں ہیں، تو پھر ابن اسحاق کی اگر ہر روایت اور ہر رائے صحیح ہے تو ابن ہشام اور واقدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کے بھی قائل اور دعوی دار ہیں، پھر منٹگمری واٹ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن مجید کے الہامی کتاب ہونے کا قائل اسی طرح ہونا چاہیے، جس طرح ابن اسحاق، ابن ہشام اور واقدی ہیں، یہ دیانت دارانہ تحقیق نہیں کہ ان کی جو رائے مصنف کی مطلب برآری کے لیے ہو، تو وہ تو اچھالی جائے اور جو ان کے لیے قابل قبول نہ ہو اس سے انکار کیا جائے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس برس کی تھی جب کہ آپ پچیس برس کے تھے۔ مصنف نے یہ لکھ کر نیش زنی کی ہے، کہ حضرت خدیجہؓ کی عمر بتانے میں شاید مبالغہ کیا گیا ہے، شاید یہ لکھ کر اپنے ظنیات کا ثبوت تو ضرور دے دیا ہے، اور اس طرح وہ اپنی ذمہ داری سے بھی ماہرانہ طور پر برأت کر سکتے ہیں، لیکن اگر یہ عمر بتانے میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے تو اس کی کوئی سند نہیں پیش کرتے، بلکہ یہ لکھتے ہیں کہ حضرت خدیجہؓ کے آٹھ اولاد ہوئی، اور اگر ہر سال ہوتی رہی تو آخری اولاد ان کے ۴۸ ویں سن میں ہوئی، لکھتے ہیں کہ یہ ناممکن بات نہیں، لیکن اس پر کافی رائے زنی ہو سکتی ہے ممکن ہے کہ اس کو اعجاز پر محمول کیا گیا ہو، لیکن ابن ہشام، ابن سعد اور طبری میں اس پر کوئی رائے زنی نہیں، پھر ہمارے مصنف کو رائے زنی کر کے چھیڑ خانی کی کیا ضرورت تھی، اسی طرح محض قیاس کر کے یہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی، کہ خدیجہ اتنی دولت مند نہیں رہی ہوں گی، جتنی کہ کہا جاتا ہے، اور پھر ان کے قیاسات پر مبنی ان کے استدلال کا یہ رنگ ہے کہ خیال ہے کہ محمدؐ کے پاس بھی کافی سرمایہ ہو گیا ہوگا کیونکہ وہ تجارت میں معتدلانہ انداز میں حصہ لیتے رہے، اس کی کوئی سند نہیں ہے، کہ وہ شام پھر نہیں گئے، لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ وہ شام نہیں گئے یا یہ ممکن ہے کہ اپنی تجارت کی نگرانی دوسروں کے ذمہ کر دی ہوگی، اس امکان کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے، کہ وہ تاجروں کے اندرونی حلقہ اور اس سودمند کاروبار سے بدر کر دیے گئے، لیکن یہ بھی سمجھنا صحیح نہیں کہ وہ بالکل بدر کر دیے گئے تھے کیونکہ انھوں نے اپنی لڑکی زینب کی شادی عبد شمس کے قبیلہ کے ایک رکن سے کی، جو خدیجہ کے بھتیجے تھے، ان کی دو لڑکیاں ابولہب کے لڑکوں سے منسوب تھیں، یہ اس لیے کہ ابولہب کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ شاید وہ بنو ہاشم کے مستقبل کا آدمی ہو، اس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محمدؐ کو بھی قبیلہ کے ہونہار نوجوانوں میں تصور کیا جانے لگا تھا، ان قیاسات اور ظنیات کے مجموعوں سے مصنف کے تحقیقی رنگ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل ہوئی، اس کے متعلق بھی مصنف نے عجیب و غریب بحث چھیڑ دی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی سے متعلق مسلمانوں کا جو عقیدہ ہے وہ بخاری شریف

کی اس حدیث سے ظاہر ہو گا کہ عبداللہ بن یوسف، مالک، ہشام ابن عروہ کی ام المومنین سے روایت ہے، کہ حارث بن ہشام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کبھی میرے پاس گھنٹے کی آواز کی طرح آتی ہے، اور وہ مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے، اور جب میں اسے یاد کر لیتا ہوں جو اس نے کہا تو وہ حالت مجھ سے دور ہو جاتی ہے، اور کبھی فرشتہ آدمی کی صورت میں میرے پاس آتا ہے، اور مجھ سے کلام کرتا ہے، اور جو وہ کہتا ہے، اسے میں یاد کر لیتا ہوں، حضرت عائشہ نے بیان کیا کہ میں نے سخت سردی کے دنوں میں آپؐ پر وحی نازل ہوتے ہوئے دیکھا، پھر جب وحی موقوف ہو جاتی تو آپ کی پیشانی سے پسینہ بہنے لگتا، (کتاب الوحی باب ۱)

اسی کے بعد اس پہلی وحی کا ذکر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، اس پوری حدیث کا اردو ترجمہ یہ ہے:

"یحییٰ بن بکیر، لیث عقیل ابن شہاب، عروہ بن زبیر، ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ سب سے پہلے وحی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اترنا شروع ہوئی وہ اچھے خواب تھے، جو بحالت خواب آپ دیکھتے تھے، چنانچہ جب بھی آپ خواب دیکھتے تو وہ صبح کی روشنی کی طرح ظاہر ہو جاتا، پھر تنہائی سے آپ کو محبت ہونے لگی، اور غار حرا میں تنہا رہنے لگے، اور قبل اس کے کہ گھر والوں کے یہاں آنے کا شوق ہو، وہاں تحنث کیا کرتے، تحنث سے مراد کئی رات عبادت کرنی ہے' اور اس کے لیے توشہ لیتے، یہاں تک کہ جب وہ غار حرا میں تھے حق آیا، چنانچہ ان کے پاس فرشتہ آیا، اور کہا پڑھ، آپؐ نے فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، آپ بیان کرتے ہیں کہ مجھے فرشتہ نے پکڑا، اور مجھے زور سے دبایا، یہاں تک کہ مجھے تکلیف محسوس ہوئی پھر مجھ کو چھوڑ دیا، اور کہا پڑھ، میں نے کہا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، آپ فرماتے ہیں کہ پھر تیسری بار پکڑ کر مجھے زور سے دبایا، پھر چھوڑ دیا، اور کہا پڑھ اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ. خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دہرایا، اس حال میں کہ آپ کا دل کانپ رہا تھا، چنانچہ حضرت خدیجہ

بنت خویلد کے پاس آئے، اور دوبارہ فرمایا کہ مجھے کمبل اوڑھادو، تو لوگوں نے اوڑھادیا، یہانتک کہ آپ کا ڈر جاتا رہا، حضرت خدیجہؓ سے سارا واقعہ بیان کرکے فرمایا کہ مجھے اپنی جان کا ڈر ہے، حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ ہرگز نہیں، خدا کی قسم اللہ تعالےٰ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا، آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں، ناتوانوں کا بوجھ اپنے اوپر لیتے ہیں، محتاجوں کے لیے کماتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، اور حق کی راہ میں مصیبتیں اٹھاتے ہیں، پھر حضرت خدیجہؓ آپ کو لے کر ورقہ بن نوفل ابن اسد بن عبدالعزیٰ کے پاس گئیں، جو حضرت خدیجہؓ کے چچازاد بھائی تھے، ایام جاہلیت میں نصرانی ہوگیے تھے، اور عبرانی کتاب لکھا کرتے تھے، چنانچہ انجیل کو عبرانی زبان میں لکھا کرتے تھے، جس قدر اللہ تعالیٰ چاہتا، وہ نابینا اور بوڑھے ہوگیے تھے، ان سے حضرت خدیجہؓ نے کہا، اے میرے چچازاد بھائی، اپنے بھتیجے کی بات سنو آپؐ سے ورقہ نے کہا، اے میرے بھتیجے تم کیا دیکھتے ہو، تو جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تھا، بیان کردیا، ورقہ نے آپؐ سے کہا کہ یہی وہ ناموس ہے جو اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰؑ پر نازل فرمایا تھا، کاش میں جوان ہوتا، کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا، جب تمہاری قوم تمہیں نکال دیگی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا وہ مجھے نکال دیں گے، ورقہ نے فرمایا ہاں جو چیز تو لے کر آیا ہے، اس طرح کی چیز جو بھی لے کر آیا، اس سے دشمنی کی گئی، اگر میں تیرا زمانہ پاؤں تو میں تیری پوری مدد کروں گا، پھر زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ ورقہ کا انتقال ہوگیا، اور وحی کا آنا کچھ دنوں کے لیے بند ہوگیا۔

"ابن شہاب نے کہا مجھ سے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے بیان کیا کہ جابر بن عبداللہ انصاریؓ وحی کے رکنے کی حدیث بیان کررہے تھے، تو اس حدیث میں بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرمارہے تھے، کہ ایک بار میں جارہا تھا، تو آسمان سے ایک آواز سنی، نظر اٹھا کر دیکھا، تو وہی فرشتہ تھا جو میرے پاس حرا میں آیا تھا، آسمان و زمین کے درمیان کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، مجھ پر رعب طاری ہوگیا، اور واپس لوٹ کر میں نے کہا، مجھے کمبل اوڑھادو، مجھے کمبل اوڑھادو، تو اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنذِرْ وَرَبَّكَ — اے محمدؐ! جو کپڑا لپیٹے پڑے ہو، اٹھو اور

فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ (مدثر ۱ تا ۵) ہدایت کرو، اور اپنے پرورگار کی بڑائی کرو اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو اور ناپاکی سے دور رہو۔

پھر وحی کا سلسلہ گرم ہو گیا، اور لگاتار آنے لگی" (بخاری شریف باب اوّل)

بخاری شریف کے اس باب میں یہ حدیث یہاں پر ختم ہو جاتی ہے، دوسری جگہ کتاب التعبیر میں بھی یہی حدیث نقل کی ہے جس کے آخر میں کچھ فرق واضافہ ہے، اس کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو،

" پھر زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا، اور وحی کا سلسلہ کچھ دنوں کے لیے منقطع ہو گیا، (امام زہری فرماتے ہیں) جیسا کہ حدیثوں سے ہم کو معلوم ہوا ہے وحی کا سلسلہ رک جانے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر غمگین اور رنجیدہ ہوئے، کہ کئی مرتبہ آپ صبح کو اس ارادہ سے پہاڑوں پر گئے کہ اپنے آپ کو ان کی چوٹی سے گرا دیں، جب آپ کسی چوٹی پر پہنچے کہ اپنے آپ کو نیچے گرائیں، تو حضرت جبریلؑ ظاہر ہوتے، اور فرماتے، اے محمد! بلاشبہ آپ خدا کے برحق رسول ہیں یہ سن کر آپ کا قلق و اضطراب ختم ہو جاتا، اور دل مطمئن ہو جاتا، اور آپ واپس تشریف لاتے، (بخاری کتاب التعبیر جلد دوم ص ۱۰۳۴ مطبوعہ کرزن پریس دہلی)

اس حدیث میں کوئی ایسی بات نہیں، جو اس لیے سمجھ میں نہ آئے کہ یہ گنجلک ہی، منٹگمری واٹ نے اس حدیث کا سہارا لے کر بڑی گنجلک بحث چھیڑ دی ہی، مگر یہ حدیث بخاری شریف سے نہیں لی، بلکہ طبری سے لی ہے، یہ اس لیے کہ طبری میں ان کی مطلب برآری اور چھیڑ چھاڑ کے لیے کچھ باتیں مل گئی ہیں طبری نے ابن زہری ہی کے حوالہ سے یہ حدیث لکھی ہے، مگر اس کے لکھنے میں بخاری شریف کی حدیث سے جو اختلاف پیدا ہو گیا ہے، وہ پڑھنے کے بعد ہی ظاہر ہوگا، مصنف نے اس کا جو انگریزی ترجمہ دیا ہے، اس کا اردو ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے، مصنف نے اپنی بحث کی خاطر اس کو علٰحدہ علٰحدہ خانوں میں لکھا ہے،

(۱) نعمان بن راشد زہری سے روایت کرتے ہیں، وہ عروہ سے اور عروہ حضرت عائشہ رضؓ

سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ وحی سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رویائے صادقہ سے شروع ہوئی، جو صبح صادق کے مانند ہوا کرتے تھے،

(ب) اس کے بعد آپ کو تنہائی محبوب ہوگئی، آپ غارِ حرا میں چلے جاتے، اور وہاں تحنث میں کئی راتوں تک مشغول ہو جاتے، قبل اس کے کہ اپنے گھر والوں کے پاس واپس آتے، وہ ان کے پاس آتے اور سامان لے کر اسی طرح واپس ہو جاتے، یہاں تک کہ خلاف امید آپؐ کے پاس حق آیا، اور کہا کہ اے محمدؐ آپ اللہ کے رسول ہیں،

(ج)، انھوں نے یعنی محمدؐ نے فرمایا کہ میں سوچ رہا تھا، کہ میں اپنے کو پہاڑ کی چوٹی سے گرا دوں، جب ایسا سوچ رہا تھا، تو وہ میرے سامنے نمودار ہوا، اور کہا، اے محمدؐ! میں جبریل ہوں، اور آپؐ اللہ کے رسول ہیں،

(د) تب اس نے کہا پڑھ، میں نے کہا میں پڑھ نہیں سکتا ہوں، محمدؐ نے کہا تب اس نے مجھے پکڑا، اور تین بار بڑے زور سے دبوچا، یہاں تک کہ میں بے جان ہو گیا، تب اس نے کہا کہ پڑھ، اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ...... اور میں نے پڑھا،

(س) پھر میں خدیجہؓ کے پاس آیا، اور کہا مجھے اندیشہ ہے، اور پھر اپنا واقعہ بیان کیا، تب انھوں نے کہا، خوشخبری ہو، خدا کی قسم، اللہ آپ کو پریشانی میں نہ ڈالے گا، آپؐ رشتہ داروں کے لیے بھلائی کرتے ہیں، آپؐ سچ بولتے ہیں، آپؐ امانت کو واپس کرتے ہیں، آپؐ تکان برداشت کرتے ہیں، آپ مہمان نواز ہیں، اور حق کے حامیوں کی مدد کرتے ہیں،

(ص)، پھر وہ مجھے ورقہ بن نوفل بن اسد کے پاس لے گئیں، اور ان سے کہا کہ اپنے بھائی کے لڑکے ... کی سنیے، انھوں نے پوچھا تو میں نے اپنا واقعہ بیان کیا، تب انھوں نے کہا کہ یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰ بن عمران پر نازل ہوا، کاش میں جوان ہوتا

اور اس وقت تک زندہ رہتا، جب آپ کا قبیلہ آپ کو نکالے گا، میں نے کہا کہ کیا وہ مجھے نکال دے گا، انھوں نے کہا، جب کوئی آدمی ایسا پیام لایا جیسا آپ لائے ہیں، تو وہ اپنے دشمنوں سے ستائے بغیر نہیں رہا، اگر آپ کا وہ دن میرے سامنے آیا، تو میں آپ کی مدد پورے طور پر پورے زور سے کروں گا"

(ع) اقرء کے بعد قرآن کا جو پہلا حصہ میرے اوپر نازل ہوا، وہ یہ تھا،

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ
مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ
وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ
وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ
فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۝

(قلم-۱ تا ۵)

ن، قلم کی اور جو (اہل قلم) لکھتے ہیں اس کی قسم، یا کہ (اے محمد) تم اپنے پروردگار کے فضل سے دیوانے نہیں ہو، اور تمہارے لیے بے انتہا اجر ہے اور اخلاق تمہارے بہت (عالی) ہیں سو عنقریب تم بھی دیکھ لوگے، اور یہ (کافر) بھی دیکھ لیں گے،

(غ) زہری بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آنا کچھ عرصہ کے لیے بند ہو گیا، آپ بہت غمگین تھے، آپ پہاڑ کی بلند چوٹیوں پر چڑھنے لگے تاکہ وہاں سے گرائیں، لیکن جب وہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے، تو جبریلؑ نمودار ہوئے، اور کہا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اس سے آپ کی بے چینی دور ہو جاتی اور اپنے آپ میں ہو جاتے،

(ف) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے میں بیان کرتے اور کہا کہ میں ایک روز ٹہل رہا تھا کہ میں نے اس فرشتہ کو دیکھا، جو میرے پاس حرا میں آیا تھا، وہ ایک کرسی پر تھا، جو آسمان اور زمین کے بیچ میں تھی، میں خوف زدہ ہوا، اور گھر کے پاس آیا، اور کہا مجھ کو ڈھانک دو،

(ق) ہم نے آپ کو ڈھانک دیا، یعنی آپ کے اوپر دثر ڈال دیا، خدا نے اس پر یہ آیت اتاری۔ یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ "اے اوڑھ کر لیٹنے والے اٹھ، خبردار کر، اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کر، اور اپنے کپڑے پاک رکھ"

(ک) الزہری کا بیان ہے، آپ پر جو آیتیں پہلے اتریں، وہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ۔

منٹگمری واٹ اتنا لکھنے کے بعد یہ بھی تحریر کرتے ہیں، الزہری نے جو ابن شہاب کے نام سے بھی جانے جاتے تھے، یہ روایت بھی بیان کی ہے، کہ جابر بن عبداللہ انصاریؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے رُک جانے کے سلسلہ میں فرمایا کہ جب میں ٹہل رہا تھا، ...... یہاں تک لکھنے کے بعد مصنف لکھتے ہیں، کہ اس روایت میں راوی کے بدلے ہوتے نام کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، اور یہ کہا گیا ہے کہ مجھے ڈھانکو، اور دثار اڑھا دیا گیا، یہاں پر مصنف نے پوری روایت نقل نہیں کی، پوری روایت یہ ہے،

"میں چہل قدمی کر رہا تھا، میں نے آسمان سے ایک آواز سنی، میں نے اپنا سر اٹھایا، تو وہی فرشتہ تھا، جو میرے پاس حرا میں آیا تھا، وہ ایک کرسی پر بیٹھا تھا، جو زمین اور آسمان کے درمیان تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، میں اس سے ڈرا، میں گھر آیا، اور کہا مجھے ڈھانکو، مجھے ڈھانکو، تو لوگوں نے مجھے چادر اڑھائی، پھر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی:

یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ، قُمْ فَاَنْذِرْ، وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ، وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ	اے (محمدؐ) جو کپڑا لپیٹے پڑے ہو اٹھو اور ہدایت کرو، اور اپنے پروردگار کی بڑائی کرو، اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو
(مدثر ۱ تا ۴)	

آپؐ فرماتے ہیں، کہ پھر وحی مسلسل آنے لگی،

اتنا کچھ حذف کرنے کے بعد مصنف کا بیان ہے، کہ جابر کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے، سورہ المدثر

پہلی وحی ہے، (ص ۱۴۱-۱۴۰)

اب سوال یہ ہے کہ مصنف نے بخاری شریف کی روایت کے بجائے طبری کا سہارا کیوں لیا، بخاری شریف کی حدیثیں طبری کی منقولہ حدیثوں سے زیادہ معتبر اور مستند ہیں، بخاری شریف اور طبری دونوں کی روایت میں یہ ہے کہ پہلے اقرأ والی آیتیں نازل ہوئیں، پھر کچھ دنوں وحی کا آنا رک گیا پھر جب آئی تو پہلے المدثر کی آیتیں نازل ہوئیں،

اس کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کی بحث چھیڑ دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ محمدؐ کی نبوت کا آغاز رویائے صادقہ سے ہوا، اور یہ بتاتے ہیں کہ خواب اور رویائے صادقہ میں فرق ہے، اور وہ سورۂ والنجم کا سہارا لیتے ہیں، جس کے انگریزی ترجمہ سے وہ خود گمراہ ہوئے ہیں، اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیا، اس سورہ میں رویائے صادقہ کا مطلق ذکر نہیں، بلکہ وحی کا لفظ آیا ہے، اس سورہ کی جن آیتوں کا انگریزی ترجمہ ہے ان کو ذیل میں نقل کر کے ہم اپنے ناظرین کے لیے اردو ترجمہ بھی دے رہے ہیں، جو مولانا مودودی کا کیا ہوا ہے،

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى مَا ضَلَّ	قسم ہے تارے کی جب کہ وہ غروب ہوا،
صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَمَا يَنْطِقُ	تمہارا رفیق نہ بھٹکا ہے، نہ بہکا ہے، وہ
عَنِ الْهَوٰى، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ	اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا، یہ تو
يُّوْحٰى عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى،	ایک وحی ہے، جو اس پر نازل کی جاتی
ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى وَهُوَ	ہے، زبردست قوت والے نے تعلیم
بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى، ثُمَّ دَنَا	دی ہے، جو بڑا صاحب حکمت ہے، وہ
فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ	سامنے آ کھڑا ہوا، جب کہ وہ بالائی افق
اَوْ اَدْنٰى فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ	پر تھا، پھر قریب آیا، اور اوپر معلق ہو گیا،
مَا اَوْحٰى، مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا	یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے
رَاٰى، اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى	کچھ کم فاصلہ رہ گیا، تب اس نے اللہ کے

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى، عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى، اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝

(النجم: رکوع ۱)

بندے کو وحی پہنچائی تھی، نظر نے جو کچھ دیکھا، دل نے اس میں جھوٹ نہیں ملایا اب کیا تم اس چیز پر اس سے جھگڑتے ہو، جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے، اور ایک مرتبہ پھر اس نے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اس کو اترتے دیکھا، جہاں پاس ہی جنۃ الماویٰ ہے، اس وقت سدرۃ المنتہیٰ پر چھا رہا تھا، جو کچھ چھا رہا تھا، نگاہ چندھیائی، نہ حد سے متجاوز ہوئی، اور اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں،

منٹگمری نے جو انگریزی ترجمہ نقل کیا ہے، اس میں مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى کا کس قدر تعجب انگیز ترجمہ دیا ہے:

"It is nothing but a Suggestion suggested"

لیکن جارج سیل نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے:

"Neither doth he speak of his own will. It is no other than a revelation which has been revealed unto him"

دونوں ترجموں میں کتنا فرق ہے، منٹگمری کے ترجمے میں اور باتیں حذف کر دی گئی ہیں، ترجمے کی آخری سطریں یہ ہیں:

He saw him too at a second descent.

by the sidra tree at the boundary, near which is the garden of abode. When the sidra tree was strangely enveloped, the eye turned not aside, nor passed its limits. verily he saw one of the greetest signs of his Lord.

ہمارے ناظرین کے سامنے اوپر قرآن مجید کی آیتیں ہیں، وہ دیکھیں کہ اوپر کا انگریزی ترجمہ کہاں تک صحیح ہے، جارج سیل کا ترجمہ یہ ہے:

One mighty in power, En [illegible]ed with understanding taught it him and he appeased in the highest parts of the horizon. Afterwards he appro-ached the prophet, until he was at a distance of two length or yet nearer and he revealed unto his servant that which he revealed. The heart of Mohammd did not falsely represent that which he saw. Will ye therefore disputa with him concerning that which he saw? He also saw him another time by the

lote Tree beyond which there is no passing near it is the garden of eternal abode. When the lote Tree covered that which it covered, his eye-sight turned not aside, neither did it wander, and he really beheld some of the greatest signs of the Lord.

منٹگمری نے بیچ کا وہ حصہ حذف کر دیا ہے، جس میں یہ ہے کہ اس نے اللہ کے بندے کو وحی پہونچائی جو وحی بھی اسے پہنچانی تھی، وہ وحی کے لفظ کو اسلیے نظر انداز کرنا چاہتے تھے کہ پھر یہ تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، کہ کلام پاک وحی کے ذریعہ نازل ہوا، اس کے بعد true vision, vision اور dream کی بحث نہیں چل سکتی تھی، وہ اپنی بحث میں جو کچھ کہتے، ان کو کہنے کا حق تھا، مگر قرآن کی آیتوں کا سہارا لے کر اپنے دعویٰ کو مستحکم کرنے کی فکر میں انھوں نے فریب اور تدلیس سے کام لیا، اور ایک ایسا ترجمہ پیش کیا، جس میں "وحی" کا ترجمہ ہی نہیں آنے پایا ہے، اگر انھوں نے نیک نیتی سے ترجمہ پر بھروسہ کیا ہے، تو ترجمہ کی نوعیت زیر بحث آجاتی، جارج سیل نے کلام پاک کا ترجمہ کرتے وقت اپنے ترجمہ کے دیباچہ میں لکھا ہے، کہ یورپ کے زیادہ تر ترجمے قابلِ اعتبار نہیں ہیں،

منٹگمری واٹ نے قرآن مجید کا ایک غلط ترجمہ پیش کر کے یہ بحث بھی چھیڑ دی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے اس وقت اللہ کو یا جبریلؑ کو دیکھا، وہ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس کے مفسرین یہی کہتے ہیں کہ اس وقت جبریلؑ نمودار ہوئے تھے، جارج سیل نے بھی اپنے ترجمہ کے فٹ نوٹ میں لکھا ہے، لیکن منٹگمری واٹ کہتے ہیں، کہ یہ خیال کرنے کے وجوہ ہیں، خود محمدؐ نے شروع میں یہی خیال کیا کہ وہ خدا کو دیکھ رہے ہیں، کیونکہ جبریلؑ کا ذکر مدنی سورتوں سے پہلے نہیں آیا ہے، الیٰ عبدہ کے معنی تو اللہ کا بندہ ہونا چاہیے، لیکن یہ ترکیب بھدی (Awkward) سی ہو جاتی ہے، جب تک فعل کے فاعل ہی خدا سمجھا

جائے۔ پھر حدیث میں جو ذکر ہے کہ حق آیا، اور کہا کہ اے محمد! آپ اللہ کے رسول ہیں، تو یہ حق سے خدا ہی مراد ہے۔ منٹگمری واٹ یہ لکھنے کو تو لکھ گئے لیکن انھوں نے جو عبارت نقل کی ہے، اس کا پورا جملہ یہ ہے کہ حق آیا اور کہا کہ اے محمد! آپ اللہ کے رسول ہیں، اگر حق سے مراد خدا ہے تو پھر یہ ہونا چاہیے، کہ حق آیا اور کہا اے محمد! آپ ہمارے رسول ہیں، اور پھر جابر کی تفسیر کا سہارا لے کر آگے جو کچھ کہتے ہیں، وہ اس قدر گنجلک ہو گیا ہے کہ اس کا سمجھنا آسان نہیں، کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتے ہیں، انھوں نے سورہ والنجم کی ایک آیت کے معنی بھی بدلنے کی کوشش کی ہے، مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی کے معنی تو یہ ہیں کہ اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں مگر ان کا خیال ہے کہ اس کے معنی یہ بھی لیے جا سکتے ہیں کہ محمدؐ نے جو کچھ دیکھا، وہ خدا کے جمال اور عظمت کی نشانی دیکھی، ان کے مذکورۂ بالا ترجمہ میں اس آیت مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی کا ترجمہ نہیں ہے، جس کے یہ معنی ہیں کہ نظر نے جو کچھ دیکھا، دل نے اس میں جھوٹ نہیں ملایا، مگر وہ یہ کہتے ہیں، کہ یہ آیت شاید بعد میں بڑھا دی گئی، وہ شاید لکھنے میں بڑے ماہر ہیں، یہاں بھی اس مہارت سے فائدہ اٹھایا ہے، یہ لکھ کر وہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے اس بات کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے، کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا تھا، اس کو ان کے دل نے اشاری صورت (symbolic) میں دیکھا، مصنف نے معلوم نہیں یہ کہاں سے معلوم کر لیا، کہ محمدؐ کا یہ خیال تھا، کہ انھوں نے شروع میں خدا کو دیکھا، اس پر وہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کا یہ خیال بالکل صحیح تو نہ تھا، لیکن ایسا خیال کرنے میں انھوں نے غلطی بھی نہیں کی اس لیے ان کا خیال ہے کہ آیت کا یہ ترجمہ ہونا چاہیے، ان کے دل نے اس کو سمجھنے میں غلطی نہیں کی، جو انھوں نے دیکھا، ان کو اصرار ہے، کہ محمدؐ نے جبریلؑ کو نہیں دیکھا تھا، بلکہ خدا ہی کو دیکھا تھا، اگرچہ حضرت عائشہؓ کی اس روایت کا بھی حوالہ دیتے ہیں، کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو نہیں دیکھا تھا، اس روایت کے بعد مصنف کا یہ ثابت کرنا کہ محمدؐ نے خدا کو دیکھا، کہاں تک صحیح ہے بات یہ ہے کہ مصنف شروع سے آخر تک اپنی تحریروں کے ذریعہ سے پُرفریب انداز میں دکھانا چاہتے ہیں، کہ کلام پاک، کلام الٰہی نہیں ہے، نہ یہ الہامی ہے، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی

نازل ہوتی رہی، اس لیے سورۂ والنجم کی مذکورۂ بالا آیتوں میں وحی کا لفظ جو دوبار آیا ہے، اس کو نظر انداز کر کے مصنف نے ایسے ترجمہ کو ترجیح دیا، جس میں وحی کا ترجمہ کرنے سے انحراف کیا گیا، اس لیے Vision اور آگے چل کر Divine eruption اور dream True vision وغیرہ کی اصطلاحات کی گنجلک بحث کر کے اپنے ناظرین کے ذہن کو گنجلک بنانے کی کوشش کی، مورخانہ اور دیانت دارانہ تجزیہ تو تھا کہ وہ صاف صاف لکھتے کہ محمدؐ کے پیروں کا خیال ہے، کہ قرآن مجید کلام الٰہی ہے، جو وحی کے ذریعہ سے محمدؐ پر نازل ہوا، مگر اس کو یہودی اور عیسائی تسلیم نہیں کرتے، بات یہاں پر ختم ہو جاتی، پھر ان کو اسلام کا مورخانہ، ناقدانہ اور عاقلانہ مطالعہ کر کے اپنی تحریروں کا پشتارہ لگانے کی ضرورت نہ ہوتی، گذشتہ ۱۴سو سال سے عیسائی مصنفین نے اسلام اور اس کے پیغمبرؐ کے خلاف کتابوں پر کتابیں لکھ کر انبار لگا دیا ہے، مگر ان کے منشا کے مطابق مسلمان ان تحریروں سے متاثر ہو کر جوق درجوق اسلام سے منحرف تو نہیں ہو رہے ہیں، بلکہ دنیا میں ان کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، اور کیا عجب کہ کسی زمانہ میں عیسائیوں سے زیادہ ان کی تعداد بڑھ جائے۔ اور اگر یہ کتابیں عیسائیوں کیلئے لکھی گئی ہیں، تو ان کے لیے ایسی کتابیں لکھی جائیں یا نہیں، وہ اپنے مذہبی عقیدہ کی بنا پر اسلام کے منکر اور مخالف بہر حال رہیں گے،

غار حرا اور تحنث کی بحث آتی ہے، تو مصنف ایک بار اپنے قیاسات بروئے کار لاتے ہیں، ایک صفحہ کی بحث میں Might be. must have been, hypothetically, probably, evidently, may have, apparently, presumably, seem to have been.

جیسے الفاظ کے سہارے اپنی مورخانہ تحقیق کا نمونہ پیش کیا ہے۔ پوری کتاب میں ایسے الفاظ کی بھرمار ہے، اور جتنی بار ان کا استعمال ہوا ہے، ان کو ایک ساتھ جمع کر دیا جائے، تو معلوم نہیں کتنے اوراق سیاہ کرنے پڑیں، وہ اسی قیاس آرائیوں کے ساتھ لکھتے ہیں، کہ محمدؐ غار حرا میں مکہ کی گرمی سے بچنے کے لیے جاتے ہوں، یا یہودیوں اور عیسائیوں کے راہبوں سے متاثر ہو کر تنہائی کی تلاش

میں گئے ہوں، یا وہاں عبادت کر کے اپنے گناہوں کی تلافی کرتے ہوں، پھر لکھتے ہیں کہ دیانتی طور پر اس طرف ذہن کو منتقل کر لیا جاتا ہے کہ اس عزلت نشینی میں vision ظاہر ہوا لیکن محمد کی پکار کی تاریخیں غیر متعین ہیں، کبھی یہ خلاف امید ظاہر ہوتی، کبھی خدیجہ اس موقع پر زیادہ دور نہ ہوتیں، اب اس تحریر سے اندازہ ہوگا کہ مصنف نے غار حرا کے تحنث کی اہمیت کس طرح کم کرنے کی کوشش کی ہے،

اس کے بعد "آپ خدا کے رسول ہیں" کے عنوان پر ڈیڑھ صفحہ کی بحث ہے، جس میں حسب معمول Must have کا استعمال تین بار، اور probable کا دو بار، اور پھر parhaps it would be natural to suppose, might be taken, presumably.

وغیرہ کے الفاظ اور فقروں کا سہارا لیا گیا ہے، لکھتے ہیں کہ:

"یہ اغلب ہے کہ یہ الفاظ "آپ خدا کے رسول ہیں" ظاہری نہ تھے، ممکن ہے کہ یہ خیالی بھی نہ رہے ہوں، بلکہ ذہنی رہے ہوں، یعنی یہ الفاظ انھوں نے کانوں سے نہیں سنے، اور نہ یہ خیال کیا، کہ وہ سن رہے ہیں، بلکہ یہ الفاظ ابلاغ کا ذریعہ تھے، جو ان کے پاس الفاظ کے بغیر پہنچے، الفاظ کی شکل رویا کے بعد دی گئی ہو" (ص ۴۶)

یہ قیاس صرف اس لیے ہے، کہ یہ ثابت کیا جائے کہ یہ سب کچھ وحی کے ذریعہ سے نازل نہیں ہوا، قرآن کے الفاظ کو Exter nor locution اور imaginative dream یا vison یا محض intellectual locution بلکہ locution divine irruption, induction of creative imagination irruption, divine imagination.

وغیرہ جیسے الفاظ اور اصطلاحات کا سہارا لے کر ناظرین کو گمراہ کیا گیا ہے، نئے نئے الفاظ اور اصطلاحات کے ذریعہ سے مصنف چاہے جس قسم کی بحث کریں، لیکن یہ کوئی نئی بحث نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے زمانے میں بھی اس قسم کی بحث چھیڑی گئی تھی، قرآن مجید میں ہے:

"کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے، کہو اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو خود ایک سورہ اس جیسی تصنیف کر لاؤ، اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بلا سکتے ہو، مدد کے لیے بلا لو، اصل یہ ہے کہ جو چیز ان کے علم کی گرفت میں نہیں آئی، اور جس کا آل بھی ان کے سامنے نہیں آیا، اس کو انھوں نے (خواہ مخواہ اٹکل پچو) جھٹلا دیا اسی طرح تو ان سے پہلے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں، پھر دیکھ لو ان ظالموں کا کیا انجام ہوا، ان میں کچھ لوگ ایمان لائیں گے، اور تیرا رب ان مفسدوں کو خوب جانتا ہے"

(یعتذرون۔ یونس ۴ع)

یہی بات تکرار کے ساتھ کہی گئی، سورہ ہود میں ہے:

"کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے، کہو اچھا یہ بات ہے تو اس جیسی گڑھی ہوئی دس سورتیں تم بنا لاؤ، اور اللہ کے سوا اور جو جو (تمھارے معبود) ہیں ان کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو تو بلا لو، اگر تم (انھیں معبود سمجھنے میں) سچے ہو، اب اگر وہ (تمھارے معبود) تمھاری مدد کو نہیں پہونچتے، تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے، اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے، پھر کیا تم اس امر حق کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہو"؟ (وما من دابۃ ۱۲۔ ہود ۱۱ ع ۲)

خود قرآن مجید میں ہے، جب کہ حضرت موسیٰؑ کو کتاب دی گئی، تو اس پر بھی اسی قسم کا اعتراض ہوا

"ہم اس سے پہلے موسیٰؑ کو بھی کتاب دے چکے ہیں، اور اس کے بارے میں بھی اختلاف کیا گیا تھا، جس طرح آج اس کتاب کے بارے میں کیا جا رہا ہے، جو تمھیں دی گئی ہے، اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے ہی طے نہ کر دی گئی ہوتی تو ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان کبھی کا فیصلہ چکا دیا گیا ہوتا، یہ واقعہ ہے کہ یہ لوگ اس کی طرف سے شک اور خلجان میں پڑے ہوتے ہیں، اور یہ بھی واقعہ

ہے کہ تیرا رب انھیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے کر رہے گا، یقیناً وہ ان کی سب حرکتوں سے باخبر ہے، پس اے نبی تم اور تمہارے وہ ساتھی جو (کفر بغاوت سے ایمان وطاعت کی طرف) پلٹ آتے ہیں ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو۔ (ہود۔ ۱۱۔ رکوع ۱۴)

مصنف نے وحی کی قسم کی بحث چھیڑ کر یہ سمجھنے پر مجبور کیا ہے، کہ دنیا میں کسی ایسی کتاب کا وجود نہیں جو وحی کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی، مسلمان کا عقیدہ یہ ہے، کہ فرشتہ خدا کا پیغام لے کر سامنے آتا ہے، اور اس کے منہ سے وہ الفاظ ادا ہوتے ہیں، جن کو سن کر نبی محفوظ کر لیتا ہے اس کو وحی کہتے ہیں، قرآن پاک کا نزول اسی طریقہ سے ہوا ہے، وحی کی اور قسمیں بھی ہیں، جیسا کہ سورہ شوریٰ میں ہے کہ کسی آدمی کی یہ تاب نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے لیکن وحی سے یا پردہ کے پیچھے سے یا کسی قاصد کو بھیجے، تو وہ خدا کے حکم سے خدا جو چاہے، اسکو وحی کر دیتا ہے۔ (سیرۃ النبیؐ جلد چہارم ص ۴۶)

یہ مسلمانوں کا کھلا ہوا عقیدہ ہے، جسمیں "شاید، غلب ہی، خیال ہے، ایسا ہو رہا ہوگا" وغیرہ جیسے الفاظ کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں، اور منٹگمری واٹ جیسے مصنف کو حق نہیں ہے، کہ مسلمانوں کو مجبور کریں کہ وہ ایسے عقیدے کے قائل نہ ہوں، وہ ایک عیسائی یا عیسائیت کے ایک مبلغ ہونے کی حیثیت سے اسلام یا اور دوسرے مذاہب کے خلاف جتنا بھی چاہیں زہر اگلیں، ان کو کوئی روک نہیں سکتا، لیکن اپنی تحریر کو موضوعاً یا معروضی کہہ کر گمراہ نہ کریں، ورنہ ان کی طرف سے کھلی ہوئی دعوت ہوگی، کہ مسلمان ان ہی دلائل اور انہی الفاظ کے ساتھ عیسائیت کو بھی اسی طرح داغدار کریں، جس طرح وہ اسلام کو کرنا چاہتے ہیں،

بات یہ ہے کہ موجودہ انجیل کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے نہیں سمجھے جاتے تو پھر وہ قرآن کی برتری کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ کلام اللہ ہے، اسی لیے اپنی پُر فریب تحریروں کے ذریعہ سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے الفاظ نہیں ہیں، بلکہ خود رسول کے ہیں، مسلمانوں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ توریت، زبور اور انجیل سب وحی کے ذریعہ سے نازل کی گئیں، اسکی تصدیق قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے، قرآن میں ہے :-

ہم نے اس سے پہلے موسیٰؑ کو کتاب دی تھی اور اسے بنی اسرائیل کا ذریعہ ہدایت بنایا تھا،

ہم ہی نے داؤدؑ کو زبور دی تھی،

ہم نے اس کو یعنی حضرت عیسیٰؑ کو انجیل عطا کی جس میں رہنمائی اور روشنی تھی۔ (المائدہ - ۵)

پھر ایک عمومی بات اس طرح کہی گئی ہے، کہ

"اے نبی تم سے پہلے بھی ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا، جن پر ہم وحی کیا کرتے تھے، تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔ (الانبیاء - ۲)

مستشرقین آج قرآن مجید کے متعلق جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانے میں بھی کہا گیا، قرآن مجید میں ہے:

رسولوں کو ہم نے اس کام کے سوا اور کسی غرض کے لیے نہیں بھیجا کہ وہ بشارت اور تنبیہ کی خدمت انجام دیں، مگر کافروں کا یہ حال ہے کہ وہ باطل کے ہتھیار لے کر حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں، اور انھوں نے میری آیات کو اور ان تنبیہات کو جو انھیں کی گئیں، مذاق بنالیا ہے، اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہے جسے اس کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جائے، اور وہ ان سے منہ پھیرے، اور اس برے انجام کو بھول جائے، جس کا سروسامان اس نے اپنے لیے خود اپنے ہاتھوں کیا ہے، (جن لوگوں نے یہ روش اختیار کی ہے) ان کے دلوں پر ہم نے غلاف چڑھا دیئے ہیں، جو انھیں قرآن کی بات سمجھنے نہیں دیتے، اور ان کے کانوں میں ہم نے گرانی پیدا کر دی ہے، تم انھیں ہدایت کی طرف کتنا ہی بلاؤ، وہ اس حالت میں کبھی ہدایت نہ پائیں گے۔

(سبحان الذی - ۱۵)

علم حدیث اور مستشرقین

از

ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری، جامعۃ العین، (ابوظبی)

علم حدیث کے بارے میں مستشرقین اور مغربیت زدہ علماء کے اعتراضات، اور ان کا ایک اجمالی تنقیدی جائزہ

باوجود اس حقیقت پر امت مسلمہ کا اجماع ہے کہ اسلامی قانون کے بنیادی چار ماخذ میں قرآن کے بعد حدیث وسنت کو دوسرا مقام حاصل ہے، لیکن بایں ہمہ معتزلین و منکرین حدیث اور فرق ضالہ نے ہمیشہ اس مسلّمہ حقیقت کے خلاف حدیث کو اس کے بلند مقام سے گرانے کی کوشش کی ہے، اور اس کے پس پشت اسلامی معاشرہ کے پورے ڈھانچہ کو تباہ کرنا اور اس میں انتشار اور انارکی پیدا کرنے کا جذبہ کارفرما رہا ہے، اسلامی تہذیب وتمدن کے عہد زریں (جسے ہم عہد بنی عباس بھی کہہ سکتے ہیں) میں زنادقہ وغیرہ دشمنان اسلام نے اسلام کے خلاف جس طرح کی منظم سازشیں کیں، اسی طرح مستشرقین اور جدید مغربی تہذیب کے پروردہ ان کے ہم نوا آج بھی سرگرم عمل ہیں، اس لیے کہ آفتاب اسلام کی درخشاں کرنوں سے اعدائے اسلام کی نگاہیں جب خیرہ ہوتی ہیں، تو وہ فرط غیظ وغضب سے دیوانہ ہوکر قرآن، حدیث، اجتہاد اور اسلامی تاریخ وتمدن کا روشن چہرہ مسخ کرنے کے لیے کمربستہ ہو جاتے ہیں، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ نور خدا ہمیشہ کفر کی حرکات پر خندہ زن رہا ہے، اور قانون فطرت کے مطابق حق و باطل کے معرکوں میں فتح ہمیشہ حق ہی کا مقدر رہی ہے،

اس افسوس ناک حقیقت کا ذکر کرنا ناگزیر ہے، کہ ہمارے بعض مسلمان تعلیم یافتہ حضرات بھی مستشرقین کی نام نہاد علمی تحقیقات اور دسیسہ کاریوں کے فریب میں مبتلا ہوگیے ہیں، اس کا سبب یا تو اسلام کے سرچشمہ صافی سے ان کی عدم واقفیت ہے، یا پھر ان کی فکری کجروی ہے جسے انہوں نے مستشرق اہل قلم کی آڑ میں پیش کیا ہے،

دراصل مستشرقین کو مغربی حکومتوں نے تحقیق و تالیف کے لیے یکسو اور فارغ کر دیا ہے، اور انہیں ہر طرح کی سہولیات نیز تمام ممکن الحصول مراجع و مصادر فراہم کیے ہیں، ہر مستشرق کسی خاص فن کو اپنی خصوصی جولانگاہ قرار دے کر تاحیات اس میں مشغول و منہمک رہتا ہے، اس لیے مستشرقین جو کچھ بھی لکھتے ہیں، اسے علمی رنگ میں پیش کرتے ہیں، اور وہ اپنی تحقیقات کو بکثرت مطبوعہ اور مخطوطہ مراجع کے حوالوں سے مزین کرتے ہیں، اسی باعث انکی علمی تحقیقات مغربی تہذیب کے دلدادہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے وجہ کشش بن جاتی ہیں، اور وہ اس کے کرو فریب میں آکر مستشرقین کے فنی کمالات اور علمی خلوص و دیانت پر صدائے تحسین و آفریں بلند کرنے لگتے ہیں، بالآخر وہ اس سے متاثر ہو کر اپنی علمی تالیفات میں انکے گمراہ کن آراء و نظریات کو بعینہٖ نقل کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں، اسلامی اور عربی ممالک کے متعدد و ممتاز مفکرین نے اپنے ملکوں سے باہر جاکر مستشرقین سے استفادہ کیا، یا انہیں، اپنے علمی و تعلیمی اداروں میں مدعو کرکے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ مستشرقین کی بکثرت تالیفات کے ترجموں سے اسلامی کتب خانے بھرے پڑے ہیں،

علوم اسلامیہ کے سلسلہ میں مستشرقین نے جو فکری کارنامے انجام دیئے ہیں، ان پر سلبی اور ایجابی دونوں طرح کی چھاپ ملتی ہے، اول الذکر نوعیت کے کارناموں میں انتہا پسندانہ دعوتی رنگ غالب ہے اور اسی سے بیمار نفوس میں اسلام اور اس کی تعلیمات کے خلاف عداوت کے جذبات کی تخم ریزی ہوتی ہے، ثانی الذکر نوعیت کے علمی کام معروضی انداز کے حامل اور بحث و تحقیق تک محدود رہتے ہیں، چنانچہ ہمارے علمائے اسلام کا معروف موقف اس سلسلہ میں یہ ہے کہ جو امور اسلام کے عین مطابق ہوں، انہیں بعینہٖ برقرار رکھا جائے، اور ان کی قدر دانی کی جائے، اور جو چیزیں مسلمہ اسلامی حقائق کے خلاف ہیں، ان کی غلطیوں کی نشاندہی اور نتائج پر متنبہ کر دیا جائے، چنانچہ جب ہم علم حدیث کی شہرۂ آفاق تصنیف "مفتاح کنوز السنہ" پر احمد محمود شاکر کا مقدمہ پڑھتے ہیں، تو اس میں معروف مستشرق (فنسنک) کے اس اہم علمی کارنامے کے لیے اس کی غیر معمولی محنت و جدوجہد کا پورا اعتراف ملتا ہے، مگر عین اسی مستشرق کے بارے میں "انسائیکلو پیڈیا آف اسلام" میں احمد محمود شاکر اپنے تعارفی مقالہ میں جگہ جگہ اس کا تعاقب، تصحیح اور حاشیہ آرائی کرتے ہوئے ملتے ہیں، لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ مسلم طبقہ نے اپنے مستشرق اساتذہ کے آراء و افکار کو بغیر کسی تحقیق و تنقیح کے نہ صرف قبول کر لیا ہے، بلکہ علمی

تحقیق کے نام پر اپنے زبان و قلم سے ان کی نشر و اشاعت بڑے پر جوش انداز میں کی ہے،

ڈاکٹر احمد امین پر نقد اس جماعت کے سرخیل ڈاکٹر احمد امین ہیں، جو "فجر الاسلام" "ضحی الاسلام" اور "ظہر الاسلام" جیسی مشہور کتابوں کے مصنف ہیں، انہوں نے اپنی تالیف "فجر الاسلام" میں حدیث و سنت کے موضوع پر بھی حق و باطل کی آمیزش کے ساتھ خیال آرائی کی ہے، اور اپنے مستشرق اساتذہ کے نقوش قدم کی اتباع کرتے ہوئے نہ صرف اسلام کے مسلم حقائق کی تحریف بلکہ صحابہ کرامؓ و تابعین عظام کی مقدس جماعت کے ساتھ ظلم و زیادتی کی کوشش بھی کی ہے، چنانچہ وہ رقمطراز ہیں:

> علمائے جرح و تعدیل نے کچھ قواعد وضع کیے ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، مگر حق بات یہ ہے کہ انہوں نے نقد متن کی بہ نسبت نقد اسناد کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا ہے چنانچہ اس نوعیت کا نقد بہت کم ملتا ہے، کہ مثلاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو قول منسوب ہے وہ ان حالات و ظروف سے مطابقت نہیں رکھتا ہے، جن میں وہ کہا گیا ہے، یا مسلّم تاریخی واقعات اس کے متناقض ہیں، یا عبارت حدیث در اصل ایک طرح کی فلسفیانہ تعبیر کلام ہے، یا یہ کہ حدیث اپنے شرائط و قیود کے ساتھ متون فقہ سے زیادہ مشابہ ہے، چنانچہ محدثین نے اسماء الرجال کی جرح و تعدیل میں جو غیر معمولی کاوش و محنت کی ہے اس کے مقابلہ میں مذکورہ بالا امور کی طرف عشر عشیر بھی توجہ نہیں کی ہے، یہاں تک کہ امام بخاریؒ اپنی تمام جلالت و مرتبت اور دقت نظری کے باوصف ایسی احادیث درج کرتے ہیں جن کے غیر صحیح ہونے پر حقائق روزگار اور تجربات و مشاہدات دلالت کرتے ہیں، اس کا باعث یہ ہے کہ امام بخاریؒ کی ساری توجہ کا محور نقد رجال رہا ہے، مثلاً درج ذیل دو حدیثیں
>
> ۱۔ لا یبقی علی ظهر الارض بعد مائة سنة نفس منفوسة، — سو سال کے بعد روئے زمین پر کوئی شخص زندہ نہ رہے گا،
>
> ۲۔ من اصطبح كل يوم سبع مرات من عجوة لم يضره سم ولا سحر — جو شخص روزانہ سات عدد عجوہ کھجور کا ناشتہ کرے گا، اسے اس دن رات تک کوئی زہر و سحر

ذالک الیوم الی اللیل،[1] نقصان نہیں پہونچا سکتا،

ڈاکٹر احمد امین کے مذکورۂ بالا ارشادات کا ماحصل دو امور ہیں:

۱- محدثین نے نقد حدیث کے جو قواعد مقرر کیے ہیں، ان کا نقد،

۲- احمد امین کے وضع کردہ قواعد نقد حدیث کے مطابق صحیح بخاری کی مذکورہ دو حدیثوں پر نقد،

استاذ مصطفیٰ سباعی نے لکھا ہے کہ احمد امین دراصل انکار حدیث کے سلسلہ میں مستشرقین کی معروف فکر کے ایک بڑے داعی اور علمبردار تھے، اس لیے اگر انھوں نے اپنے مذکورۃ الصدر خیالات میں مسلمہ تاریخی حقائق سے انکار کیا ہے، تو یہ کوئی محل تعجب وحیرت نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ علمائے اسلام نے حدیث وسنت کی حفاظت اور اسے تحریف وتزییف کی ہر کوشش سے پاک وصاف رکھنے کے لیے جو جانکاہ کاوشیں اور غیر معمولی جدوجہد کی ہے، اس کی نظیر پوری علمی تاریخ میں مفقود ہے، بلاشبہ ماہرین جرح وتعدیل نے نقد متن اور نقد اسناد دونوں کے ساتھ یکساں اعتناء کیا ہے، چنانچہ مصطلحات حدیث میں ہمارے علماء نے جو تالیفات یادگار چھوڑی ہیں، ان کے مطالعہ سے یہ حقیقت بخوبی منکشف ہو جاتی ہے، کہ سند حدیث کے ساتھ متن حدیث بھی علمائے فن کی فکر وکاوش کا خصوصی جولانگاہ رہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ علم مصطلح الحدیث صرف اسناد کے مباحث پر ہی اکتفا نہیں کرتا، بلکہ وہ متن حدیث کے مسائل کو بھی شامل ہے، ظاہر بین نظریہ خیال کرتی ہے کہ نقادان حدیث نے متن حدیث سے زیادہ اسناد پر خصوصی توجہ منعطف کی ہے لیکن دراصل یہ صرف ایک واہمہ ہے، جو دقت نظری اور تحقیق علمی کی کسوٹی پر آنے کے بعد محض ایک خواب پریشان رہ جاتا ہے، بلاشبہ ماہرین فن محدثین عظام کی علمی بحثیں حدیث کے متن واسناد دونوں کے محور پر گردش کرتی ہیں، انھوں نے ضعیف سند کو صحیح سے اور خبر موضوع کو غیر موضوع سے متمایز کرنے کے لیے کچھ علامات کا تعین کیا ہے، چنانچہ متن حدیث کی پرکھ کے لیے آٹھ اور اسناد کے لیے چار علامتیں مقرر کی گئی ہیں،[2]

اصل بات یہ ہے کہ نقد وجرح میں یہ فرط احتیاط اور شدت حزم مؤلف فجر الاسلام کو پسند نہیں آئی، کیونکہ

---

[1] فجر الاسلام ص ۲۱۶-۲۱۸ [2] الباعث الحثیث ص ۹، المنار لابن قیم ص ۱۲۰، تدریب الراوی ص ۱۸۰،

نوٹ:- ان کتابوں سے یہ علامات مستنبط ہیں،

ان کے مستشرق اساتذہ کو بھی یہ چیز ناپسند تھی، چنانچہ اسی باعث انھوں نے مذکورہ بالا تنقید فرمائی، موصوف کے خیال میں محدثین کو نقد حدیث میں درج ذیل امور کی تحقیق کرنا چاہیے تھا:

۱۔ کیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب اقوال ان حالات وظروف سے مطابقت رکھتے ہیں جن میں وہ کہے گئے؟

۲۔ کیا تاریخی واقعات ان کی تائید کرتے ہیں؟

۳۔ کیا وہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج وطبیعت کے خلاف ایک قسم کی فلسفیانہ تعبیر ہے؟

۴۔ کیا حدیث اپنے شرائط وقیود کے باعث متون فقہ سے زیادہ مشابہ ہے؟

اب ہم ذیل میں ڈاکٹر احمد امین کے وضع کردہ نقد حدیث کے "جدید قواعد" پر بالترتیب تفصیل سے بحث کرتے ہیں۔

۱۔ مؤلف فجر الاسلام کا یہ خیال صریحاً غلط ہے کہ "محدثین نے اس بات کی تحقیق نہیں کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیثیں اپنے زمانے کے حالات سے مطابقت رکھتی ہیں یا نہیں"۔ اس لیے کہ علمائے حدیث نے اس عیب کو متن حدیث میں وضع حدیث کی علامات میں شمار کیا ہے، اس کی مثال میں یہ حدیث پیش کی جاتی ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی شہادت اور حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کے خط کی بنیاد پر اہل خیبر پر جزیہ مقرر کر کے انہیں بیگاری کی مشقت وصعوبت سے نجات دلادی تھی، حالانکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ عام خیبر تک نہ تو جزیہ کی مشروعیت ہوئی تھی، اور نہ یہ معروف عام ہی تھا، بلکہ آیت جزیہ کا نزول تو عام تبوک کے بعد ہوا ہے، پھر حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اس سے قبل ہی غزوۂ خندق میں راہی ملک بقا ہو چکے تھے، اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے موقع پر مشرف باسلام ہوئے۔[۱] اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تاریخی حقائق مذکورہ حدیث کی تردید کرتے ہیں، اور اس کو موضوع قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح کی ایک اور مثال حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ہے کہ "میں غسل خانے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہبند باندھے بیٹھے ہوئے ہیں، میں نے آپ سے بات کرنی چاہی

---

[۱] الاعلان بالتوبیخ ص ۱۰۰، المنار لابن قیم ص ۱۰۷، ۳-۲۰۸، تذکرۃ الحفاظ للذہبی ص ۱۴۱ا۔

تو ارشاد فرمایا: اے انس! اسی وجہ سے میرے لیے غسل خانے میں بغیر تہبند باندھے داخل ہونا حرام ہے" حالانکہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی غسل خانے میں نہیں گیے، اور نہ اس زمانے تک غسل خانے معروف ہی تھے۔

۲۔ اگر تاریخی مسلمات و حقایق کسی حدیث کے مؤید نہیں ہیں، تو محدثین نے اسے بھی علامات وضع میں شمار کیا ہے۔ اور اس کی مثال اہل خیبر پر جزیہ مقرر کرنے کے بارے میں مذکورۃ الصدر حدیث ہے، علمائے جرح نے اسی بنیاد پر اس حدیث کو ناقابل قبول قرار دیا ہے کہ تاریخی حقایق اس کے خلاف ہیں، ایسی صورت میں احمد امین کی یہ رائے قطعی لاعلمی پر مبنی ہے کہ محدثین نے نقد حدیث کے وقت اس اصول کو مد نظر نہیں رکھا ہے، کہ حوادث زمانہ اور تاریخی حقایق حدیث زیر بحث کی تائید کرتے ہیں یا تکذیب؟

۳۔ نقد حدیث کے لیے احمد امین کا وضع کردہ یہ اصول بھی اپنے اندر کوئی جدت و ندرت نہیں رکھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معروف انداز تکلم کے خلاف ملنے والی بعض احادیث کو محض ایک فلسفیانہ تعبیر پر محمول کیا جانا چاہیے، کیونکہ ہمارے علمائے جرح و تعدیل نے اس اصول پر "رکاکت لفظ" کے تحت بحث کی ہے۔ اس کا ضابطہ یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کے کلام کے صدور کی مکمل نفی کر دی جائے، حافظ ابن حجر عسقلانی کی رائے ہے کہ "رکاکت (یعنی لچرپن) میں اصل معنی کی رکاکت ہے" چنانچہ جس حدیث میں اس کا وجود ہوگا وہ بلاشبہہ موضوع قرار دی جائے گی، خواہ اس میں لفظی گھٹیا پن نہ ہو، اس لیے کہ پورا دین مجموعۂ محاسن وفضائل ہے، اس میں کسی طرح کی پستی اور گھٹیا پن دین کے بنیادی مزاج کے خلاف ہے، اور اگر کسی حدیث میں صرف لفظی رکاکت ملتی ہے، تو یہ اس کے موضوع قرار دینے کے لیے کافی نہیں، کیونکہ اس بات کا احتمال موجود ہے کہ راوی نے روایت بالمعنی کر کے اصل الفاظ حدیث تبدیل کر دیئے ہوں[1]۔

۴۔ اب رہی یہ بات کہ احادیث اپنے شرائط و قیود کے باعث فقہی متون سے زیادہ مماثلت رکھتی ہیں، تو محدثین نے کسی حدیث کی صحت کے لیے اس بات کو شرط قرار دیا ہے، کہ وہ اس کے متعصب راوی کے ذاتی مسلک کی موید نہ ہو، اسی باعث فقہ و عقائد کے باب میں بکثرت احادیث کو رد کر دیا گیا ہے، کیونکہ وہ رواۃ کے شخصی مذاہب کی

[1] الباعث الحثیث ص ۹۰۔

مؤید ہیں، مثلاً یہ حدیث کہ جنبی (جس پر غسل واجب ہو) کے لیے تین تین بار کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا فرض ہے،[1] یا یہ حدیث کہ "اگر کسی کپڑے میں ایک درہم کے برابر خون لگا ہو تو کپڑا دھو کر نماز کا اعادہ کر لیا جائے۔"[2] ابن الجوزی کا قول ہے کہ اس حدیث کی سند میں بکثرت مجہول رواۃ شامل ہیں۔ غرض اس طرح کی احادیث کو ماہرین فن نے یکسر موضوع قرار دیا ہے،

ڈاکٹر احمد امین کی اس رائے سے قطعی اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ "امام بخاری اپنی تمام تر علوئے مرتبت اور دقت نظری کے باوصف ایسی احادیث نقل کرتے ہیں، جن کی عدم صحت پر حقائق روزگار اور تجربات و مشاہدات شاہد ہیں"، اس سلسلہ میں موصوف نے جن دو حدیثوں سے استدلال کیا ہے، وہ بجائے خود ان کی رائے کی معارض ہیں، حقیقت یہ ہے کہ "لا یبقی علی ظہر الارض بعد مائۃ سنۃ نفس منفوسۃ" والی حدیث صحیح ہے، امام بخاریؒ کے علاوہ امام ابوداؤد اور ترمذی نے بھی اس کی تخریج کی ہے، نیز یہ حدیث مختلف طرق سے مروی ہے، اس کا منشا و مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی بیان کرنا ہے، کہ سو سال گزرنے کے بعد عہد نبوت کا کوئی شخص روئے زمین پر زندہ باقی نہ رہے گا، درحقیقت یہ پیشین گوئی علامات نبوت میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ عہد رسالت کی فصل بہار سو سال سے زیادہ باقی نہیں رہی، اور دیدار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہونے والی ایک ایک دیدۂ روشن اس عرصہ میں ابدی نیند سو گئی،

مذکورہ حدیث کا ماحصل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابۂ کرامؓ پر یہ حقیقت منکشف کرنا ہے کہ ان کو امم سابقہ کی طرح طویل عمریں نصیب نہیں ہوں گی،[3] اس لیے انہیں اس مختصر عرصۂ حیات کو غنیمت جان کر عبادت و طاعت اور توشۂ آخرت کی تیاری میں بیش از بیش ریاضت کرنی چاہیے، حدیث بالا میں کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے، جسے حقائق زمانہ اور عام تجربہ و مشاہدہ کے خلاف کہا جا سکے۔ چنانچہ ڈاکٹر مصطفےٰ سباعی رقمطراز ہیں کہ "فی الواقع جو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم معجزات میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، وہ مؤلف فجر الاسلام کی نقد جدید کی منطق کے مطابق محض کذب و افترا قرار پاتی ہے"۔[4]

---

[1] تنزیہ الشریعۃ المرفوعہ ج ۲ ص ۷۶ (امام بزار کا قول ہے کہ اس حدیث کی نکارت پر علماء کا اتفاق ہے، [2] ایضاً ج ۲ ص ۷۷، [3] تاویل مختلف الحدیث لابن قتیبہ ص ۱۱۹، [4] السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی ص ۲۶۱،

اسی طرح دوسری حدیث "من اصطبح کل یوم سبع تمرات لم یضرہ سم ولا سحر ذلک الیوم الی اللیل" کی تخریج امام بخاری نے کتاب الطب میں کی ہے[1] مزید برآں امام مسلم اور امام احمد نے بھی اپنی کتابوں میں اسے نقل کیا ہے[2] اس حدیث کی شرح بعض علماء نے دوسری مفید احادیث کی روشنی میں کی ہے، اور اسے کھجور مدینہ کے ساتھ مختص کیا ہے، اور بعض نے اسے مطلق رکھا ہے، لیکن اکثر محدثین کے نزدیک یہ حدیث مدینہ کی عجوہ کھجوروں کے ساتھ خاص ہے، ابن قیم کا بیان ہے کہ "مدینہ کی عجوہ کھجور حجاز کی ہر نوع کی کھجوروں میں سب سے زیادہ مفید اور نفع بخش ہے، اور ویسے بھی کھجور اپنی گرم و تر تاثیر اور غذائیت کے اعتبار سے تمام پھلوں پر فائق ہے، صبح نہار منہ کھانے سے اس کی تریاقی طاقت منہ کے کیڑوں کا خاتمہ کر دیتی ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص پابندی کے ساتھ نہار منہ کھجور کھایا کرے، تو اس کے منہ میں کیڑوں کا مادہ خشک یا بالکل ختم ہو جائے گا[3]

نہایت تعجب و حیرت کا مقام ہے کہ اگر بقراط و جالینوس وغیر کسی خاص خطہ کی کھجور ایک مخصوص مقدار میں کھانے کی یہی خصوصیات بیان کرتے تو دنیا کے تمام اطباء پورے یقین و اعتماد کے ساتھ اس فارمولے کو ہاتھوں ہاتھ لیتے، حالانکہ حکمائے عالم کا بیان صرف ظن و تخمین کی حیثیت رکھتا ہے، مگر جب صاحب وحی نے پورے اذعان و یقین اور قطعیت کے ساتھ کھجور کے خواص بیان کیے تو اسے قبول کرنے کے بجائے اس پر "تجربہ و مشاہدہ" کے خلاف ہونے کا اعتراض وارد کیا جاتا ہے، ڈاکٹر مصطفی سباعی نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی" میں احمد امین کے تمام شبہات و اعتراضات کا نہایت مدلل طور پر علمی رد کیا ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں کتاب مذکور کے صفحات ۲۰۳ تا ۲۱۲ کا مطالعہ نہایت افادیت کا حامل ہے،

اسی طرح ڈاکٹر احمد امین "فجر الاسلام" کے صفحہ ۲۰۹ پر وضعیت حدیث کے آغاز و ارتقاء کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"وضعیت کی حد و مقدار جاننے کے لیے اتنی دلیل کافی ہے، کہ امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک

---

[1] البخاری ص ۸۲۳ ج ۲، [2] صحیح مسلم ص ۱۶۱۸ ج ۳، مسند احمد بن ج ۲ حدیث ۱۴۴۲، ۱۵۷۱، ۱۵۷۱، ۱۹۲۸، [3] فتح الباری ص ۲۴۰ ج ۱۰

احادیث تفسیر میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے۔ اس باب میں ہزاروں حدیثیں جمع کی گئی ہیں صرف صحیح بخاری سات ہزار صحیح احادیث تفسیر پر مشتمل ہے، جن میں سے تین ہزار مکررات ہیں۔ محدثین کا بیان ہے۔ کہ امام بخاریؒ نے ان حدیثوں کو اپنے عہد میں متداول چھ لاکھ احادیث کے ذخیرہ سے منتخب کیا ہے۔"

ظاہر ہے مذکورہ بالا خیال آرائی کا حاصل وضع حدیث کی کثرت ظاہر کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں موصوف نے احادیث تفسیر اور احادیث بخاری کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ بلاشبہ حدیث کے اکثر مجموعوں میں تفسیر کے مستقل ابواب ملتے ہیں، جن کے تحت بااعتبار صحیح احادیث درج ہیں، علمائے فن نے مفسر قرآن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول تفسیر پر اعتماد کرنا لازمی قرار دیا ہے چنانچہ امام ابو جعفر طبری رقمطراز ہیں:

"اللہ جل شانہ نے قرآن پاک اپنے نبی پر نازل کیا ہے۔ اس لیے اس کی تفسیر و تشریح تک رسائی بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے بیانات و اقوال کی روشنی میں ہو سکتی ہے۔"[1]

امام ابو حیان اندلسی اپنی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

"رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث ہی سے قرآن کے مبہم معانی کی تعیین، اجمال کی وضاحت، اسباب نزول و نسخ آیات کی معرفت ہو سکتی ہے، اور حدیث کی تمام امہات کتب مثلاً صحیحین، سنن ترمذی اور سنن ابوداؤد وغیرہ میں اس باب کی احادیث کثرت سے ملتی ہیں۔"[2]

حافظ جلال الدین سیوطی نے "اتقان" میں ابن تیمیہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے، کہ "معلوم ہونا چاہیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے سامنے قرآن پاک کے الفاظ و معانی دونوں کی تفسیر و تشریح فرمائی ہے، چنانچہ ارشاد ربانی "لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ" دونوں طرح کی تفسیروں کو شامل ہے، امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکم فرمایا اس کو قرآن مجید سے مستنبط کر کے فرمایا ہے،[3] مزید برآں علاوہ

---

[1] تفسیر الطبری ج ۱ ص ۲۵۔ [2] البحر المحیط ج ۱ ص ۶۔ [3] مقدمہ تفسیر ابن تیمیہ ص ۵۔

زرکشی نے تفسیر قرآنی کی دو قسمیں ذکر کی ہیں، ایک وہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہؓ کرام اور تابعین سے منقول ہے، اور دوسری قسم تفسیر غیر منقول ہے، علمائے تفسیر نے منقول سے رجوع کرنا واجب قرار دیا ہے، اگر احمد امین کے زعم کے مطابق احادیث تفسیر غیر صحیح ہوتیں، تو علماء ایسا حکم نہ دیتے. بلکہ بعض ماہرین فن کے نزدیک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منقول تفسیر کے علاوہ کوئی اور تفسیر کرنا جائز ہی نہیں ہے علامہ سیوطیؒ رقمطراز ہیں:

"کیا قرآن کے معانی میں ہر شخص غور و فکر کر سکتا ہے؟ اس بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے، ایک طبقہ کا خیال ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا بڑا عالم اور ادیب ہو، اور منطق، فقہ، نحو اور تاریخ وغیرہ علوم پر اس کی نظر کتنی ہی وسیع ہو، اس کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی تفسیر کے علاوہ قرآن کی کوئی اور تفسیر کرنا قطعاً جائز نہیں ہے" (الاتقان ص ۱۸۰)

یہ رائے انتہا پسندانہ اور غیر معمولی سہی، مگر اس سے اتنا بہر حال ثابت ہوتا ہے، کہ احادیث تفسیر سے تجاہل برتنا یا ان کا انکار کرنا کسی کے لیے درست نہیں ہے.

ڈاکٹر احمد امین نے اپنے مذکورہ اقتباس میں امام احمد بن حنبلؒ کا یہ قول نقل کیا ہے، کہ "تین چیزوں کی کوئی بنیاد نہیں ہے. تفسیر، ملاحم، مغازی" اس پر درج ذیل چند اشارات سے بحث کی جا سکتی ہے:

۱۔ خود امام احمدؒ نے اپنی مسند میں مغازی، تفسیر اور ملاحم کے بارے میں کثرت سے احادیث ذکر کی ہیں، ان کا یہ عمل خود ان کے مذکورہ قول کے متناقض ہے،

۲۔ کسی چیز کے صحیح ہونے کی نفی کر دینے سے اس کا ضعیف اور موضوع ہونا لازم نہیں آتا، ملا علی قاری نے تذکرۃ الموضوعات میں لکھا ہے، کہ:

لا یلزم من عدم الثبوت وجود الوضع،	کسی بات کا عدم ثبوت اس کے موضوع ہونے کو مستلزم نہیں ہے،

حافظ ابن حجر عسقلانی "تخریج الافکار المسمی بنتائج الافکار" میں امام احمد بن حنبلؒ کا یہ قول نقل کرکے کہ "لا اعلم فی الوضوء حدیثا ثابتا" (یعنی وضوء کے بارے میں مجھے کسی صحیح حدیث کا علم نہیں

لکھتے ہیں کہ "میری رائے میں کسی چیز کی عدم واقفیت سے اس کا معدوم ہونا ثابت نہیں ہوتا[1]۔

۳۔ امام احمدؒ نے یہ نہیں فرمایا کہ تفسیر کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ صرف یہ کہا کہ تین چیزوں کی کوئی اصل و حقیقت نہیں ہے، اور ظاہر ہے اس کا مقصد و منشا یہ ذکر کرنا ہے، کہ مذکورہ تینوں علوم میں مستقل و مخصوص کتابیں نہیں ہیں، ایک دوسری روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ ثلاثۃ کتب لا اصل لھا المغازی والملاحم والتفسیر۔

۴۔ امام احمد کے مذکورۂ بالا قول سے اس بات کا بھی قوی احتمال ہے کہ مذکورۂ علوم ثلاثہ کے بارے میں صحیح احادیث غیر صحیح کی بہ نسبت کم ہیں، اکثر اہل علم نے ابن حنبلؒ کے متذکرہ قول کو اسی معنی پر محمول کیا ہے، امام زرکشی "البرہان" میں رقمطراز ہیں کہ:

مرادہ ان الغالب لیس	اس کی مراد یہ ہے کہ بیشتر احادیث صحیح
لھا اسانید صحاح متصلۃ	متصل سند سے مروی نہیں ہیں، ورنہ اس
والا صح من ذلک کثیر[2]	میں صحیح حدیثیں کافی ہیں،

ڈاکٹر احمد امین نے اس بات پر بڑے تعجب و حیرت کا اظہار کیا ہے، کہ امام بخاریؒ نے چھ لاکھ احادیث کے ذخیرہ سے کس طرح صحیح احادیث کا انتخاب کیا ہوگا، اور پھر اس استغراب سے انہوں نے احادیث بخاری میں وضعیت کی کثرت پر استدلال کیا ہے، بلا شبہہ امام بخاریؒ کے عہد میں متداول احادیث کی تعداد کیف و کم کے احاطے سے باہر تھی، چنانچہ دستیاب کتب حدیث میں روایات کی کثرت و صحت دیکھ کر عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ کو سات لاکھ سے زیادہ حدیثیں یاد تھیں، اسی طرح کا ایک قول ابوزرعہ سے بھی منقول ہے، امام بخاریؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دو لاکھ ضعیف اور ایک لاکھ صحیح احادیث کے حافظ تھے، امام مسلم کا بیان ہے کہ:

جمعت کتابی ھذا من ثلاث	میں نے تین لاکھ احادیث میں سے انتخاب
مائۃ الف حدیث،	کرکے اپنی کتاب مرتب کی ہے۔

---

[1] الرفع والتکمیل ص ۸۷۔ [2] السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی ص ۱۸۳ - ۱۸۴۔

امر واقعہ یہ ہے کہ عام لوگوں کا ذکر نہیں، بہت سے تعلیم یافتہ لوگ بھی اس بات سے ناواقف ہیں، کہ احادیث کی یہ غیر معمولی تعداد دراصل متابعات وشواہد کی کثرت کا نتیجہ ہے، مثلاً حدیث "انما الاعمال بالنیات" سات سو طرق سے مروی ہے، چنانچہ احادیث کے مجموعوں سے اگر ان متابعات وشواہد کو نکال دیا جائے تو احادیث کی بہت تھوڑی سی تعداد باقی رہ جاتی ہے، اسی باعث صحیح بخاری میں روایات صحیحہ کی کل تعداد دو ہزار چھ سو دو (۲۶۰۲) اور صحیح مسلم میں چار ہزار (۴۰۰۰) ہے، اس طرح کتب حدیث میں مروی احادیث کی کل تعداد پچاس ہزار ہے، اور اس میں بھی صحیح، سقیم، متفق علیہ اور متکلم فیہ غرض تمام نوعیت کی حدیثیں شامل ہیں امام ابو حاکم نیشاپوری نے (جو حدیث قبول کرنے کے معاملہ میں ذرا متساہل واقع ہوئے ہیں،) صراحت کی ہے کہ اول درجہ کی احادیث دس ہزار سے زیادہ نہیں ہیں،[۱]

مولف فجر الاسلام کا یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ امام بخاریؒ نے اپنی جامع صحیح میں تمام روایات صحیحہ کا استقصا کیا ہے، بلکہ یہ ایک معروف عام حقیقت ہے کہ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں ہر صحیح حدیث کا استیعاب نہیں کیا ہے، چنانچہ خود امام صاحب سے منقول ہے کہ

لم اخرج فی ھذا الکتاب الا صحیحا وما ترکت فی الصحیح اکثر[۲]	میں نے اس کتاب میں صرف صحیح احادیث کی تخریج کی ہے، اور اس میں بھی بہت سی حدیثیں چھوڑ دی ہیں،

حافظ حازمی رقمطراز ہیں:

اما البخاری فلم یلتزم ان یخرج کل ما صح عندہ من الحدیث[۳]	امام بخاریؒ نے ہر صحیح حدیث کی تخریج کا التزام نہیں کیا ہے،

فواد سزگین کی آراء کا نقد

ہم عصر علماء میں "تاریخ التراث العربی" کے مشہور مصنف استاذ فواد سزگین نے بھی مستشرقین کے افکار ونظریات سے گہرا اثر قبول کیا ہے، اور ان کی تبلیغ واشاعت میں بڑی کاوش کی ہے، موصوف نے بروکلمان کی شہرہ آفاق کتاب "تاریخ الادب العربی" کو جدید ذوق ومعیار کے مطابق ایڈیٹ

---

[۱] توجیہ النظر ص ۹۳، [۲] تدریب الراوی ص ۴۰ و فتح المغیث ج ۱ ص ۱۷، [۳] شروط الائمۃ الخمسہ ص ۴۴،

کیا ہے۔ اس میں بعض نہایت گرانقدر اضافے (مثلاً ہر مصنف کی تمام مطبوعہ و مخطوطہ تصانیف کی نشاندہی وغیرہ) کیے ہیں، کہ جس کے باعث یہ کتاب ہر عالم و محقق کا مرجع بن گئی ہے۔ بلاشبہ اس عظیم علمی کارنامے پر وہ شکر و سپاس و تحسین کے مستحق ہیں۔ مگر ایں ہمہ جہاں انھوں نے صحیح بخاری کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے، اس سے مستشرقین کے نظریات کی تراوش ہوتی ہے، چنانچہ وہ رقمطراز ہیں:

"سب سے بڑی غلطی جس کے نتیجہ میں دوسری غلطیوں کا صدور ہوتا گیا، یہ ہوئی کہ صحیح بخاری کو پہلی "مصنف" خیال کر لیا گیا، جو ہر فقہی مسئلہ اور ہر فقہی باب میں قندیل راہ کی خدمت انجام دینے کے لیے تالیف کی گئی ہے،"

میں نے علم حدیث کے ارتقاء کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے یہ حقیقت واضح کی ہے، کہ امام بخاریؒ اور ان کے معاصرین کے مجموعہ ہائے حدیث کسی طور بھی کتب "مصنف" کی نمائندگی نہیں کرتے، اس لیے کہ وہ سو سال کی مدت میں تالیف ہونے والے مختلف "مصنفات" کا مجموعہ و ملخص ہیں، اور یہ بات ظاہر ہے کہ امام بخاریؒ نے اپنی جامع میں بغیر تحقیق و تنقیح کے بکثرت لغوی، تاریخی، فقہی اور حدیث کی کتب سے استفادہ کیا ہے۔ (تاریخ التراث العربی ج ۲ ص ۱۴۳)

صحیح بخاری کے بارے میں استاد فواد سزگین کی اس غلط رائے پر سخت تعجب و حیرت ہوتی ہے، اس لیے کہ کسی بھی مسلمان اہل علم نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے، کہ امام بخاری کی جامع صحیح علم حدیث کی پہلی "مصنف" ہے، بلکہ صرف یہ ذکر کیا ہے کہ احادیث صحیحہ کے باب میں پہلی تصنیف کی حیثیت سے اس کی اہمیت مسلم ہے، چنانچہ امام نوویؒ "التقریب" میں رقمطراز ہیں:

اول مصنف فی الحدیث المجرد صحیح البخاری ثم مسلم وھما اصح الکتب بعد القرآن العزیز والبخاری اصحھما،[1]	صحیح بخاری احادیث صحیحہ کی پہلی تصنیف ہے، اس کے بعد مسلم کا درجہ ہے، اور یہ دونوں قرآن کے بعد اصح الکتب ہیں، ان دونوں میں سے صحیح بخاری کا پایہ صحت کے اعتبار سے زیادہ بلند ہے۔

---

[1] راقم نے اپنی عربی کتاب "الامام البخاری" میں اس طرح کے متعدد اقوال جمع کر دیے ہیں،

بلاشبہ امام بخاریؒ سے پہلے کتب حدیث موجود تھیں، لیکن صورت حال یہ تھی کہ ان کتابوں میں صحیح سقیم روایات خلط ملط تھیں، اور کسی حدیث کے درجۂ صحت کا تعین رجال و رواۃ کی جانکاہ تحقیق کے بعد ہی ممکن ہو سکتا تھا، اگر پھر بھی اس بارے میں کوئی واضح رہنمائی نہیں ملتی تھی تو ائمۂ حدیث سے رجوع کرنا پڑتا تھا، یہ اور بالفرض اگر یہ بھی ممکن نہ ہوتا تو وہ حدیث تا وقت مجہول الحال ہی باقی رہ جاتی تھی، لیکن جب امام بخاری نے علم حدیث کے فلک رفعت ایوان پر اپنی سطوت دعوئے مرتبت کے علم بلند کیے، تو انھوں نے نہایت کاوش و محنت کے ساتھ صحیح روایات منتخب کر کے اپنی شہرۂ آفاق "جامع صحیح" تالیف کی، تاکہ علم حدیث کا لذت شناس تلاش و تحقیق کی بے جا زحمت سے نجات پا جائے، امام بخاریؒ نے اس میں صرف وہی احادیث درج کی ہیں، جن کی صحت ان کے نزدیک مسلّم تھی، اس کتاب کا پورا نام انھوں نے "الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ" رکھا، اس لیے کہ علمائے امت کا اجماع ہے کہ صحیح بخاری نہ صرف تمام مجموعہائے حدیث میں افضل ہے، بلکہ قرآن کے بعد اسے اصح الکتب کی حیثیت حاصل ہے، امام قسطلانی بڑے ادیبانہ انداز میں رقمطراز ہیں:

"صحیح بخاری علم حدیث کی سب سے زیادہ صحیح کتاب ہے، اس نے ہر عہد کے علماء سے قبول عام کی سند حاصل کی ہے، اپنی گوناگوں خصوصیات و محاسن میں وہ تمام علوم و فنون کی ہم عصر کتب میں فائق و ممتاز ہے، تمام اکابر اہل علم اور فضلائے روزگار نے اس کی عظمت کا اعتراف کیا، حقیقت یہ ہے کہ اس کے فضائل و محاسن کیف وکم کے احاطہ سے باہر ہیں۔"

اب رہی یہ بات کہ صحیح بخاری کی تالیف کا مقصد یہ تھا کہ وہ ہر فقہی باب اور ہر فقہی مسلک کے لیے شمع راہ ثابت ہو تو یہ "نئی تحقیق" ہمارے علمی حلقوں میں قطعاً غیر معروف ہے، ہر اہل علم جانتا ہے کہ امام بخاری نے جامع صحیح صرف اس لیے تالیف کی کہ صحیح احادیث کا اہتمام کیا جائے، اور اس کے متون سے بیش از بیش معانی و مفاہیم کا استخراج کیا جائے، چنانچہ اسی لیے انھوں نے مختلف ابواب میں مکرر احادیث درج کی ہیں، بلکہ بعض احادیث کو بیس مرتبہ سے بھی زیادہ ذکر کیا ہے، اسی باعث علماء کا یہ مشہور قول زبان زد

خلائق ہے کہ "فقہ البخاری فی تراجمہ۔"[1] حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:

یہ بات طے شدہ ہے کہ امام بخاری نے اپنی کتاب الجامع میں صحت کا التزام رکھا ہے، اور صرف روایات صحیحہ ہی درج کی ہیں، یہی اس کا اصل موضوع بھی ہے، جو اس کتاب کے اصل نام الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ" سے بھی ظاہر ہے، پھر اس کے بعد امام صاحب کی رائے ہوئی کہ وہ فوائد فقہیہ اور نکات فلسفیانہ سے صرف نظر نہیں کر سکتے، اس لیے انھوں نے اپنی بصیرت کے مطابق متون حدیث سے بکثرت مسائل کا استخراج کیا، اور کتاب کے تمام ابواب میں حسن تناسب سے انہیں پھیلا دیا۔[2]

معلوم ہوا کہ تو اد سنر گین کی یہ رائے کہ "صحیح بخاری کا مقصد تالیف ہر فقہی مسئلہ کی وضاحت یا تمام ابواب فقہیہ کا ذکر تھا" صحیح نہیں ہے،

اسی طرح یہ بات کہ "امام بخاری نے کتب حدیث کے علاوہ بکثرت لغوی، تاریخی اور فقہی کتب سے بغیر کسی تحقیق و تنقیح کے استفادہ کیا ہے" صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کا صحیح بخاری اور اس کے مصنف کی غایت احتیاط و جستجو کے بارے میں کوئی مطالعہ نہ ہو، خود امام بخاریؒ کے درج ذیل بیانات اس کے شاہد عدل ہیں،

"میں نے اپنی کتاب میں کوئی حدیث درج کرنے سے پہلے غسل کیا، اور دوگانہ نفل ادا کیا ہے"!

"میں نے اپنی جامع صحیح چھ لاکھ احادیث میں سے انتخاب کر کے سولہ سال میں تالیف کی ہے، نیز میں نے اسے اپنے اور اللہ کے درمیان حجت بنایا ہے"!

"میں نے اپنی کتاب میں کوئی حدیث درج کرنے سے پہلے استخارہ کیا، اور دوگانہ نفل ادا کیا ہے، نیز اس حدیث کی صحت کا تیقن کر لیا ہے"![3]

---

[1] مقدمہ لامع الدراری علی البخاری ص ۲۸۵، [2] مقدمہ فتح الباری ص ۱۵ [3] مقدمہ لامع الدراری ص ۲۲۔

پھر قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ امام بخاری نے احادیث کے مواج سمندر میں سے صرف دو ہزار چھ سو دو (۲۶۰۲) موتی چن کر جمع کیے ہیں، کیا اس شدتِ حزم و احتیاط کی نظیر مل سکتی ہے؟ علاوہ ازیں امام بخاری نے صحت حدیث کے جن سخت ترین شرائط و قیود کا پورا التزام کیا ہے، وہ اعتبار و اعتماد اور صحت و ثبوت کا منتہائے کمال ہے، دوسرے مولفین حدیث کے یہاں اس کی مثال مفقود ہے[۱]۔ یہ صحیح ہے کہ امام بخاری نے بہت سے تاریخی، لغوی اور فقہی مراجع پر اعتماد اور ان سے استفادہ کیا ہے، مگر اس میں بھی انھوں نے اپنی مجتہدانہ شان برقرار رکھی ہے، ان کی بعض اجتہادی آراء سے اختلاف رائے ممکن ہے، مگر عدم تحقیق و تنقیح کا تصور بھی محال ہے۔

استاذ فواد سزگین مزید رقمطراز ہیں:

"اسانید کے اعتبار سے صحیح بخاری درجۂ کمال کو نہیں پہونچتی ہے، چنانچہ تقریباً ربع کتاب کی اسانید ناقص ہیں، چوتھی صدی کے آغاز میں اس عمل کو تعلیق کا نام دیا گیا، اس بنا پر صحیح بخاری جمع و ترتیب اور اپنے مشمولات میں معروف شہرت سے محروم ہو جاتی ہے، خود امام بخاری کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ وہ ایسے عالم حدیث نہ تھے جنھوں نے اسناد کو درجۂ کمال تک پہونچایا، بلکہ وہ پہلے شخص ہیں جن سے اسناد کا انحطاط شروع ہوا[۲]...... بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسناد کی مکمل حقیقت سے امام بخاری واقف ہی نہ تھے، اور ان کے یہاں اسناد اپنا اعلیٰ مقام و مرتبہ کھو بیٹھی ہے[۳]۔"

فواد سزگین نے اپنی مذکورۃ الصدر تصنیف میں ایک مستقل باب علم حدیث کے مقدمہ کے طور پر سپرد قلم کیا ہے، جو تیس (۳۰) صفحات پر محیط ہے۔ اس میں موصوف نے علم حدیث کی کتابت و تدوین اور روایات کی تاریخ لکھنے کی کوشش کی ہے، اور بلا شبہہ انھوں نے بکثرت مفید معلومات کی نشاندہی کی ہے، لیکن بایں ہمہ حقیقت یہ ہے کہ حدیث و مصطلحات کی کتابوں کے بارے میں فواد سزگین کا مطالعہ صفر کے برابر ہے،

---

[۱] شروط الائمۃ الستۃ للمقدسی ص ۷، ۴۔ نیز ملاحظہ ہو مقالہ نگار کی کتاب البخاری ص ۱۱۲۔ [۲] تاریخ التراث العربی جلد دوم ص ۷، ۱۴۔ [۳] ایضاً ص ۱۱۴۔

انھوں نے خود مستشرقین کے افکار کو بغیر کسی تحقیق وتنقید کے قبول کر لیا ہے، اور امام بخاری وجامع صحیح کو اس کے بلند مقام سے گرانے کی کوشش کی ہے، جیسا کہ سطور بالا میں ذکر آچکا ہے۔ کہ امام بخاریؒ نے صحت حدیث کے سخت ترین شرائط کا پورا لحاظ رکھا ہے، امام صاحب کے یہاں راوی اور مروی عنہ میں ملاقات ہونا شرط ہے جب کہ امام مسلمؒ کے یہاں دونوں میں معاصرت ہی کافی ہے،

امام حازمی کا قول ہے کہ "دراصل امام بخاریؒ حدیث میں ایک مختصر کتاب تالیف کرنا چاہتے تھے، ان کا مقصد حدیث ورجال کا استیعاب کرنا نہیں تھا بس ان کی واحد شرط یہ رہی ہے کہ صحیح احادیث ہی کی تخریج کریں[1]" اسی بنا پر شناوران علم حدیث اور ماہرین اسماء الرجال نے دوسری کتب اسماء الرجال کی بہ نسبت بخاری ومسلم پر زیادہ اعتماد کیا ہے، صحیح بخاری میں جس راوی سے کسی حدیث کی تخریج کی گئی ہے، اس کے بارے میں شیخ ابوالحسن مقدسی کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ " ھذا جاز القنطرة " (یعنی یہ شخص پل پار کر گیا) مطلب یہ کہ اس راوی کے بارے میں کسی طرح کی نقد وجرح ناقابل اعتنا ہے[2]۔

خلاصہ کلام یہ کہ امام بخاریؒ نے کسی حدیث کو قبول کرنے سے پہلے تحقیق وجستجو میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کی ہے، مستشرقین کے اتباع میں ڈاکٹر فواد سزگین کے متذکرہ بالا افکار ونظریات تعجب انگیز ہیں، کیونکہ انھوں نے علم حدیث کی تاریخ لکھنے اور کتب حدیث ورجال کا تنقیدی جائزہ لینے کے لیے اپنی کتاب میں مستقل ایک فصل قائم کی ہے، اور تقریباً تیس ۳۰ صفحے تحریر کر ڈالے ہیں، انھوں نے اگر ایسا عدم واقفیت کی بنا پر کیا ہے، تو حق کی طرف رجوع واجب ہے، اور اگر عمداً ایسا کیا ہے تو ظاہر ہے اس کا مقصد حدیث کی بنیاد کو مکمل طور پر تباہ کرنا ہے، سردست راقم سطور مذکورہ بالا گزارشات ہی پر اکتفا کرتا ہے، ورنہ ہمارے مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ میں احمد امین اور فواد سزگین جیسی مثالوں کی کمی نہیں ہے، دراصل عصر حاضر میں یہ موضوع بے مداہنت کا حامل ہو گیا ہے۔ واللہ من وراء القصد وھو ولی التوفیق۔

(مترجمہ ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی)

---

[1] مقدمہ لامع الدراری ص ۴۹۔ [2] مقدمہ فتح الباری ص ۴۶۹۔

اسلام اور مستشرقین کے موضوع

پر

ایک سرسری نظر

(از مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی امیر جماعت اسلامی ہند)

"۔۔ یہ مقالہ عربی میں پیش کیا گیا تھا، اردو زبان میں اس کا ترجمہ مولوی عبید اللہ کوٹی ندوی، رفیق دارالمصنفین نے کیا ہے"

دارالمصنفین میں ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر علمی انداز میں ایک عالمی کانفرنس کا انعقاد اور اس میں عالم اسلام کے محققین اور ممتاز افراد اور ہند و بیرون ہند کی مختلف اکاڈمیوں کے نمائندوں کی شرکت اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ یہاں اس موضوع پر سیر حاصل بحث و گفتگو ہوگی، یہ کانفرنس اس جدید علمی ترقی کی بھی نمایاں علامت ہے جو ہندوستان اور بیرون ہند پورے عالم اسلام میں نشوونما پا رہی ہے، عالم اسلام کے کسی بھی گوشہ میں ایسی کانفرنس منعقد ہو سکتی تھی لیکن ہمارے ہندی دیار اور خصوصاً دارالمصنفین کو اپنی علمی کارگزاریوں کی بنا پر، اس کانفرنس کے منعقد کرانے کا زیادہ حق تھا، اس لیے کہ اس کی صدارت اور سرپرستی ہمارے فاضل دوست اور داعی اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے سپرد ہے، اور اس لیے بھی کہ علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں اس ادارہ کی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں،

اس ادارہ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس نے دنیا کو گراں قدر علمی تحفہ کے طور پر کئی اہم کتابیں دی ہیں، جن میں خاص طور پر الفاروق، ارض القرآن، سیرت عائشہ، انتقاد علی التمدن الاسلامی، مقالات شبلی، سیرۃ النبی ﷺ اور سیر صحابہ ؓ کی سلسلہ وار جلدیں اور الجہاد فی الاسلام قابل ذکر ہیں، یہ تمام کتابیں عالم اسلامی کا ورثہ ہیں، ان

ہیں بعض کتابیں مثلاً علامہ شبلی و علامہ سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبیؐ تو پورے عالم اسلام میں بے نظیر ہے، ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشآء،

اس موقع پر، کانفرنس ہی کے کسی موضوع پر مجھے بھی دلائل و براہین سے آراستہ کوئی مضمون پیش کرنا چاہیے تھا، لیکن افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں مجھے کامیابی نہیں ہوئی، میرے متنوع مشاغل نے اس طرح کے کسی مقالہ کی تکمیل کا مجھے موقع نہیں دیا، پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ سرسری انداز میں مستشرقین اور ان کی کارگزاری کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کردوں

مستشرقین کی خدمات اور ان کے مقاصد

یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ گزشتہ صدیوں میں، یورپ نے علوم اسلامیہ کے مطالعہ میں جو دلچسپی لی اور ادب و سیرت اور مختلف علوم کی قدیم کتابوں کی نشرواشاعت کے لیے جو تگ ودو کی، اس کے لیے یورپ تحسین و آفریں کا مستحق ہے، جب کہ ہم مسلمانوں کو اس طرف متوجہ ہونا چاہیئے تھا، اور ہماری غفلت شعاری کی وجہ سے دنیا کے مشہور کتب خانوں کے گوشۂ خمول میں یہ کتابیں بند پڑی تھیں، ان تک عام اہل علم کی نظریں نہیں پہنچ سکتی تھیں، اور نہ ہی ان سے استفادہ ممکن تھا یورپ نے ان کتابوں کو طبع واشاعت کے ذریعہ، عام کردیا، جس پر وہ ہماری طرف سے شکریہ کا مستحق ہے، اس لیے کہ جو شخص بھی، کوئی قابل قدر اور یادگار خدمت انجام دے، اس کا شکرگزار ہونا ایک اخلاقی فریضہ ہے، لیکن اس کے پہلو بہ پہلو چند اور گوشوں کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے،

میرا خیال یہ ہے کہ مذکورہ بالا علمی جدوجہد، حق کی جستجو یا کسی بلند اخلاقی مقصد کے بجائے یورپ کی اپنی سیاسی ضرورتوں کا نتیجہ تھی، یورپ میں علمی ترقی کے آغاز، دنیا کے ایک بڑے حصہ پر اس کے تسلط، اور مشرق پر اس کے سیاسی اقتدار کے نتیجہ میں یورپ کو مشرقی روایات وافکار سے واقفیت کی ضرورت کا احساس ہوا، مستشرقین اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے سامنے آئے، اور وہ اس میں اس حد تک کامیاب ہوئے کہ مغربی تہذیب کی چمک سے جن لوگوں کی نگاہیں خیرہ ہوچکی تھیں، انھوں نے بھی علوم اسلامیہ کے مطالعہ وتحقیق کے کے لیے مغرب کے سفر شروع کردیئے، حالانکہ یورپ، اسلام کے تصور وحی کا قائل نہ تھا، اور نہ ہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اس نے اعتراف کیا تھا، مگر اس کے باوجود، مستشرقین کو اپنی کوششوں میں یہاں تک کامیابی ہوئی کہ وہ

علوم اسلامیہ میں بھی سند تسلیم کر لیے گئے، اور ان کو ان علوم میں بھی استاد کی حیثیت حاصل ہو گئی، یہ ذہنیت دراصل یورپ کے مقابلہ میں عالم اسلام کی اس شکست کا نتیجہ تھی، جس سے ہر جگہ مسلمان دوچار ہوئے ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ میدان جنگ میں شکست کے مقابلہ میں یہ ذہنیت زیادہ خطرناک تھی،

دوسری بات جس کی طرف مجھے آپ حضرات کی توجہ مبذول کرانی ہے، وہ یہ ہے کہ صلیبی جنگوں کی وجہ سے مستشرقین میں جو معاندانہ رویہ پرورش پاتا رہا اس کو کسی بھی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، ان میں معدودے چند کے سوا جن کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے، مستشرقین کی اکثریت، اپنی بلند علمی حیثیت کے باوجود، حق اور صداقت کے بنیادی فرض کی ادائیگی میں بھی، اپنے کو معاندانہ رویہ سے نہیں بچا سکی، اسی وجہ سے وہ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لکھی جانے والی اپنی تحریروں میں، غلط واقعات اور بناوٹی قصوں کہانیوں کی نشر و اشاعت اس طرح کرتے ہیں، گویا کہ وہ ثابت شدہ واقعہ ہوں، اسلام کے تصور توحید کے بارے میں یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ وہ اتنا واضح ہے جس کی مثال کسی دوسرے مذہب میں موجود نہیں، مگر مستشرقین نے اس کے باوجود، دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ اسلام بھی بت پرستی ہی کی ایک نئی شکل ہے، اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ میں دوسرے قدیم مجسموں کو ہٹا کر اپنا ایک زریں مجسمہ نصب کروا دیا تھا، انھوں نے نزول وحی کی کیفیت کو مرگی قرار دیکر لوگوں میں یہ خیال پیدا کرنے کی کوشش کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی یا کوئی آسمانی پیام نہیں آیا بلکہ وہ مرگی کے مریض تھے، اور مرگی کا دورہ گزر جانے کے بعد، آپ لوگوں سے یہ کہدیا کرتے تھے کہ یہ نزول وحی کی حالت تھی، پھر آپ لوگوں کو اپنی طرف سے چند آیات سنا دیا کرتے، کچھ مستشرقوں نے یہ غلط کہانی ایجاد کی، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند کبوتروں کو تعلیم و تربیت دے کر تیار کیا تھا، وہ آپ کے کاندھوں پر کان کے قریب آکر بیٹھ جاتے، اور آپ لوگوں سے یہ فرمایا کرتے کہ یہ کبوتر جو تم میرے کاندھوں پر دیکھ رہے ہو، یہ پرندے نہیں ہیں، بلکہ جبرئیلؑ ہیں، جو خدا کی طرف سے پیغام لے کر میرے پاس حاضر ہوئے ہیں، چند مستشرقین یہ لکھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو دین پیش کرتے ہیں وحی آسمانی سے اس کا کوئی تعلق نہیں، وہ بحیرہ راہب کی تعلیم سے ماخوذ ہے جس سے آپ نے اپنے سفر شام کے دوران میں ملاقات کی تھی، اسی بنا

پر مستشرقین کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ اسلام کوئی مستقل مذہب نہیں، وہ عیسائیت ہی کی شاخ ہے، چند محققین نے دنیا کو یہ یقین دلانے کے لیے زبردست کوششیں کی ہیں کہ اسلام کی اشاعت اس کے اعلیٰ مقاصد اور خیر تعلیمات کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف تلوار کے بل پر ہوئی ہے، کچھ لوگوں نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی "نصرت بالرعب" (مجھے خدا کی طرف سے عظمت اور دبدبہ عطا ہوا ہے) کے معنی غلط سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اس سے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام ایک دہشت پسند دین ہے، کچھ اہل تحقیق نے اپنے قلم کا سارا زور یہ ظاہر کرنے میں صرف کر دیا کہ اسلامی قوانین خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوئے، بلکہ اس کا ایک حصہ رومن لا سے اور دوسرا حصہ حمورابی کے قوانین سے ماخوذ ہے۔

یہ لوگ جب اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کے بارے میں کچھ لکھتے ہیں، تو مسلمانوں پر الزام تراشی سے نہیں چوکتے، چنانچہ اسکندریہ اور بغداد کے دو کتب خانوں کو نذر آتش کیے جانے کا الزام انھوں نے بڑی جسارت کے ساتھ مسلمانوں پر لگایا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمتیں نازل فرمائے حجۃ الاسلام علامہ شبلی نعمانی پر جنھوں نے سیرۃ النبیؐ، الانتقاد علی التمدن الاسلامی اور اپنی دوسری کتابوں میں واضح دلائل کے ذریعہ اس طرح کی دروغ بیانیوں اور الزام تراشیوں کا جواب دیا ہے۔

مستشرقین کی افترا پردازیوں اور دسیسہ کاریوں کی یہ چند مثالیں ہیں، علمائے اسلام نے ان کی بہتان طرازیوں پر واضح دلائل کے ذریعہ اطمینان بخش جوابات دیئے ہیں، جس کے ردعمل کے طور پر مستشرقین نے اپنے نقطۂ نظر میں کسی قدر ترمیم کرنے کے بعد، بڑی حکمت اور ہوشیاری سے اپنا رویہ تبدیل کر دیا، اور اب وہ اپنے مقصد سے ذرا بھی تغافل کیے بغیر، عدل و انصاف کا لبادہ اوڑھ کر لوگوں کے سامنے نمودار ہوئے، انھوں نے سیرت طیبہ پر علم نفسیات اور دوسرے علوم کی روشنی میں اعتراضات کیے، تاکہ وہ یہ ثابت کر سکیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا میں جنسی میلانات پر قابو پانے کی کوشش کی، مگر وہ اس میں ناکام ہوئے، تا آنکہ تعدد ازدواج کی صورت میں اس کے نتائج ظاہر ہوئے۔

اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مستشرقین کی سرگرمیوں کے یہ چند نمونے ہیں، انھوں نے سیرت و تاریخ اور ادب و تاریخ کے میدان میں علمی، تاریخی اور ادبی تحقیق کا دعویٰ کرتے ہوئے، اور آزادیٔ فکر و رائے کا نام

لے کر، اسلامی عقائد، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے بارے میں شک وریب کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

میں نے مستشرقین، اور ان کی کارکردگی کے بارے میں اپنے چند تاثرات کا یہاں اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے، اور اس کی روشنی میں،

پہلی بات جس کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب تک مستشرقین کو استادانہ حیثیت حاصل رہے گی، اور جب تک وہ علوم اسلامیہ میں مرجع اور مستند بنے رہیں گے، اور جب تک اسلام کے افہام وتفہیم کے لیے وہ لوگوں کی توجہات کا مرکز بنے رہیں گے، اس وقت تک اسلامی معاشرہ میں شک وریب کی تخم ریزی کا دروازہ بھی کھلا رہے گا، لیکن اسی کے ساتھ ہمیں مستشرقین کی علمی کاوشوں کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے ورنہ ان سے صرف نظر کرنے کی وجہ سے ہم بہت سی قابل قدر کتابوں سے محروم ہو جائیں گے، ہمارے اہل نظر علماء کو مستشرقین کی طرف سے شایع ہونے والی کتابوں سے باخبر ہونے کے علاوہ ان کے نتائج فکر سے، ہوشیار اور چوکنا بھی رہنا چاہیے، تاکہ عالم اسلامی کو یہ معلوم ہوتا رہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی شہرت کو داغدار کرنے کے لیے کہاں اور کس کس طرح کوششیں کی جارہی ہیں، عام مسلمانوں خصوصاً ان کی نوجوان نسل اور تعلیم یافتہ غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد، اسلام اور سیرت نبوی سے واقفیت کے لیے مستشرقین ہی کی تحقیقات پر اعتماد کرتی ہے، اس لیے یہ علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ مستشرقین کے اثرات اور ان کی افترا پردازیوں اور نکتہ چینیوں کا دلائل کی روشنی میں جواب دیں، تاکہ حق وباطل کی تمیز ہو سکے، اور واضح دلائل کی روشنی میں صحیح اور غلط کا فیصلہ کیا جا سکے،

مذکورہ بالا مقصد کے پیش نظر یہ بھی ضروری ہے کہ ہم علم وتحقیق کی اعلیٰ سطح پر جدید تقاضوں کے مطابق، اسلامی تعلیمات اور سیرت نبوی پر وقیع اور قابل قدر کتابوں کا ایک سلسلہ تیار کردیں، یہ کتابیں اسلوب اور معنی کے لحاظ سے مستشرقین کی تالیف کردہ کتابوں سے اپنے معیار اور اسلوب میں بلند تر ہوں یا کم از کم ان سے فروتر نہ ہوں، اور تب ہی لوگ مستشرقین سے بے نیاز ہو سکیں گے، اور ان کو زیادہ بہتر انداز میں آسانی سے ان کا بدل مل سکے گا،

میں یہ سمجھتا ہوں کہ پوری اسلامی دنیا پر، یہ دینی اور تاریخی ذمہ داری عائد ہوتی ہے لیکن ہندوستان میں دوسروں کے مقابلہ میں دارالمصنفین اس کام کی تکمیل کی زیادہ اہلیت رکھتا ہے، اس لیے کہ یہ کام اس کے مقاصد اور نصب العین کے عین مطابق ہے،

ہمارے نصب العین کا یہ بھی ایک لازمی تقاضا ہے کہ ہم اسلام کے بارے میں قابل قدر کتابوں کی اشاعت، اور مخالفوں کی بہتان طرازیوں کے جوابات ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر، اسلام کی نمایندگی کے لیے سچے اور زندہ نمونوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کریں، اسلامی روایات واقدار کے تعارف اور دشمنوں کی تدبیروں کو بے اثر کرنے کی یہی ایک کارگر صورت ہے، اور اسی کے ذریعہ ہم زیادہ موثر طور پر لوگوں کے دل ودماغ میں یہ یقین پیدا کر سکتے ہیں کہ ہمارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کے لیے ہیں، اور خدا نے آپ کو روشن چراغ، اور سب ہی کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے، جو دین آپؐ نے پیش کیا ہے وہ تمام مذاہب میں سب سے زیادہ مکمل ہے، اور اس دور کے انسانی معاشرہ کو جن پیچیدگیوں اور دشواریوں کا سامنا ہے۔ ان کے حل کی واحد راہ وہی ہے جس کی طرف اسلام نے رہنمائی کی ہے،

میں آخر میں اپنے گہرے دوست، دارالمصنفین کے ناظم اور معارف کے ایڈیٹر جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا ممنون اور شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو کیا اور مجھے یہ موقع دیا کہ اس علمی کانفرنس سے مستفید ہو سکوں، اور ممتاز علماء سے ملاقات کا شرف حاصل کروں، اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں میں برکت عطا فرمائے، ہم خدائے تعالیٰ سے متوقع ہیں کہ وہ اس راہ میں توفیق اور رہنمائی سے ہمیں سرفراز فرمائے،

مستشرقین کے بارے میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ارشادات گرامی

نوٹ:۔ "دار المصنفین کے اس سیمینار میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے خطبۂ صدارت میں جو کچھ فرمایا تھا وہ "اسلامیات اور مغربی مستشرقین و مسلمان مصنفین" کے عنوان سے شایع ہو گیا ہے، یہ کتاب دار المصنفین اور مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ سے مل سکتی ہے، اس میں سے کچھ اقتباسات، ہم یہاں ناظرین کے لیے پیش کرتے ہیں۔

اس حقیقت کا اعتراف ایک صاحب علم کا علمی و اخلاقی فرض ہے کہ متعدد مستشرقین نے اسلامی علوم کے مطالعہ میں اپنی ذہنی و علمی صلاحیتوں کا فیاضانہ استعمال کیا، انھوں نے اس کام کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، ان میں سے بہت سے فضلاء نے مشرقی اور اسلامی علوم کا موضوع، سیاسی، اقتصادی اور مشنری اغراض و مقاصد کے ماتحت نہیں بلکہ محض شوق علم اور جذبۂ بحث و تحقیق کی خاطر اختیار کیا اور اس کام میں خاصی جگر کاوی اور دیدہ ریزی کا ثبوت دیا، یہ ہٹ دھرمی اور ناانصافی ہوگی کہ ان کے اس پہلو کا اظہار و اعتراف نہ کیا جائے، انکی کوششوں سے بہت سے نادر اسلامی مخطوطات جو صدیوں سے سورج کی روشنی سے محروم تھے نشر و اشاعت سے آشنا ہوئے، اور نادان و نااہل وارثوں کی غفلت اور کرم خوردگی سے بچ گیے، کتنے علمی ماخذ اور اہم تاریخی دستاویزیں اوّل اوّل انھیں کی کوششوں اور علمی دلچسپی اور شغف کے نتیجہ میں منظر عام پر آئیں جن سے مشرقی دنیا کے علماء و محققین کی آنکھیں روشن ہوئیں، اور ان کے علم و تحقیق

کا کام آگے بڑھا۔

ان سب مستشرقین کے ناموں اور کاموں کا احاطہ تو اس مقالہ میں ممکن نہیں جن کا علمی دنیا پر احسان ہے، محض مثال کے طور پر مندرجہ ذیل حضرات کا نام لیا جا سکتا ہے، پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ جن کی قابل قدر کتاب (The preaching of Islam) (دعوت اسلام) ہے، اسٹینلی لین پول جن کی کتاب (Saladin) (سلطان صلاح الدین ایوبی) اور (Moors in Spain) (عرب اندلس میں) بڑی معرکہ کی منصفانہ تصنیفات ہیں، ڈاکٹر اسپرنگر جنھوں نے حافظ ابن حجر عسقلانی کی مشہور کتاب "الاصابہ فی تمییز الصحابہ" مطبوعہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کو ایڈیٹ کیا، اور اس پر انگریزی میں ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا، اڈورڈ لین جو ان عربی و انگریزی ڈکشنری کے مرتب ہیں، جو (Arabic English Lexicon) کے نام سے مشہور ہے، اور انگریزی زبان میں عربی مفردات کی تفصیلی شرح کے مقابل اعتماد مرجع کی حیثیت رکھتی ہے، اور جس سے خود عربی زبان اور عربی نحو کے ماہرین فائدہ اٹھاتے ہیں، اے۔ جے۔ ونسنک (A. J. Wensinck) جنھوں نے ائمہ محدثین کی حدیث و سیرت و مغازی پر مشتمل چودہ کتابوں سے عربی حدیث کے لیے بڑا ہی مفصل انڈکس تیار کیا ہے، اور علمی و فقہی عنوانات، اسماء اور سیرت کی بعض ذیلی سرخیوں پر اس کو ترتیب دیا ہے، پھر ان عنوانات کو حروف تہجی پر مرتب کیا ہے، مشہور مصری عالم استاذ فواد عبد الباقی نے اس کتاب کو عربی میں منتقل کیا ہے، اور اس کا نام "مفتاح کنوز السنۃ" رکھا ہے، علامہ سید رشید رضا مصری اور علامہ احمد محمد شاکر نے اس پر بڑے فاضلانہ اور اعتراف و تشکر آمیز مقدمے لکھے ہیں، اسی طرح مستشرق ونسنک نے "المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی" (احادیث نبوی کے الفاظ کی ڈکشنری) کی ترتیب میں بڑی نگرانی کا کام انجام دیا ہے جس کی ترتیب و تالیف میں کئی مستشرق علماء و محققین شریک ہیں، اور اس کو ۱۹۳۶ء میں پہلی مرتبہ شائع کیا، مذکور الصدر کتاب کے مقابلہ میں اس کتاب سے استفادہ آسان ہے، یہ سات جلدوں میں شائع ہوئی ہے، جی لی اسٹرینج (G. le Strange) کی کتاب (Lands of The Eastern Caliphate) (جغرافیہ خلافت مشرقی) بھی اسی ذیل میں آتی ہے۔

یہ تمام تصنیفات اور علمی و تحقیقی کوششیں اس بات کی دلیل ہیں کہ ان مصنفین و مرتبین نے سنجیدگی کوئی

کسر نہیں اٹھا رکھی اور اس طویل جاں گسل مطالعہ اور کاوش بحث و تحقیق میں اپنے موضوع کے ساتھ خلوص و انہماک کا پورا ثبوت دیا ہے،

لیکن مستشرقین کے علم و فضل کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس موقر علمی مجلس میں اس حقیقت کی وضاحت کرنے میں کوئی باک نہیں کہ مستشرقین کے ایک بڑے طبقہ کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اسلامی شریعت مسلمانوں کی تاریخ اور تہذیب و تمدن میں کمزوریوں اور غلطیوں کی تلاش و جستجو میں وقت صرف کریں اور سیاسی و مذہبی اغراض کی خاطر رائی کا پربت بنائیں، اس سلسلہ میں ان کا رول بالکل اس شخص کی طرح رہا ہے جس کو ایک منظم و خوشنما و خوش منظر شہر میں صرف سیور لائنز، نالیاں، گندگی اور گھورے نظر آئیں، جس طرح محکمہ صفائی کے انچارج (Drain Inspector) کا کسی کارپوریشن اور میونسپلٹی میں فریضہ منصبی ہوتا ہے کہ اس طرح کی رپورٹ پیش کرے، وہ متعلقہ ڈپارٹمنٹ کو جو رپورٹ پیش کرتا ہے، اس میں طبعی طور پر قارئین کو سوائے گندگیوں اور کوڑے کرکٹ کے تذکرہ کے عام طور پر کچھ نہیں ملتا،

افسوس کی بات ہے کہ ہم بہت سے مستشرقین کو یہی کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، وہ اپنی ساری کد و کاوش تاریخ اسلام، اسلامی معاشرہ، تہذیب و تمدن اور ادب و ثقافت میں جھول اور کمزوریوں کی تلاش و نشاندہی میں صرف کرتے ہیں، پھر مولناک اور ڈرامائی انداز میں ان کو پیش کرتے ہیں، ان کی ذہانت و طباعی کا پورا مظاہرہ چہرۂ اسلام کو بدنما دکھانے میں ہوتا ہے، اور اس طرح اسلامی ممالک کے زعماء و قائدین کے (جنھوں نے یورپ کی بڑی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی یا اسلام کا مطالعہ یورپین زبان میں کیا ہے) دل و دماغ میں اسلام اور اسلامی قانون و تہذیب کے سرچشموں کے بارے میں تشکیک و شبہات پیدا کرتے ہیں اور اسلام کے مستقبل سے ناامیدی، حال سے بیزاری اور ماضی سے بدگمانی اس طرح پیدا کر دیتے ہیں، کہ ان کا سارا جوش و خروش دین کو عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے (Modernisation) اور اسلامی قانون میں اصلاح و ترمیم کی مہم چلانے میں منحصر ہو کر رہ جاتا ہے،

بہت سے مستشرقین کا یہ بھی طریقہ رہا ہے کہ وہ پہلے ایک مقصد متعین کر لیتے ہیں پھر ہر ممکن طریقہ سے اس مقصد کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ رطب و یابس معلومات (جن کا بعض اوقات موضوع سے کوئی تعلق

نہیں ہوتا) دینی تاریخی اور ادبی کتابوں بلکہ شعر و شاعری، قصّوں کہانیوں، مسخروں کی خوش گپیوں اور علیٰ نظر لوں کی نگارشات سے (خواہ وہ کتنی ہی سطحی اور بے ہودہ ہوں) معلومات اخذ کرتے ہیں، پھر مکمل فنکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی بنیاد پر ایسے علمی نظریات قائم کرتے ہیں جن کا ان کے ذہن و دماغ کے علاوہ کہیں وجود نہیں پایا جاتا۔ اکثر ان کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ تاریخ اسلام کی کسی محبوب و معظّم شخصیت کی کسی ایک کمزوری کی نشاندہی کرتے ہیں، اور قارئین کے دلوں میں اس کی جگہ بنانے کے لیے دسؔ پندرہ فضائل و محاسن (جن کی صحیفۂ اخلاق میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی) بڑی دریادلی سے ذکر کر جاتے ہیں، نتیجۃً قاری ان کی کشادہ دلی اور سیر چشمی سے مرعوب اور ان کی انصاف پسندی سے متاثر ہو جاتا ہے، اور اس کمزوری کو (جو تمام فضائل و محاسن پر پانی پھیر دیتی ہے) قبول کر لیتا ہے، یہ مستشرقین کسی دعوت و شخصیت کے [illegible] تاریخ اور طبعی اسباب و محرکات کی ایسی مہارت اور چابک دستی سے تصویر کشی کرتے ہیں، کہ یہ خیال پیدا ہو [illegible] تا ہے کہ یہ دعوت یا شخصیت دراصل اسی احول اور انہیں محرکات کا قدرتی نتیجہ [illegible] کا طبعی ردّعمل تھا، اور گویا کوہ آتش فشاں پھٹنے کے لیے تیار تھا، اس شخصیت نے صحیح وقت پہچان لیا، ایک [illegible] دکھائی اور وہ پھٹ پڑا، اس لیے قاری کا ذہن کسی غیر مادی سرچشمہ یا طاقت کی طرف جانے نہیں پاتا اور اس شخصیت یا دعوت کی عظمت یا اس کے ساتھ تائید الٰہی اور ارادۂ غیبی کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا،

ان میں سے بہت سے مستشرقین اپنی کتابوں اور مضامین میں زہر کی ایک خاص مقدار بہت احتیاط سے ملاتے ہیں جو تنا سب سے بڑھنے نہ پائے، اور قارئین کے لیے وحشت کا باعث نہ بنے، اور ان کو بیدار اور محتاط نہ بنا دے، نیز "محقق علّام" کی انصاف پسندی اور خلوص نیت مشتبہ نہ کر دے، اس طرح کے مستشرقین کی تصنیفات ان مخالف مصنفین کے مقابلہ میں زیادہ ضرر رساں اور خطرناک ہوتی ہیں جو کھل کر دشمنی کا اظہار کرتے ہیں اور جن کی کتابوں میں دجل و فریب و افترا پردازی عُریاں طریقہ پر نظر آتی ہے کیونکہ مذکورۃ الصدر کتابوں کا مطالعہ کرنے والا، متوسط درجہ کا کتاب خواں، ان کو پڑھنے کے بعد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا،

عالم اسلام اور ممالک عربیہ کی علمی کمزوری، پست ہمتی اور بے مائگی کی یہ کھلی دلیل ہے کہ یہ ممالک ایک

طویل زمانہ سے خالص اسلامی موضوعات پر مستشرقین کی کتابوں کو ماخذ و مرجع سمجھتے ہیں، اور ان کے نزدیک ان کی یہ محققانہ کتابیں "کتاب مقدس" (Gospel) کی حیثیت رکھتی ہیں، مثال کے طور پر آر اے نکلسن کی کتاب A literary history of Arabs (تاریخ ادبیات عرب) ڈاکٹر پی کے ہٹی کی کتاب History of the Arabs (تاریخ عرب) کارل بروکلمان کی جرمن زبان میں کتاب Geschtirder Arabichen Literature (تاریخ عربی ادبیات) اور اس کا انگریزی ترجمہ The history of Arab Literature جو عربی ثقافت و فنون پر مشتمل ہے، گولڈزیہر کی کتاب Introduction of Islamic Theology & Law (اسلامی عقیدہ و شریعت کا تعارف) اور ـــــ Mohammed Nische Stadien Halle (مطالعۂ اسلامیات) شاخت کی کتاب The origins of Mohammeden Jurisprudence (فقہ اسلامی کے ابتدائی مآخذ) اور ڈبلیو سی اسمتھ کی کتاب Islam in Modern History (اسلام جدید دنیا میں) اور اے آر گب کی کتاب Wither Islam (اسلام کا رخ کس طرف ہے؟) مونٹگمری واٹ کی تصنیفات Mohammed in Mecca (محمدؐ مکہ میں) Mohammed in Medina (محمدؐ مدینہ میں) اور Mohammed prophet and statesman (محمدؐ بحیثیت نبی اور سیاستدان)

ان سب کتابوں کے بارے میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ اپنے موضوع پر یہ منفرد تصنیفات ہیں، اسلامی مشرق کی یونیورسٹیوں کے عربی زبان و ادب اور اسلامیات کے شعبوں میں ان کو اہم علمی مآخذ گردانا جاتا ہے، اور تصنیف و تالیف کا کام کرنے والے زیادہ تر انہی پر اعتماد کرتے ہیں، اسلامی انسائیکلو پیڈیا (Encyclo-paedia of Islam) جس کی تالیف کا کام مستشرقین کے ہاتھوں انجام پایا ہے (اگرچہ اس میں بعض مسلمان مقالہ نگاروں کا بھی کچھ حصہ ہے) اور جس کے کئی ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں، وہ اسلامی حقایق و معلومات کا سب سے بڑا ذریعہ اور سب سے قیمتی ذخیرہ سمجھا جاتا ہے، اور بعض عرب اور مسلمان ملکوں کے علمی حلقوں میں اس کو اسلام سے متعلق معلومات کا اساسی اور بنیادی ماخذ سمجھا جاتا ہے، مغربی عرصۂ دراز سے

اس کا لفظی ترجمہ شایع ہو رہا ہے، حالانکہ مصر جیسے ملک سے اس کی توقع تھی کہ وہ مسلمان محققین اور اسلامی موضوعات پر اصحاب اختصاص مسلمانوں کے قلم سے مستقل اسلامی انسائیکلوپیڈیا (دائرۃ المعارف الاسلامیہ) پیش کرتا[1]،

مستشرقین کے منفی اثرات کے ازالہ کے لیے علمائے اسلام، محققین و مفکرین اور مسلمان ریسرچ اسکالرز کی ذمہ داری ہے کہ وہ علمی موضوعات پر محققانہ اور "اوریجنل" بحثیں تیار کریں، اور عالم اسلام کو صحیح اور قابل اعتماد معلومات اور اسلام کے صحیح تصورات اور حقایق سے (ان خوبیوں اور امتیازات کا لحاظ کرتے ہوئے جو مستشرقین کی خصوصیات سمجھی جاتی ہیں) روشناس کریں، بلکہ علمی اسلوب و اصول بحث، مجتہدانہ تحقیق و دقت نظر و وسعت مطالعہ، مآخذ و مراجع کی صحت و استناد اور پر زور استدلال و استنتاج میں ان پر بھی فوقیت لے جائیں، اور ان غلطیوں اور کمزوریوں سے بھی محفوظ ہوں جن کے عام طور پر مستشرقین شکار ہوتے ہیں،

یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمان علماء و محققین، مستشرقین کی تصنیفات و علمی تحقیقات کا جائزہ لیں، اور حقایق و واقعات کی روشنی میں ان کا علمی محاسبہ کریں، ان کی دسیسہ کاریوں اور عربی عبارتوں کے مفہوم سمجھنے یا ان کی تحلیل و تشریح میں ان کی غلطیوں کی نشاندہی کریں، جس سے قارئین کو یہ معلوم ہو کہ جن مراجع و مآخذ پر وہ اعتماد کرتے ہیں، وہ ناقابل اعتماد ہیں، انھوں نے ان سے جو اہم نتائج نکالے ہیں اور ان پر اپنے دعوے کی پوری عمارتیں قائم کرلی ہیں، ان کی بنیاد ہی کمزور، مشکوک یا سرے سے معدوم ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دکھائیں کہ انکی معصومانہ علمی کاوشوں میں سیاسی و مذہبی (مشنری) اغراض و مقاصد کہاں تک کام کر رہے ہیں[2]،

---

[1] یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ لاہور کی پنجاب یونیورسٹی میں اردو اسلامی انسائیکلوپیڈیا کا جو کام ہوا ہے اور جاری ہے وہ حذف و اضافہ، تنقیحات و تشریحات کے ایک مستقل علمی کام کی حیثیت رکھتا ہے، [2] راقم السطور کو جولائی ۱۹۷۸ء میں لاہور کے قیام کے دوران یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ پروفیسر ظفر علی قریشی صاحب نے مستشرقین کی تنقید پر تمام تصنیفات و مقالات جمع کرنے اور ان پر علمی تنقید، محاسبہ اور تردید کا کام شروع کیا ہے، اس سلسلہ میں انہوں نے ایک مفصل قیمتی بحث انگریزی میں لکھی ہے، جو کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہے، راقم السطور ان کی اس انفرادی رضاکارانہ کوشش اور ان کے ذاتی کتبخانہ کو دیکھکر متاثر اور مسرور ہوا، ساتھ ہی ساتھ اس پر تعجب بھی کہ کسی مسلم حکومت یا بڑے ادارہ کی طرف سے اس کام کی قدر دانی اور ہمت افزائی کا ثبوت نہیں دیا گیا،

لیکن صرف ناقدانہ اور سلبی کام کافی نہیں ہے، مثبت اور تعمیری کام بھی ناگزیر ہے۔ اس کی فوری ضرورت ہے کہ اسلامی موضوعات پر عمیق و فکر انگیز معلومات اور محققانہ علمی کام کا سلسلہ جاری رہے، جو تحلیل و تجزیہ، آخذ و مراجع کے دیانت دارانہ حوالہ اور مفید و متنوع تفصیلی انڈکس سے (جو مستشرقین کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے) معمور ہو، اس سلسلہ میں ایسے مواد اور کتابوں سے بھی استفادہ کیا جائے جن کی طرف بادی النظر میں ذہن نہیں جاتا اور جن کا موضوع سے براہ راست تعلق نہیں ہوتا، اور روایتی طور پر وہ تاریخ کی کتابیں سمجھی جاتی ہیں، جو عام طور پر سرکار و دربار، حرب و ضرب اور سیاسی حوادث و واقعات کے گرد گردش کرتی ہیں، اس جدید مواد اور ایسے مفید مآخذ کی (بہت سا علمی کام ہو جانے کے باوجود) اب بھی کمی نہیں جو ایک محنت کش، دیدہ ور اور علم و تحقیق کی سچی پیاس رکھنے والے عالم و محقق کے منتظر ہیں، آج بھی ہاتف غیبی کی صدا کانوں میں آتی ہے ؂

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں

ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

ساتھ ہی اس کی بھی ضرورت ہے کہ ایسے خالص علمی اور تحقیقی کاموں میں بے جا تطویل اور عبارت آرائی سے گریز کیا جائے اور حتی الامکان طنز و تضحیک اور مفروضات کے قائم کرنے سے پرہیز کیا جائے، کیونکہ اس طریقۂ کار (طنز و تضحیک) سے بحث و تحقیق کا علمی وقار اور تحقیقی وزن جاتا رہتا ہے، جب تک یہ دونوں کام نہ انجام دیئے جائیں گے، اس وقت تک عالم اسلام کا وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو ذہین اور حوصلہ مند نوجوانوں پر مشتمل ہے اور جو یورپ و امریکہ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پا رہا ہے، یا خود اپنے ملک میں اسلام کا مطالعہ یورپین زبانوں میں کرنے کا عادی ہے، مستشرقین کے مسموم افکار اور ان کی ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہو سکتا،

زندگی کے کسی گوشہ میں بھی خلا زیادہ دیر تک باقی نہیں رہ سکتا، یہ خدا کے تکوینی قوانین اور فطرت بشری کے منافی ہے، کیونکہ حاجتمند اگر صحیح ذریعہ سے اپنی ضرورت پوری نہیں کر سکتا تو غلط اور نامناسب طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، جب تک مستشرقین اور مغربی مفکرین کی (اسلامیات کے میدان تک ہی) فکری قیادت اور علمی رہنمائی کا سلسلہ جاری ہے، اس وقت تک عالم اسلام عقلی و ذہنی انتشار اور فکری ارتداد کی آندھیوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا، تجدد و مغربیت کے داعی و علمبردار، مغرب کے افکار و خیالات کے نقیب و ترجمان بنتے رہیں گے اور جب

ان کو سیاسی اقتدار حاصل ہوگا تو وہ بزورِ حکومت اور قانون سازی کے ذریعہ وہ "اصلاحات" نافذ کریں گے، جو اسلام پر تیشہ زنی کے مرادف ہوں گی، وہ ایسے معاشرہ کو تشکیل دیں گے جو قدیم اسلامی معاشرہ اور واقعاتی دنیا میں کلیۃً ایک مغربی اور مادی معاشرہ ہوگا، اس وقت اس کے داعیوں اور نقیبوں اور راہروؤں کو مخاطب کرکے عارف شیرازی کے الفاظ میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ؎

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

ان ممالک میں جو اسلامی و مغربی تہذیبوں اور فلسفوں کی آویزش کا میدان تھے، ہندوستان کو یہ امتیاز و فخر حاصل ہے کہ اس سلسلہ کا سب سے بڑا کام اس کی سرزمین پر انجام پایا، دار المصنفین (ہماری معلومات کی حد تک) سب سے پہلی علمی و تحقیقی اور غیر سرکاری اکیڈمی ہے جس کا قیام مغرب کے فکری حملوں اور مستشرقین کی مسموم تصنیفات اور مضامین کی تردید، تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اسلامی تعلیمات کی برتری پر مطمئن کرنے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم شخصیت و سیرت اور اس نسل کے کارناموں سے واقف کرانے (جس نے آغوشِ نبوت میں تربیت پائی تھی) اور اسلام کے علمی و تحقیقی سرمایہ سے متعارف کرانے کی خاطر عمل میں آیا،

مشہور مسیحی مصری فاضل جرجی زیدان نے بیسویں صدی کے اوائل میں جب مصر سے اپنی مشہور کتاب (تاریخ التمدن الاسلامی) شایع کی تو علمی حلقوں میں اس کی دھوم مچ گئی، جرجی زیدان کی اس کتاب میں معلومات و مواد کی فراوانی کے ساتھ ساتھ، اموی اور عباسی خلفاء کے ساتھ حق تلفی کا معاملہ اور بعض تاریخی حقائق کی تحریف سے کام لیا گیا تھا، اور کتب خانۂ اسکندریہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے آگ لگا دینے کی اس بے اصل داستان کو دہرایا گیا تھا جو عرصہ سے مسیحی مورخین کا وتیرہ بن گیا تھا، اس کتاب کے مطالعہ سے علامہ شبلی کی رگ حمیت پھڑک اٹھی، اور مؤلف کا علامہ کی تعریف و توصیف اور ان کی کوششوں کو سراہنا، بعد مکانی اور خود مصر میں جید علماء کی موجودگی، کوئی چیز بھی علامہ شبلی کی راہ میں حائل نہ ہو سکی، انھوں نے عربی زبان میں ۱۹۱۲ء میں الانتقاد علی التمدن الاسلامی کے نام سے کتاب لکھی جس میں پرزور دلائل سے ان الزامات کی تردید کی، ہندوستان و مصر کے علمی حلقوں میں اس کتاب کو بہت پسند کیا گیا، اور اہل حمیت اور

عرب فضلاء، و بالخصوص علامہ سید رشید رضا نے ان کی اس خدمت کا ممنونیت و تشکر کے ساتھ ذکر کیا،

دبستان شبلی نے بحث و تحقیق، وسعت مطالعہ، قلم کی شائستگی اور تحریر کی شگفتگی کے دلآویز نمونے پیش کیے۔ اس مکتب فکر کے فضلاء نے عالمانہ و ادیبانہ طرز تصنیف و حسن ترتیب کے میدان میں قائدانہ کردار ادا کیا ہے، انھوں نے علمی و تحقیقی بلکہ فلسفیانہ اور متکلمانہ مضامین کیلئے وہ اسلوب تحریر اختیار کیا جو سنجیدہ اور عالمانہ مقاصد کے لیے ہر طرح موزوں تھا جس میں زبان کی چاشنی اور ادب وانشاء کا حسن، صحیح تناسب کے ساتھ پایا جاتا ہے، یہ خصوصیت نئی نسل کے ان خوش مذاق نوجوانوں کے لیے باعث کشش بن گئی، جو ادب وانشاء کی چاشنی کے بغیر کسی ٹھوس، غور طلب اور فکر انگیز مضمون یا کتاب کا مطالعہ نہیں کر سکتے۔ اس دبستان کی کتابوں اور مضامین نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلامی تہذیب و ثقافت، مسلمانوں کی تابناک تاریخ اور ان کی علمی و تمدنی خدمات کو اس طرح پیش کیا جس نے اسلام کی برتری اور عظمت اور اسلاف کی ذہنی اور انسانی بلندی پر اس کا اعتماد جو جدید تعلیم اور مغربی لٹریچر کے اثر سے متزلزل ہو رہا تھا بحال کر دیا، اور اس احساس کہتری کو دور کرنے میں موثر رول ادا کیا جو ۱۸۵۷ء کے بعد اس میں پیدا ہو گیا تھا،

ان مصنفین کی تصنیفات اور مضامین کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی بحث و تحقیق میں براہ راست واقفیت اور اصلیت (Originality) پائی جاتی ہے جو ان کی عربی و فارسی زبانوں پر قدرت اور اصل مآخذ سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت اور علوم اسلامیہ کی باقاعدہ تحصیل کا نتیجہ تھی اور جس کی کمی مستشرقین کے خوشہ چینوں اور بالواسطہ (Second hand) معلومات رکھنے والوں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

علامہ شبلی کا (جو دارالمصنفین کے خیال و منصوبہ کے اصل محرک ہیں) سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر جدید و قدیم طرز کے عام مصنفین کی روش اور طریقہ سے ہٹ کر وسیع تخیل اور ہمہ گیر و مکمل خاکہ کے ساتھ کام شروع کیا جس کو ان کے نادرۂ روزگار تلمیذ و جانشین مولانا سید سلیمان ندوی نے اور زیادہ وسعت دے کر سات جلدوں میں مکمل کیا، اس سلسلہ کی پہلی جلد مکمل علامہ شبلی کے قلم سے ہے دوسری جلد میں مولانا سلیمان ندوی کے اضافے ہیں، بقیہ جلدیں ان ہی کے رواں اور شاداب قلم کا نتیجہ ہیں، تیسری جلد کا تعلق دلائل و معجزات نبوی سے ہے، چوتھی جلد منصب نبوت، نبوت کے خصائص، بعثت محمدی کے وقت

جزیرۃ العرب اور متمدن دنیا کے حالات اور اسلامی عقائد سے تفصیلی بحث کرتی ہے، پانچویں جلد عبادات بدنی، مالی، قلبی کے ساتھ مخصوص ہے، چھٹی جلد اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور اس کے اخلاقی فلسفہ سے متعلق ہے، اس موضوع پر ہمارے علم میں تفصیل اور دیدہ ریزی سے کم لکھا گیا ہے، ساتویں اور آخری جلد معاملات اور سیاست کے موضوع پر ہے، اور اس طرح یہ کتاب سیرت و تعلیمات نبوت کا ایک جامع تعارف اور ایک چھوٹا سا انسائیکلوپیڈیا بن گیا ہے۔

علامہ شبلی کی زندہ جاوید تصنیفات میں ان کی کتاب "الفاروق" خاص اہمیت رکھتی ہے، اس کو ان کی انشا پردازی کا شاہکار کہا جا سکتا ہے، اس کتاب نے بہت سے جدید تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کے دل میں اسلام کی محبت کا بیج بویا اور ایمان کی آبیاری کی، اور وہ مغرب کے فکری و تہذیبی حملوں کا مقابلہ کرنے کا ذریعہ بنی، علامہ موصوف کے سوانح و سیرت نگاری کے اس مفید سلسلہ میں الغزالی، سوانح مولانا روم، المامون اور سیرت النعمان بھی شامل ہیں، جو تذکرہ و سوانح کی ترتیب کا جدید اور قابل تقلید نمونہ ہیں، ان کے تلامذہ نے اسلامی تاریخ کی جو قدیم کتابوں کے صفحات میں بکھری اور کتابوں کے ڈھیر میں دبی پڑی تھی، عصری اسلوب اور جیتی جاگتی زبان میں تشکیل جدید کا کام کیا جس کا نمونہ اسوۂ صحابہ، اسوۂ صحابیات، سیر الصحابیات، خلفائے راشدین، مہاجرین، انصار، سیر الصحابہ، اہل کتاب صحابہ و تابعین اور سیرت عمر بن عبد العزیزؒ اور تاریخ اسلام میں دیکھا جا سکتا ہے۔

علامہ شبلی کی شعر العجم فارسی شعر و شاعری کی تاریخ، تحلیل و تنقید اور مختلف شعراء کے خصوصیات کلام اور محاسن شعری کے موضوع پر ایسی امتیازی حیثیت رکھتی ہے، کہ اس سے جزئی اختلاف اور اس کے بعض مضامین پر تنقید نے بھی اس کی اہمیت کم نہیں کی، اس طرح ان کے مضامین الجزیہ فی الاسلام، حقوق الذمیین، جو اسلامی جزیہ کی حقیقت، ذمیوں کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں سے بحث کرتی ہے، کتب خانہ اسکندریہ اور اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر خواص و عوام میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں اور افترا پردازیوں کا پردہ چاک کرتے ہیں، اور تاریخ کے روشن حقائق کے چہرہ سے نقاب اٹھاتے ہیں، انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل سے جو اسلامی ممالک میں یورپین سامراج کا زمانہ ہے، تاریخ اسلام، اسلامی تہذیب و تمدن، اسلامی نظام حکومت اور اسلامی حکومتوں میں غیر مسلم محکوموں کے ساتھ سلوک و برتاؤ سے متعلق طرح طرح کے شبہات پیدا کر دیئے گئے تھے، اور تاریخ کو شک آفرینی، اعتقادی تزلزل

اور ذہنی مرعوبیت کا ایسا ہی ذریعہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی اور اس سے وہی کام لیا جانے لگا جو تیسری چوتھی صدی ہجری میں یونانی فلسفہ سے لیا گیا تھا اس لئے اس کی شدید ضرورت تھی کہ تاریخ کو صحیح طریقہ پر پیش کیا جائے اور شبہات، افترا پردازیوں کا پردہ چاک کیا جائے، یہ نہ صرف ایک علمی و تاریخی خدمت تھی بلکہ ایک نیا علم کلام تھا، جس سے ایمان کی حفاظت وتقویت کا کام لیا جاسکتا تھا، علامہ شبلی اور ندوۃ العلماء کے فضلاء نے اس سلسلہ میں مفید اور ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔

علامہ شبلی کے بعد ان کے نابغۂ روزگار تلمیذ اور ندوۃ العلماء کے مایہ ناز اور یگانۂ فاضل مولانا سید سلیمان ندوی کا دور آتا ہے جنھوں نے "ارض القرآن" کے نام سے قرآنی عہد اور انبیاء کے ظہور اور ان کی دعوتوں اور سرگرمیوں کے مرکزوں کے جغرافیائی اور تاریخی جایزہ لیا، اس میں عربوں کی تاریخ اسلام سے پہلے ان کی فتوحات، جزیرۃ العرب کے مختلف خطوں سے، دنیا کے مختلف ممالک اور مختلف ممالک سے جزیرۃ العرب کے مختلف حصوں کی طرف انسانی قافلوں کی آمد کے واقعات، ان علاقوں کی زبانوں، مذاہب، تجارتی کاروانوں اور تہذیب کے مختلف دوروں کا تذکرہ کیا ہے، انھوں نے ۱۹۱۴ء میں یہ کتاب مرتب کی، جس میں دوسری زبانوں کے مآخذ ومراجع سے پورا استفادہ کیا گیا، اس کے علاوہ ان کی دوسری تصنیفات "عرب وہند کے تعلقات"، "عربوں کی جہازرانی" اور "خیام" وہ کتابیں ہیں جو طویل بحث وتحقیق، اسلامی کتب خانہ کی غواصی اور تحقیق وجستجو کا نتیجہ ہیں اور جدید علمی طریقۂ بحث وتحقیق کا وہ نمونہ پیش کرتی ہیں، جس پر اردو زبان اور نئی نسل کو بجا طور پر فخر کرنا چاہیے۔

عمر خیام، ایران کا سرمایۂ فخر فرزند، نادرۂ روزگار شاعر اور علومِ ریاضیات کا ماہر ہے، لیکن خود ایران عمر خیام کی سیرت وشخصیت پر کوئی ایسی کتاب پیش نہیں کرسکتا جو اس نابغۂ وقت شخصیت کی عظمت اور اس کے علمی کارناموں کو اجاگر کرنے اور علمی وتاریخی عمیق وطویل مطالعہ میں اس کتاب کی ہم پلہ ہو، ان کی کتاب "خطباتِ مدراس"، جس کا ترجمہ بلادِ عربیہ میں "**الرسالة المحمدية**"[1] کے نام سے شایع ہوچکا ہے، سیرت نبوی ﷺ اور تعلیماتِ نبوی ﷺ پر ایسی طاقت ور، موثر اور پر مغز اور پر از معلومات کتاب ہے جس کی نظیر مسلمانوں کی دوسری زبانوں میں ملنی مشکل ہے، اسی طرح "سیرتِ عائشہؓ" اپنے موضوع پر منفرد کتابوں میں ہے۔

---

[1] یہ ترجمہ ہمارے فاضل دوست مولانا محمد ناظم صاحب ندوی (سابق مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء اور شیخ الجامعۃ العباسیۃ بھاول پور) نے کیا ہے، عرب ممالک میں اس کے کئی ایڈیشن شایع ہوچکے ہیں۔